

قرآنی تعلیمات کا مرقع

ابلیس و آدم

جس میں

انسان کی پیدائش ○ قصہ آدم ○ ابلیس ○ شیطان
جنات ○ ملائکہ ○ وحی اور رسالت ،
جیسے اہم موضوعات کے متعلق بصیرت افروز مباحث شامل ہیں

پرویز

طلوع اسلام ^(رجسٹرڈ) ، ۲۵ بی گلبرگ ۱ - لاہور

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	ایلیس و آدم
مصنف	پرویز
شائع کردہ	طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
	25-B گلبرگ II لاہور - 54660
	email: trust@toluislam.com
	web: www.toluislam.com
ایڈیشن اول	1945
ایڈیشن ششم	اگست 2000ء (بلا ترمیم)
طابع	دوست ایسوسی ایٹس
مطبع	عالمین پریس، لاہور

طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن
قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فہرست مطالب

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵	مغرب کی افسوسناک غلطی	۱	فہرست مطالب
۶	قرآنی دعوت علی وجہ البصیرت	۱	تعارف
۶	کوئی نظریہ جب حقیقت کی صورت		انسان
۶	اختیار کر لے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ قرآن		شجر ارتقاء کا گل سرسبد
۶	کے خلاف ہو۔	۲	سب سے پہلا انسان کیسے پیدا ہو گیا؟
۶	نظریہ ارتقاء اور قرآن کریم	۲	وادی حیرت و استعجاب
۶	تدبیر امور البیۃ کی عظیم الشان اسیم	۲	حکیم مومن اور مادہ پرست کا فرق
۶	تدبیر تخلیق انسانی کا نقطہ آغاز۔	۳	ذہن انسانی کا عہد طفولیت اور اس کی
۹	جماداتی زندگی۔ سرچشمہ حیات۔	۳	حیرت سامانیاں۔
۱۰	دوسری منزل۔ طین لازب۔ (مٹی اور پانی	۳	عہد شعور کی علمی کاوشیں
۱۰	کا امتزاج)۔	۳	نظریہ ارتقاء
۱۰	جرثومہ حیات اور خلیات کی تشکیل	۳	تحقیق مغرب کا ماحصل

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۸	تکبیل شرفِ انسانیت اور اصولِ ارتقاء	..	شجر ارتقاء کی مختلف شاخیں
۳۰	ضابطہٴ اخلاق کا اثر قانونِ ارتقاء پر۔ مغرب کا	..	نفسِ واحدہ۔ ایک محیر العقول راز کا انکشاف
..	اعتراف	۱۱	تیسری منزل۔ حیوانی زندگی
۳۱	نظامِ خداوندی کا ایک اہم قانون	۱۲	نرد مادہ کا امتیاز۔ اسی "نفس" سے
..	آئندہ اوراق اسی قانونِ سرمدی کی	..	اس کا جوڑا
..	تاریخ ہیں	۱۳	(ایک ضمنی گوشہ۔ نباتات میں جوڑے)
..	یورپ کا میکائی تصور۔ قرآنِ کریم کا صحیح	۱۴	حکیم ابنِ مسکویہ اور اصولِ ارتقاء
۳۳	تصورِ کائنات۔ ایک اہم حقیقتِ نظم و	۱۵	چوتھی منزل۔ پیکرِ انسانی
..	ضبطِ کائنات اور انسانی اختیار و ارادہ	۱۶	"نفخِ روح"
..	انسان کے ہاتھ کس طرح خدا کے ہاتھ	..	شرفِ انسانیت کا امتیاز
..	بن جاتے ہیں!	۱۷	اختیار و ارادہ کا جوہر
۳۵	خلاصہٴ بحث	..	یعنی! انسان متشکل ہو گیا
۳۷	(۲) آدم (نمائندہٴ آدمیت)	۱۹	لیکن ایک فرد نہیں۔ نوعِ انسانی
۳۸	ہیولائے کائنات، ابلے کیف و بے رنگ	۲۰	موجودہ زندگی، سلسلہٴ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں
۳۹	نبضِ کائنات کا باعثِ توجہ۔ آدم	..	قرآن اور مغربی محققین میں فرق
..	کشمکشِ حیات کی ابتداء	۲۱	قرآنی اندازِ استدلال۔ مبداء سے معاد پر استنباد
۴۰	آدم سے مراد؟	۲۲	موت اور حیات
..	آغازِ داستان	۲۵	اعمالِ صالحہ کا قرآنی مفہوم
..	خلیفہ فی الارض	..	جن سے کشمکشِ حیات میں زندہ رہنے اور
..	پیکرِ آدم میں آگ کی چنگاریاں اور خون کے چھینٹے	..	آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے
..	فرشتوں کا استعجاب!	۲۶	قوموں کے عروج و زوال کے اصول۔ نظریہٴ ارتقاء
..		..	کی روشنی میں

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
	عقل تحفظ جسم کے اسباب و ذرائع ہوتا کرتی ہے۔	۴۱	استحقاقِ خلافت
	عقل انسانی فیصلوں کو بروئے کار لاتا ہے۔	۴۲	علم الاشیاء کی ودیعت۔
۵۴	جہالت کے فیصلوں کو بروئے کار لانا عقل بے اک کے ماتحت ہوگا۔	۴۳	اختیار و ارادہ۔
..	عقل کو وحی کے تابع رکھنے میں ہی انسانی ذات کا استحکام ہے۔	..	اختیار و ارادہ کی سحر کاریاں!
۵۵	آدم ایک فرد کا بھی نام تھا؟	۴۴	سلسلہ ارتقائے میں آگے بڑھنے کی صلاحیت
..	نبوتِ آدم	..	کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟
۵۶	لیکن قصہ زبورِ نظر میں آدم کسی فرد کا نام نہیں۔	۴۵	کشمکشِ زندگی سے۔
۵۷	تو پھر یہ کیا ہے؟ خود انسانی زندگی کا تمثیلی بیان!	..	اس کشمکش کے لئے معصیت کا اختیار ضروری ہے۔
..	خلیفہ کا قرآنی مفہوم۔ جانشین	۴۶	آگے بڑھنے کی صلاحیت۔
۵۸	لیکن غلبہ و تسلط کے ساتھ جانشین۔	..	مہبوطِ آدم
۵۹	انسان نہ خدا کا جانشین ہے نہ اس کا نائب	..	اور باز آنسو بہتی۔
۶۰	ایلیس فریب کا دوسرا نتیجہ۔ باہمی عداوت۔	۴۷	اس کے بعد فرد میں گم گشتہ کی بازیابی
..	ابتدائی دور کے دو انسانوں کا قصہ (واقعہ یا تمثیل)	..	کی کیا صورت ہے؟
..	آتشِ حسد سے قتلِ انسانی کا ارتکاب۔	۴۸	قصہ آدم خود انسان کی سرگزشت ہے۔
۶۰	سجدہ کا قرآنی مفہوم (یعنی ملائکہ کا سجدہ کیا تھا)	۴۹	مزید وضاحت کہ قصہ آدم کسی ایک فرد کی داستان
	اعترافِ اطاعت و القیاد	..	نہیں۔
۶۱	تورات اور قصہ آدم۔	۵۰	زمین کی زندگی میں آسمانی کیفیات۔
		..	بھوک، احتیاج، تنگی، معیشت، خدا فراموشی
		..	کا نتیجہ ہیں۔
		۵۱	ایلیس کی نگاہ فریبیاں۔
		۵۲	حیاتِ جاوید کا دھوکا۔
		۵۳	تحفظِ طبعی کے ساتھ تحفظِ ذات بھی ضروری ہے۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۷۴	قانون ارتقار کی رُو سے استحکام و عروج کی شرائط	۷۳	تفصیل میں بین فرق
۷۵	متصادم قوتوں سے کش مکش	۷۴	مجرم عورت تھی! لہذا عورت ہمیشہ کے لئے قابل نفرت ہے۔
۷۶	خونِ رگ کائنات کی پیش؟	۷۵	عیسائی اور ہندو سوسائٹی میں عورت کی حیثیت۔
۷۷	خودی کے دولہ نمود کی مظہر	۷۶	خدا انسان کو پیدا کر کے بچھتا یا (معاذ اللہ) قصۂ آدم کی حکمت بالغہ۔
۷۸	خودی کا حریف مقابل! فسانِ شمشیر! ابلیس فرشتوں کا اعتراض۔ اور ابلیس کا بھی۔	۷۷	انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے ارتقائی مراحل
۷۹	لیکن علم آجانے کے بعد فرشتوں کا سر جھک گیا۔ اور ابلیس کی گردن اٹھ گئی۔	۷۸	ابنِ آدم ٹھو کریں کھا کھا کر سنبھل رہا ہے۔ دنیا تلخ تجارب کے بعد دینِ خداوندی کے قریب آرہی ہے۔
۸۰	ابی ابلیس کیلے۔	۷۹	دنیا کی بدترین لعنتیں۔ ملوکیت۔ سرمایہ داری۔ برہمنیت۔ غلامی۔ وطنیت۔ سب ایک ایک کر کے دُور ہوتی جا رہی ہیں۔ لیکن خود مسلمان؟
۸۱	قرآن کی رُو سے عقل کی فضیلت۔ لیکن کس عقل کی؟ اس کی جو وحی کے تابع ہو۔ اور عقل سرکش اور علم بے باک؟ یہی تو ابلیس ہے۔	۸۰	قصۂ آدم۔ خود غلبہ اسلام کی تاریخ میں جھلک رہا ہے۔
۸۲	ابی ابلیس کا چیلنج۔	۸۱	منتہائے نگاہ! وہ جنت جو اعمال سے حاصل ہوگی!
۸۳	ابی ابلیس کی قسم۔ ندرتِ انداز کا رقص انگیز کرشمہ ناامیدی!	۸۲	خلاصہ بحث
۸۴	خوئے ابلیسی؟ ضد اور ہٹ!	۸۳	
۸۵	اس کے مظاہر؟ گروہ سازیاں اور فرقہ بندی!	۸۴	
۸۶	ابی ابلیس سے حفاظت!	۸۵	
۸۷	رہبانیت میں نہیں۔ خانقاہیت میں نہیں۔	۸۶	
۸۸		۸۷	
۸۹		۸۸	
۹۰		۸۹	
۹۱		۹۰	
۹۲		۹۱	
۹۳		۹۲	
۹۴		۹۳	
۹۵		۹۴	
۹۶		۹۵	
۹۷		۹۶	
۹۸		۹۷	
۹۹		۹۸	
۱۰۰		۹۹	
۱۰۱		۱۰۰	
۱۰۲		۱۰۱	
۱۰۳		۱۰۲	
۱۰۴		۱۰۳	
۱۰۵		۱۰۴	
۱۰۶		۱۰۵	
۱۰۷		۱۰۶	
۱۰۸		۱۰۷	
۱۰۹		۱۰۸	
۱۱۰		۱۰۹	
۱۱۱		۱۱۰	
۱۱۲		۱۱۱	
۱۱۳		۱۱۲	
۱۱۴		۱۱۳	
۱۱۵		۱۱۴	
۱۱۶		۱۱۵	
۱۱۷		۱۱۶	
۱۱۸		۱۱۷	
۱۱۹		۱۱۸	
۱۲۰		۱۱۹	
۱۲۱		۱۲۰	
۱۲۲		۱۲۱	
۱۲۳		۱۲۲	
۱۲۴		۱۲۳	
۱۲۵		۱۲۴	
۱۲۶		۱۲۵	
۱۲۷		۱۲۶	
۱۲۸		۱۲۷	
۱۲۹		۱۲۸	
۱۳۰		۱۲۹	
۱۳۱		۱۳۰	
۱۳۲		۱۳۱	
۱۳۳		۱۳۲	
۱۳۴		۱۳۳	
۱۳۵		۱۳۴	
۱۳۶		۱۳۵	
۱۳۷		۱۳۶	
۱۳۸		۱۳۷	
۱۳۹		۱۳۸	
۱۴۰		۱۳۹	
۱۴۱		۱۴۰	
۱۴۲		۱۴۱	
۱۴۳		۱۴۲	
۱۴۴		۱۴۳	
۱۴۵		۱۴۴	
۱۴۶		۱۴۵	
۱۴۷		۱۴۶	
۱۴۸		۱۴۷	
۱۴۹		۱۴۸	
۱۵۰		۱۴۹	
۱۵۱		۱۵۰	
۱۵۲		۱۵۱	
۱۵۳		۱۵۲	
۱۵۴		۱۵۳	
۱۵۵		۱۵۴	
۱۵۶		۱۵۵	
۱۵۷		۱۵۶	
۱۵۸		۱۵۷	
۱۵۹		۱۵۸	
۱۶۰		۱۵۹	
۱۶۱		۱۶۰	
۱۶۲		۱۶۱	
۱۶۳		۱۶۲	
۱۶۴		۱۶۳	
۱۶۵		۱۶۴	
۱۶۶		۱۶۵	
۱۶۷		۱۶۶	
۱۶۸		۱۶۷	
۱۶۹		۱۶۸	
۱۷۰		۱۶۹	
۱۷۱		۱۷۰	
۱۷۲		۱۷۱	
۱۷۳		۱۷۲	
۱۷۴		۱۷۳	
۱۷۵		۱۷۴	
۱۷۶		۱۷۵	
۱۷۷		۱۷۶	
۱۷۸		۱۷۷	
۱۷۹		۱۷۸	
۱۸۰		۱۷۹	
۱۸۱		۱۸۰	
۱۸۲		۱۸۱	
۱۸۳		۱۸۲	
۱۸۴		۱۸۳	
۱۸۵		۱۸۴	
۱۸۶		۱۸۵	
۱۸۷		۱۸۶	
۱۸۸		۱۸۷	
۱۸۹		۱۸۸	
۱۹۰		۱۸۹	
۱۹۱		۱۹۰	
۱۹۲		۱۹۱	
۱۹۳		۱۹۲	
۱۹۴		۱۹۳	
۱۹۵		۱۹۴	
۱۹۶		۱۹۵	
۱۹۷		۱۹۶	
۱۹۸		۱۹۷	
۱۹۹		۱۹۸	
۲۰۰		۱۹۹	
۲۰۱		۲۰۰	
۲۰۲		۲۰۱	
۲۰۳		۲۰۲	
۲۰۴		۲۰۳	
۲۰۵		۲۰۴	
۲۰۶		۲۰۵	
۲۰۷		۲۰۶	
۲۰۸		۲۰۷	
۲۰۹		۲۰۸	
۲۱۰		۲۰۹	
۲۱۱		۲۱۰	
۲۱۲		۲۱۱	
۲۱۳		۲۱۲	
۲۱۴		۲۱۳	
۲۱۵		۲۱۴	
۲۱۶		۲۱۵	
۲۱۷		۲۱۶	
۲۱۸		۲۱۷	
۲۱۹		۲۱۸	
۲۲۰		۲۱۹	
۲۲۱		۲۲۰	
۲۲۲		۲۲۱	
۲۲۳		۲۲۲	
۲۲۴		۲۲۳	
۲۲۵		۲۲۴	
۲۲۶		۲۲۵	
۲۲۷		۲۲۶	
۲۲۸		۲۲۷	
۲۲۹		۲۲۸	
۲۳۰		۲۲۹	
۲۳۱		۲۳۰	
۲۳۲		۲۳۱	
۲۳۳		۲۳۲	
۲۳۴		۲۳۳	
۲۳۵		۲۳۴	
۲۳۶		۲۳۵	
۲۳۷		۲۳۶	
۲۳۸		۲۳۷	
۲۳۹		۲۳۸	
۲۴۰		۲۳۹	
۲۴۱		۲۴۰	
۲۴۲		۲۴۱	
۲۴۳		۲۴۲	
۲۴۴		۲۴۳	
۲۴۵		۲۴۴	
۲۴۶		۲۴۵	
۲۴۷		۲۴۶	
۲۴۸		۲۴۷	
۲۴۹		۲۴۸	
۲۵۰		۲۴۹	
۲۵۱		۲۵۰	
۲۵۲		۲۵۱	
۲۵۳		۲۵۲	
۲۵۴		۲۵۳	
۲۵۵		۲۵۴	
۲۵۶		۲۵۵	
۲۵۷		۲۵۶	
۲۵۸		۲۵۷	
۲۵۹		۲۵۸	
۲۶۰		۲۵۹	
۲۶۱		۲۶۰	
۲۶۲		۲۶۱	
۲۶۳		۲۶۲	
۲۶۴		۲۶۳	
۲۶۵		۲۶۴	
۲۶۶		۲۶۵	
۲۶۷		۲۶۶	
۲۶۸		۲۶۷	
۲۶۹		۲۶۸	
۲۷۰		۲۶۹	
۲۷۱		۲۷۰	
۲۷۲		۲۷۱	
۲۷۳		۲۷۲	
۲۷۴		۲۷۳	
۲۷۵		۲۷۴	
۲۷۶		۲۷۵	
۲۷۷		۲۷۶	
۲۷۸		۲۷۷	
۲۷۹		۲۷۸	
۲۸۰		۲۷۹	
۲۸۱		۲۸۰	
۲۸۲		۲۸۱	
۲۸۳		۲۸۲	
۲۸۴		۲۸۳	
۲۸۵		۲۸۴	
۲۸۶		۲۸۵	
۲۸۷		۲۸۶	
۲۸۸		۲۸۷	
۲۸۹		۲۸۸	
۲۹۰		۲۸۹	
۲۹۱		۲۹۰	
۲۹۲		۲۹۱	
۲۹۳		۲۹۲	
۲۹۴		۲۹۳	
۲۹۵		۲۹۴	
۲۹۶		۲۹۵	
۲۹۷		۲۹۶	
۲۹۸		۲۹۷	
۲۹۹		۲۹۸	
۳۰۰		۲۹۹	
۳۰۱		۳۰۰	
۳۰۲		۳۰۱	
۳۰۳		۳۰۲	
۳۰۴		۳۰۳	
۳۰۵		۳۰۴	
۳۰۶		۳۰۵	
۳۰۷		۳۰۶	
۳۰۸		۳۰۷	
۳۰۹		۳۰۸	
۳۱۰		۳۰۹	
۳۱۱		۳۱۰	
۳۱۲		۳۱۱	
۳۱۳		۳۱۲	
۳۱۴		۳۱۳	
۳۱۵		۳۱۴	
۳۱۶		۳۱۵	
۳۱۷		۳۱۶	
۳۱۸		۳۱۷	
۳۱۹		۳۱۸	
۳۲۰		۳۱۹	
۳۲۱		۳۲۰	
۳۲۲		۳۲۱	
۳۲۳		۳۲۲	
۳۲۴		۳۲۳	
۳۲۵		۳۲۴	
۳۲۶		۳۲۵	
۳۲۷		۳۲۶	
۳۲۸		۳۲۷	
۳۲۹		۳۲۸	
۳۳۰		۳۲۹	
۳۳۱		۳۳۰	
۳۳۲		۳۳۱	
۳۳۳		۳۳۲	
۳۳۴		۳۳۳	
۳۳۵		۳۳۴	
۳۳۶		۳۳۵	
۳۳۷		۳۳۶	
۳۳۸		۳۳۷	
۳۳۹		۳۳۸	
۳۴۰		۳۳۹	
۳۴۱		۳۴۰	
۳۴۲		۳۴۱	
۳۴۳		۳۴۲	
۳۴۴		۳۴۳	
۳۴۵		۳۴۴	
۳۴۶		۳۴۵	
۳۴۷		۳۴۶	
۳۴۸		۳۴۷	
۳۴۹		۳۴۸	
۳۵۰		۳۴۹	
۳۵۱		۳۵۰	
۳۵۲		۳۵۱	
۳۵۳		۳۵۲	
۳۵۴		۳۵۳	
۳۵۵		۳۵۴	
۳۵۶		۳۵۵	
۳۵۷		۳۵۶	
۳۵۸		۳۵۷	
۳۵۹		۳۵۸	
۳۶۰		۳۵۹	
۳۶۱		۳۶۰	
۳۶۲		۳۶۱	
۳۶۳		۳۶۲	
۳۶۴		۳۶۳	
۳۶۵		۳۶۴	
۳۶۶		۳۶۵	
۳۶۷		۳۶۶	
۳۶۸		۳۶۷	
۳۶۹		۳۶۸	
۳۷۰		۳۶۹	
۳۷۱		۳۷۰	
۳۷۲		۳۷۱	
۳۷۳		۳۷۲	
۳۷۴		۳۷۳	
۳۷۵		۳۷۴	
۳۷۶		۳۷۵	
۳۷۷		۳۷۶	
۳۷۸		۳۷۷	
۳۷۹		۳۷۸	
۳۸۰		۳۷۹	
۳۸۱		۳۸۰	
۳۸۲		۳۸۱	
۳۸۳		۳۸۲	
۳۸۴		۳۸۳	
۳۸۵		۳۸۴	
۳۸۶		۳۸۵	
۳۸۷		۳۸۶	
۳۸۸		۳۸۷	
۳۸۹		۳۸۸	
۳۹۰		۳۸۹	
۳۹۱		۳۹۰	
۳۹۲		۳۹۱	
۳۹۳		۳۹۲	
۳۹۴		۳۹۳	
۳۹۵		۳۹۴	
۳۹۶		۳۹۵	
۳۹۷		۳۹۶	
۳۹۸		۳۹۷	
۳۹۹		۳۹۸	
۴۰۰		۳۹۹	
۴۰۱		۴۰۰	
۴۰۲			

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۹۷	جنات — ایک آتشیں مخلوق۔	۸۶	نہ ہی مغرب کی مادیت میں
۹۸	ذہن انسانی نے انہیں کیا بنا دیا؟	۸۷	بلکہ؟
۹۹	جنوں کی پرستش۔	۸۸	اس طرح کہ ابلیس کو "مسلمان" کر لیا جائے
۱۰۰	انسانی جنات۔	۸۹	یہ کیسے؟
۱۰۱	جن و انس کی تشریح۔	۹۰	تسخیر فطرت اور اطاعت قوانین الہیہ سے
۱۰۲	انساؤں ہی کے دو گروہ دہذب اور	۹۱	ابلیس فرشتوں میں سے نہ تھا۔ یہ تو شعلہ مزاج
۱۰۳	وحشی قبائل	۹۲	مظہر سرکش تھا۔
۱۰۴	مزید تصریحات۔ جنات کا قرآن سننا۔	۹۳	ابلیس، مایوسی کا مظہر ہے۔
۱۰۵	سلسلہ رشد و ہدایت صرف انساؤں کیلئے	۹۴	اس کا مشن؟ زندگی سے اُمیدوں کو ختم کر
۱۰۶	بھوت اور جنات کی اصل۔ اعصابی بیماریوں کے	۹۵	دینا ہے۔
۱۰۷	اثرات۔	۹۶	یہی موت ہے۔
۱۰۸	انسانی پیدائش سے پہلے زمین پر ایک آتشیں	۹۷	قوموں کی زندگی آرزوؤں میں ہے۔
۱۰۹	مخلوق آباد تھی۔	۹۸	ابلیس خون و حران کے سامان پیدا کرتا ہے۔
۱۱۰	جان بمعنی سانپ۔	۹۹	ایمان — تقویت و تسکین قلب کی
۱۱۱	خلاصہ مبحث۔	۱۰۰	شمعیں فروزاں کرتا ہے۔
۱۱۲	(۳) شیطان ابلیس کا پیکر رنگین	۱۰۱	شمع ایمان کا ایک لمعہ — غار کی تاریکیوں میں
۱۱۳	کیا ابلیس اور شیطان دو الگ الگ ہستیاں ہیں؟	۱۰۲	میں پیکر نورانیت۔
۱۱۴	نہیں! یہ ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔	۱۰۳	ابلیس اور ہم!
۱۱۵	بلکہ یوں کہئے کہ الگ الگ بھی اور ایک بھی۔	۱۰۴	ابلیس کا شکوہ
۱۱۶	شیاطین روح ابلیسی کے مختلف مظاہر ہیں۔	۱۰۵	بالکل بکا اور درست!
۱۱۷	شیطان کے کارنامے۔	۱۰۶	
۱۱۸		۱۰۷	
۱۱۹		۱۰۸	
۱۲۰		۱۰۹	
۱۲۱		۱۱۰	
۱۲۲		۱۱۱	
۱۲۳		۱۱۲	
۱۲۴		۱۱۳	
۱۲۵		۱۱۴	
۱۲۶		۱۱۵	
۱۲۷		۱۱۶	
۱۲۸		۱۱۷	
۱۲۹		۱۱۸	
۱۳۰		۱۱۹	
۱۳۱		۱۲۰	
۱۳۲		۱۲۱	
۱۳۳		۱۲۲	
۱۳۴		۱۲۳	
۱۳۵		۱۲۴	
۱۳۶		۱۲۵	
۱۳۷		۱۲۶	
۱۳۸		۱۲۷	
۱۳۹		۱۲۸	
۱۴۰		۱۲۹	
۱۴۱		۱۳۰	
۱۴۲		۱۳۱	
۱۴۳		۱۳۲	
۱۴۴		۱۳۳	
۱۴۵		۱۳۴	
۱۴۶		۱۳۵	
۱۴۷		۱۳۶	
۱۴۸		۱۳۷	
۱۴۹		۱۳۸	
۱۵۰		۱۳۹	
۱۵۱		۱۴۰	
۱۵۲		۱۴۱	
۱۵۳		۱۴۲	
۱۵۴		۱۴۳	
۱۵۵		۱۴۴	
۱۵۶		۱۴۵	
۱۵۷		۱۴۶	
۱۵۸		۱۴۷	
۱۵۹		۱۴۸	
۱۶۰		۱۴۹	
۱۶۱		۱۵۰	
۱۶۲		۱۵۱	
۱۶۳		۱۵۲	
۱۶۴		۱۵۳	
۱۶۵		۱۵۴	
۱۶۶		۱۵۵	
۱۶۷		۱۵۶	
۱۶۸		۱۵۷	
۱۶۹		۱۵۸	
۱۷۰		۱۵۹	
۱۷۱		۱۶۰	
۱۷۲		۱۶۱	
۱۷۳		۱۶۲	
۱۷۴		۱۶۳	
۱۷۵		۱۶۴	
۱۷۶		۱۶۵	
۱۷۷		۱۶۶	
۱۷۸		۱۶۷	
۱۷۹		۱۶۸	
۱۸۰		۱۶۹	
۱۸۱		۱۷۰	
۱۸۲		۱۷۱	
۱۸۳		۱۷۲	
۱۸۴		۱۷۳	
۱۸۵		۱۷۴	
۱۸۶		۱۷۵	
۱۸۷		۱۷۶	
۱۸۸		۱۷۷	
۱۸۹		۱۷۸	
۱۹۰		۱۷۹	
۱۹۱		۱۸۰	
۱۹۲		۱۸۱	
۱۹۳		۱۸۲	
۱۹۴		۱۸۳	
۱۹۵		۱۸۴	
۱۹۶		۱۸۵	
۱۹۷		۱۸۶	
۱۹۸		۱۸۷	
۱۹۹		۱۸۸	
۲۰۰		۱۸۹	
۲۰۱		۱۹۰	
۲۰۲		۱۹۱	
۲۰۳		۱۹۲	
۲۰۴		۱۹۳	
۲۰۵		۱۹۴	
۲۰۶		۱۹۵	
۲۰۷		۱۹۶	
۲۰۸		۱۹۷	
۲۰۹		۱۹۸	
۲۱۰		۱۹۹	
۲۱۱		۲۰۰	
۲۱۲		۲۰۱	
۲۱۳		۲۰۲	
۲۱۴		۲۰۳	
۲۱۵		۲۰۴	
۲۱۶		۲۰۵	
۲۱۷		۲۰۶	
۲۱۸		۲۰۷	
۲۱۹		۲۰۸	
۲۲۰		۲۰۹	
۲۲۱		۲۱۰	
۲۲۲		۲۱۱	
۲۲۳		۲۱۲	
۲۲۴		۲۱۳	
۲۲۵		۲۱۴	
۲۲۶		۲۱۵	
۲۲۷		۲۱۶	
۲۲۸		۲۱۷	
۲۲۹		۲۱۸	
۲۳۰		۲۱۹	
۲۳۱		۲۲۰	
۲۳۲		۲۲۱	
۲۳۳		۲۲۲	
۲۳۴		۲۲۳	
۲۳۵		۲۲۴	
۲۳۶		۲۲۵	
۲۳۷		۲۲۶	
۲۳۸		۲۲۷	
۲۳۹		۲۲۸	
۲۴۰		۲۲۹	
۲۴۱		۲۳۰	
۲۴۲		۲۳۱	
۲۴۳		۲۳۲	
۲۴۴		۲۳۳	
۲۴۵		۲۳۴	
۲۴۶		۲۳۵	
۲۴۷		۲۳۶	
۲۴۸		۲۳۷	
۲۴۹		۲۳۸	
۲۵۰		۲۳۹	
۲۵۱		۲۴۰	
۲۵۲		۲۴۱	
۲۵۳		۲۴۲	
۲۵۴		۲۴۳	
۲۵۵		۲۴۴	
۲۵۶		۲۴۵	
۲۵۷		۲۴۶	
۲۵۸		۲۴۷	
۲۵۹		۲۴۸	
۲۶۰		۲۴۹	
۲۶۱		۲۵۰	
۲۶۲		۲۵۱	
۲۶۳		۲۵۲	
۲۶۴		۲۵۳	
۲۶۵		۲۵۴	
۲۶۶		۲۵۵	
۲۶۷		۲۵۶	
۲۶۸		۲۵۷	
۲۶۹		۲۵۸	
۲۷۰		۲۵۹	
۲۷۱		۲۶۰	
۲۷۲		۲۶۱	
۲۷۳		۲۶۲	
۲۷۴		۲۶۳	
۲۷۵		۲۶۴	
۲۷۶		۲۶۵	
۲۷۷		۲۶۶	
۲۷۸		۲۶۷	
۲۷۹		۲۶۸	
۲۸۰		۲۶۹	
۲۸۱		۲۷۰	
۲۸۲		۲۷۱	
۲۸۳		۲۷۲	
۲۸۴		۲۷۳	
۲۸۵		۲۷۴	
۲۸۶		۲۷۵	
۲۸۷		۲۷۶	
۲۸۸		۲۷۷	
۲۸۹		۲۷۸	
۲۹۰		۲۷۹	
۲۹۱		۲۸۰	
۲۹۲		۲۸۱	
۲۹۳		۲۸۲	
۲۹۴		۲۸۳	
۲۹۵		۲۸۴	
۲۹۶		۲۸۵	
۲۹۷		۲۸۶	
۲۹۸		۲۸۷	
۲۹۹		۲۸۸	
۳۰۰		۲۸۹	
۳۰۱		۲۹۰	
۳۰۲		۲۹۱	
۳۰۳		۲۹۲	
۳۰۴		۲۹۳	
۳۰۵		۲۹۴	
۳۰۶		۲۹۵	
۳۰۷		۲۹۶	
۳۰۸		۲۹۷	
۳۰۹		۲۹۸	
۳۱۰		۲۹۹	
۳۱۱		۳۰۰	
۳۱۲		۳۰۱	
۳۱۳		۳۰۲	
۳۱۴		۳۰۳	
۳۱۵		۳۰۴	
۳۱۶		۳۰۵	
۳۱۷		۳۰۶	
۳۱۸		۳۰۷	
۳۱۹		۳۰۸	
۳۲۰		۳۰۹	
۳۲۱		۳۱۰	
۳۲۲		۳۱۱	
۳۲۳		۳۱۲	
۳۲۴		۳۱۳	
۳۲۵		۳۱۴	
۳۲۶		۳۱۵	
۳۲۷		۳۱۶	
۳۲۸		۳۱۷	
۳۲۹		۳۱۸	
۳۳۰		۳۱۹	
۳۳۱		۳۲۰	
۳۳۲		۳۲۱	
۳۳۳		۳۲۲	
۳۳۴		۳۲۳	
۳۳۵		۳۲۴	
۳۳۶		۳۲۵	
۳۳۷		۳۲۶	
۳۳۸		۳۲۷	
۳۳۹		۳۲۸	
۳۴۰		۳۲۹	
۳۴۱		۳۳۰	
۳۴۲		۳۳۱	
۳۴۳		۳۳۲	
۳۴۴		۳۳۳	
۳۴۵		۳۳۴	
۳۴۶		۳۳۵	
۳۴۷		۳۳۶	
۳۴۸		۳۳۷	
۳۴۹		۳۳۸	
۳۵۰		۳۳۹	
۳۵۱		۳۴۰	
۳۵۲		۳۴۱	
۳۵۳		۳۴۲	
۳۵۴		۳۴۳	
۳۵۵		۳۴۴	
۳۵۶		۳۴۵	
۳۵۷		۳۴۶	
۳۵۸		۳۴۷	
۳۵۹		۳۴۸	
۳۶۰		۳۴۹	
۳۶۱		۳۵۰	
۳۶۲		۳۵۱	
۳۶۳		۳۵۲	
۳۶۴		۳۵۳	
۳۶۵		۳۵۴	
۳۶۶		۳۵۵	
۳۶۷		۳۵۶	
۳۶۸		۳۵۷	
۳۶۹		۳۵۸	
۳۷۰		۳۵۹	
۳۷۱		۳۶۰	
۳۷۲		۳۶۱	
۳۷۳		۳۶۲	
۳۷۴		۳۶۳	
۳۷۵		۳۶۴	
۳۷۶		۳۶۵	
۳۷۷		۳۶۶	
۳۷۸		۳۶۷	
۳۷۹		۳۶۸	
۳۸۰		۳۶۹	
۳۸۱		۳۷۰	
۳۸۲		۳۷۱	
۳۸۳		۳۷۲	
۳۸۴		۳۷۳	
۳۸۵		۳۷۴	
۳۸۶		۳۷۵	
۳۸۷		۳۷۶	
۳۸۸		۳۷۷	
۳۸۹		۳۷۸	
۳۹۰		۳۷۹	
۳۹۱		۳۸۰	
۳۹۲		۳۸۱	
۳۹۳		۳۸۲	
۳۹۴		۳۸۳	
۳۹۵		۳۸۴	
۳۹۶		۳۸۵	
۳۹۷		۳۸۶	
۳۹۸		۳۸۷	
۳۹۹		۳۸۸	
۴۰۰		۳۸۹	
۴۰۱		۳۹۰	
۴۰۲		۳۹۱	
۴۰۳		۳۹۲	
۴۰۴		۳۹۳	
۴۰۵		۳۹۴	
۴۰۶		۳۹۵	
۴۰۷		۳۹۶	
۴۰۸		۳۹۷	
۴۰۹		۳۹۸	
۴۱۰		۳۹۹	
۴۱۱		۴۰۰	
۴۱۲		۴۰۱	
۴۱۳		۴۰۲	
۴۱۴		۴۰۳	
۴۱۵		۴۰۴	
۴۱۶		۴۰۵	
۴۱۷		۴۰۶	
۴۱۸		۴۰۷	
۴۱۹		۴۰۸	
۴۲۰		۴۰۹	
۴۲۱		۴۱۰	
۴۲۲		۴۱۱	
۴۲۳		۴۱۲	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۲۰	اس لئے حق و باطل کے معرکہ میں صداقت و سعادۃ کے دشمنوں کے حوصلے بڑھاتا ہے اور چپکے ہی چپکے اپنے رفتار کے دلوں میں اپنی تدابیر کا انکار کرتا رہتا ہے۔	۱۰۹	وسوسہ اندازی ! اس کے ذرائع جن و انس اور خود نفس انسانی !
۱۲۱	اس لئے حق پرستوں کو شیطان کی عہودیت سے منع کیا گیا ہے۔	۱۱۰	نگاہ فریب آرزوئیں۔ باطل تمناؤں۔ غلط اعمال کو مزین بنا کر دکھاتا۔
۱۲۲	”شیطان کی عہودیت“ کے معنی کیا ہیں ؟	۱۱۱	زینت اعمال کے مظاہر !
۱۲۳	”پرستش“ نہیں بلکہ غیر اللہ کے احکام کی اطاعت اسی کو طاغوت کہا گیا ہے۔	۱۱۲	دنیا سے مذہب میں کورانہ تقلید۔
۱۲۴	طاغوت کے معنی ؟	۱۱۳	شیطان حیات اجتماعیہ کے مقابلہ میں ذاتی مفاد کو مقدم کر کے دکھاتا ہے۔
۱۲۵	ہر غیر خدائی نظام	۱۱۴	اسی لئے اتفاق فی سبیل اللہ کی جگہ بخل کی تعلیم دیتا ہے۔
۱۲۶	تحتاکم الی الطاغوت سے مفہوم !	۱۱۵	اور بیجا صرف کرنے پر اکساتا ہے۔
۱۲۷	ایسے غیر خدائی نظام کی اطاعت	۱۱۶	شیرازہ ملت کو بکھرنے کے لئے فتنہ پردازیاں کرتا ہے۔
۱۲۸	ایک اور طاغوتی نظام	۱۱۷	جھوٹی خبریں اڑاتا ہے۔
۱۲۹	یعنی طاغوت، مذہبی تقدس کے جامہ احرام میں، اولیاء الطاغوت اور اولیاء اللہ دو متمیز راستے۔	۱۱۸	سرگوشیاں کرتا ہے۔
۱۳۰	طاغوت اور اللہ ظلمت کی طرف۔	۱۱۹	تا کہ اتحاد کی جگہ تشتت و انتشار پیدا ہو جائے
۱۳۱	اور اللہ ظلمت سے نور کی طرف لے جاتا ہے۔	۱۲۰	یا سوسائٹی میں فواحش کو عام کرتا ہے۔
۱۳۲	اس سے مفہوم کیا ہے ؟	۱۲۱	نیز بحث و جدل پر ابھارتا ہے۔
۱۳۳	شیطانی لغزش کے اسباب ؟	۱۲۲	نیک مقاصد کی تکمیل میں سہو و نسیان پیدا کرتا ہے
۱۳۴		۱۲۳	اور سب سے بڑی چیز یہ کہ قلب انسانی کو خوف و
۱۳۵		۱۲۴	حزن کا کاخانہ بنا دیتا ہے۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۳۵	تدبیر امور الہیہ	..	خود انسانی اعمال
"	ملائکہ مدبرات امور ہیں۔	۱۳۰	اور اس کی سوسائٹی یعنی قرین۔
"	یہی امر الہی کے تقسیم کرنے والے ہیں۔	۱۳۲	شیطان حربوں سے پناہ کہاں مل سکتی ہے؟
	تمام اشیائے کائنات اس کے امر کے مطابق سرگرم عمل ہیں۔	"	خدائی قوانین کی اطاعت میں۔
۱۳۶	یہ امر وسائط و ذرائع سے نفوذ پذیر ہوتا ہے۔	۱۳۴	اور کہاں؟
"	عالم امر کے ان وسائط کا نام ملائکہ ہے۔		طاغوتی نظام کے سرغٹوں کو بھی شیاہین کہا گیا ہے۔
"	ہے۔	۱۳۶	اور سرکش قبائل کے افراد کو بھی
"	انہی کو عالمین عرش کہا گیا ہے	"	آسمانوں کی طرف اڑنے والے "شیاطین"
۱۳۷	اس لئے کہ.....	"	یعنی غیب کی خبریں لانے کے مدعی۔
"	چونکہ نظام کائنات کو ٹھیک ٹھیک انداز پر چلانا مقصود ہے۔	"	کاہن اور ساحر۔
"	اس لئے عالم امر کے یہ کاندھے خلاف مزاجی احکام کی قدرت ہی نہیں رکھتے۔	۱۳۷	قرآن کریم ان کے اثرات سے منتر ہے۔
۱۳۸	ملائکہ کا ایک اہم فریضہ پیغام خداوندی کا پہنچانا ہے۔	۱۳۹	شیاطین کے دواور کام۔
"	لیکن صرف رسولوں تک پہنچانا۔	"	(i) تحریف کتب سماوی۔
"	اس سے آگے عام انسانوں تک تبلیغ رسالت نبی کا کام ہے۔	"	(ii) وضع روایات۔
۱۳۹	لہذا ملائکہ صرف چھٹی رسال کی مانند ہیں۔ لیکن رسول اپنے پیغام پر عمل کر کے دکھاتا اور حکومت الہیہ کو قائم کر کے بھی بناتا ہے۔	۱۴۰	شیطان بمعنی سانپ
"		۱۴۱	خلاصہ مبحث
		۱۴۲	(۵) ملائکہ مدبرات الامر
		۱۴۳	ملائکہ کے معنی — پیغام رسال۔ احکام بردار
		"	ملائکہ کے معنی مختلف قوتیں۔
		۱۴۵	استوار علی العرش کے معنی مرکزی کنٹرول

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۶۶	اس ایمان سے مفہوم کیا ہے؟	۱۵۲	اس لئے فرشتے اس معنی میں رسول نہیں تھے۔
۱۶۷	زمانہ جہالت میں فرشتوں کے متعلق باطل تصورات	۱۵۳	رسولوں کے علاوہ جماعتِ مومنین پر فرشتوں کا نزول۔
۱۶۸	ان غلط عقائد کی تردید۔	۱۵۴	تسکینِ قلب کی نذرانی ہارثوں کے حامل
۱۶۹	اور صحیح تصور کا اثبات۔	۱۵۵	بدروحنین کے میدانوں میں تائیدِ ربانی کے پیکر۔
۱۷۰	ملائکہ کا تعلق انسان کے ساتھ	۱۵۶	اسی تائید و نصرت کو درود و صلوة کہا گیا ہے۔
۱۷۱	انسان کے فدام۔	۱۵۷	یہ درود صرف رسول تک ہی محدود نہیں ہے
۱۷۲	لہذا انسان کا کام یہ ہے کہ انفس و	۱۵۸	بلکہ جماعتِ مومنین (حزب اللہ) بھی اس کے دائرہ کے اندر ہے۔
۱۷۳	آفاق کی امن تمام قوتوں کو مستحضر کر کے	۱۵۹	خدا کی طرف سے بشارتیں لے کر نازل ہوتے ہیں۔
۱۷۴	منزلے ایزدی کے مطابق کام میں لائے	۱۶۰	اور عذابِ خداوندی کے حامل بھی یہی ہیں۔
۱۷۵	کیا ملائکہ دکھائی دے سکتے ہیں؟	۱۶۱	پیغامِ موت کے قاصد بھی۔
۱۷۶	جواب نفی میں ہے۔	۱۶۲	انسانوں کے نگران و محافظ۔
۱۷۷	البتہ حضراتِ انبیائے کرامؑ کے ساتھ معاملہ کس	۱۶۳	اور ان کے اعمال کے ریکارڈ کیمرہ (مستجیل)
۱۷۸	طرح پیش آتا تھا۔ اسے ہم سمجھ نہیں سکتے	۱۶۴	یہ ریکارڈ (نامہ اعمال) انسان کے اپنے
۱۷۹	کہ یہ خاصۃً نبوت میں سے ہے۔	۱۶۵	گلے میں لٹکتا ہے۔
۱۸۰	روح	۱۶۶	قیامت میں فرشتوں کا منصب۔
۱۸۱	ملائکہ کے ضمن میں روح کا ذکر	۱۶۷	منصہم اور سابق
۱۸۲	روح کے معنی قوت کے ہیں۔	۱۶۸	اہل جنت کا استقبال کرنے والے
۱۸۳	جبریل اور روح الامین	۱۶۹	جہنم کے داروغے — مائلک
۱۸۴	قرآن کو روح القدس لے کر نازل ہوا۔	۱۷۰	یہ ہیں وہ ملائکہ جن پر ایمان کا مطالبہ ہے۔
۱۸۵	اسی کو روح الامین کہا گیا ہے۔	۱۷۱	
۱۸۶	اور جبریل بھی۔	۱۷۲	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱۷۶	ہے ان کی ماہیت دریافت کر لینے کا نہیں	۱۷۱	جبریل کے ساتھ میکائیل بھی۔
..	اور مقصد یہ کہ ان کا تعلق انسانی زندگی	..	روح القدس کی تائید۔
..	سے کیا ہے؟	..	روح اور ملائکہ
..	وہ انسان جس سے یہ سب ہنگامہ عالم	..	روح القدس جن کی تائید حضرت عیسیٰ کو حاصل
۱۷۷	گرم ہے۔	..	تھی۔
..	خلاصہ مبحث۔	..	روح کے معنی 'وحی' خداوندی کے بھی ہیں۔
۱۷۹	(۶) وحی	۱۷۲	ملائکہ اور روح کائنات کے سلسلہ ارتقا کے
۱۸۰	انسان وادی آدمیت میں — یکہ و تنہا!	..	کے اہم وسائل ہیں۔
..	لیکن خدا کی طرف سے سامان ہدایت و سعادت	..	ربوبیت انہی قوتوں کی رو سے ہوتی ہے۔
۱۸۱	کیا کشمکش زندگی میں عہدہ براہوئے کے لئے	۱۷۳	ایک اہم حقیقت کی وضاحت۔
..	انسان کو کسی خارجی روشنی کی بھی ضرورت ہے؟	۱۷۴	ماہیت اشیائے کائنات کے متعلق علم انسانی
..	یہ بہت اہم سوال ہے۔ اور مغرب زدہ ذہنیتوں کو	..	کا اعتراف۔
..	اس کے حل کی خاص طور پر ضرورت ہے۔	۱۷۵	اڑھائی ہزار سال پیشتر
..	کائنات کے متعلق پچھلی صدی تک یورپ کے	۱۷۶	اور آج
..	اباب فکر کا تصور۔	..	اب افراط کی طرف آئے۔
۱۸۲	ایک بنیادی سوال۔ کیا انسان کے سامنے	..	انسان غیر محسوس حقیقتوں کو مجاز کے پیکر
..	کوئی مسئلہ بھی ہے یا اس کی زندگی گھٹن	..	میں ڈھالتا ہے اور ہر ایک سے تقاضا
..	خور و نوش کی زندگی ہے؟	..	کرتا ہے کہ ان حقیقتوں کو اسی شکل میں
۱۸۳	یقیناً ہے! قصہ آدم کا ایک لطیف گوشہ	..	مانا جائے جو اس کے ذہن میں ہے۔ یہ
..	یہ سوال کیا ہے؟ انسان حیات ابدی کا راز	..	تقاضا غلط ہے۔
۱۸۴	پالینا چاہتا ہے۔	..	جادۂ اعتدال وہی ہے جسے قرآن کریم نے متعین
..	کیا ہے یعنی تقاضا ان چیزوں کے اقرار کا

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۰۱	عقل یکسر جذبات کے تابع ہوتی ہے اور	۱۸۵	حیات ابدی کے لئے ابلیسی فریب اور خدائی
..	جذبات کا انصارم بدیہی ہے۔		راہ نمائی۔
۲۰۶	یہ تصادم مذہبیت کی زندگی میں ناگزیر ہے۔	۱۸۶	حیات ابدی ادراک حقیقت کے بغیر ممکن نہیں
۲۰۷	عقل اس باب میں آتش و خون کی مولیٰ کے	..	کیا ادراک حقیقت ممکن ہے؛ اگر ممکن ہے تو کس
..	سامان فراہم کرتی ہے۔	..	طرح؟
..	ہلاؤ اور جنگیز خال کے زمانہ میں بھی اور	۱۸۷	یہ علم کے ذریعے ممکن ہے لیکن کونسے علم کے ذریعے؟
..	آج بھی۔	..	انسان کو سب سے پہلے علم محسوسات عطا کیا گیا ہے۔
..	جنگ کے خلاف اقوام یورپ کا متحدہ	..	عقل اس دنیائے علم کی توتِ نیز و تنقید ہے۔
..	اعلان لیکن اس کے باوجود پھر مولناک	۱۸۸	عقل کی عظمت۔
..	جنگ!	..	لیکن کیا عقل ادراک حقیقت کر سکتی ہے؟
..	ایک نظام جدید کی تلاش میں یورپ	..	عالمِ طبیعیات میں عقل کی کوتاہ دامنہ۔
..	کی سرگردانی۔	۱۸۹	مادی کائنات کے اساس و بنیاد کے متعلق جدید
۲۰۸	یورپ کس قسم کا نظام چاہتا ہے؟		تحقیقات۔
۲۱۰	یورپ کے موجودہ قلبی اضطراب کی ایک	۱۹۰	اب کائنات کی اساس مادہ کے بجائے مادہ المادہ
..	جھلک پروفیسر جوڈ کے آئینہ میں۔		قرار پا چکی ہے۔
۲۱۲	یورپ کے نوجوان کی عبرت انگیز زندگی	۱۹۱	اشیاء کی حقیقت کے متعلق برٹلے اور ایڈنگٹن
۲۱۳	کیا انسانی فکر ارتقاء کے میکائی عمل کا نتیجہ ہے؟		کے نظریات۔
..	ایک نہایت اہم سوال اور اس کے تعلق	۱۹۳	حقیقت اشیا کا ادراک عقل کے بس کی چیز نہیں
..	تحقیقِ جدیدہ۔	..	محققین مغرب کی تصریحات۔
۲۱۴	شعور انسانی کیسے پیدا ہوتا ہے۔	..	ادراک حقیقت عقل کے بس کی بات نہیں۔
۲۱۵	محققین مغرب کا فیصلہ کہ حیات میکائی	۱۹۴	”خلاف عقل“ کا مفہوم۔
	عمل نہیں۔	۱۹۹	کیا دنیائے معاملات میں عقل کی راہ نمائی کافی ہے؟

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۲۳	نفس انسانی کے مختلف مظاہر	..	اور نہ ہی فکر انسانی
"	سب سے پہلے جبلت	..	"دلڈن کر" کی تصریحات
..	جبلت وادی حیوانیت میں	۲۱۶	"بسموتیل" کی تصریحات
۲۲۵	جلب وادی انسانیت میں	۲۱۷	انسان کے اندر فکر یا شعور کے علاوہ کچھ اور بھی ہے
۲۲۶	اخلاقیات کی منزل میں جبلت کو ضمیر کی آواز بنتے ہیں	..	اسے نفس۔ اتنا۔ یا خودی کہتے ہیں
..	ضمیر کس طرح مرتب ہوتی ہے؟	۲۲۰	نفس کے متعلق مغربی حکماء کی تحقیق
۲۲۷	موروثی اثرات ابتدائی تعلیم و تربیت	..	مادہ پرستی کے نظریہ پر ایک اور کارنی ضرب
..	کے اخراجات۔ ماحول کے اثرات سے	..	نفس انسانی مادہ کی تخلیق نہیں۔ اس کا
..	ان امور میں مغربی محققین کی تحقیقات	..	مرچشمہ کہیں اور ہے
..	لہذا ضمیر کی آواز ان ہی خارجی اثرات کا پرتو ہوتی ہے	۲۲۱	حکمائے یورپ اور تخلص دہدایت کے متذوق
..	نفس تو امر بُرائی سے روکتا ہے۔ لیکن اسی بُرائی	..	قرآن کریم کا ارشاد۔ ایک درخشندہ ضمنی گوشہ
..	سے جسے وہ بُرائی سمجھے	۲۲۲	جب حیات شعور سے متمسک ہوتی ہے
۲۲۸	اس لئے جبلت بھی انسانی بہتری کے لئے کافی	..	تو اس سے نفس انسانی (ایغو) متشخص
..	نہیں	..	ہوتا ہے
..	علم غیر استدلالی کا ایک اور میدان۔ ذوق	..	ایغو کی انفرادیت کبھی ضائع نہیں ہوتی
۲۲۹	اور۔ وجدان۔ ایک بلند نوع فکر	..	ایغو کا استحکام یہی انتہائے شرف
۲۳۱	مختلف انسانوں میں عقلی تفاوت کس بنا پر ہو جائے	..	السانیت ہے
..	علمائے علم الحیات کا میکا کی نظریہ!	۲۲۳	جن اعمال سے خودی میں استحکام ہو وہ
..	لیکن ایک (GENIUS) کی پیدائش کے	..	اعمال صالحہ جن سے اس میں ضعف آجائے
..	متعلق یہ سب نظریئے دھڑے کے دھڑے	..	وہ اعمال سبتہ
..	رہ جاتے ہیں	..	کیا ادراک حقیقت نفس انسانی کے پس کی چیز ہے
..		..	ایک اہم سوال!

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۳۹	نہیں بن سکتا۔ نگہ بازگشت — گذشتہ مطالب پر ایک طاثرانہ نگاہ۔	۲۳۲	فجائی ارتقا کا نظریہ۔ نابغہ (GENIUS) وجدان کا شاہکار ہوتا ہے۔
۲۴۱	آخری مقام — ایک بلند و بالا کردہ اس گروہ کی خصوصیات کہری	۲۳۳	کیا وجدان انسانی راہ نمائی کے لئے کافی ہے؟ بالکل نہیں۔ وجدان کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ اور حقیقت ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے
۲۴۲	ایک عظیم الشان نابغہ۔ لیکن سیرت کے اعتبار سے بھی عظیم النظر اور	۲۳۴	پھر وجدان صاحب وجدان کی سیرت کو متشکل نہیں کر سکتا۔ علم غیر استدلالی کا ایک اور میدان۔ تصوف۔ تصوف، خیال، ارادہ یا نفس کی قوتوں سے متعلق فن ہے۔
۲۴۳	فقید المثال۔ وہ ایک گہری فکر میں غلطاں و بیجاں رہتا ہے۔ حتیٰ کہ حقیقت خود اپنے آپ کو اس پر منکشف کر دیتی ہے۔	۲۳۵	اس کے نتائج بھی مختلف مقامات پر مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے کشف کبھی حجت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کوئی معیار ایسا نہیں جس سے اس باب میں حق و باطل کی تفریق ہو سکے۔
۲۴۴	یہ ہے مقام نبوت۔ نبوت ایک الگ جداگانہ منفرد تجربہ ہے۔ تصوف وغیرہ کو اس سے کچھ تعلق نہیں۔ نبی کا پیغام ایک قیامت خیز انقلاب اپنے ساتھ لاتا ہے۔	۲۳۶	پھر اس کا معیار خوارق عادات ہیں جو بجائے خوش ایک نہ سلجھنے والی گتھی ہے۔ ان سب کے علاوہ تصوف خواہ کسی مقام پر کیوں نہ ہو ایک انفرادی تجربہ ہے اس لئے نوع انسانی کے لئے راہ نمائی کا کام نہیں دے سکتا۔
۲۴۵	مقام نبوت اور تصوف میں فرق (ایک صوفی کے الفاظ میں)۔ نبی کی بعثت محض اتفاق نہیں ہوتی بلکہ ایک عظیم الشان مقصد کے لئے ہوتی ہے۔ نبی پر جب حقیقت یا حیات اپنے آپ	۲۳۸	ادریہ انفرادیت اعتراف شکست ہے۔ لہذا باطنیت (تصوف) بھی ادراک حقیقت کا ذریعہ
۲۴۶		۲۳۹	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۲۵۳	شروع سے مضطرب و بے قرار سرگرداں حیران پھر رہا ہے۔	۲۴۷	کو منکشف کر دیتی ہے تو اسے وحی کہا جاتا ہے وحی کے ذریعہ ادراک حقیقت کا نتیجہ ہر جگہ ایک ہوتا ہے
۲۵۳	باب دوم	۲۴۸	مقام وحی اور عقل — علم استدلالی کے ذریعہ غیر استدلالی دنیا کی بات سمجھ میں نہیں آ سکتی
۲۵۴	سابقہ حقائق کی ہر کھ استنتاجی طریق سے عقل قابل فخر ہو رہا ہے۔	۲۴۸	وحی اور سائنس — سائنس حقیقت کو جُڑ جُڑ دیکھتی ہے اور وحی تمام احوالاً
۲۵۴	قرآن اور عقل — عقل کی اہمیت اور شان	۲۵۰	اس لئے سائنس وحی کے دائرہ کے اندر کی چیز ہے لیکن وحی سائنس کے دائرہ کے اندر
۲۵۴	بائیں ہمہ عقل کا دائرہ محدود ہے۔ اس میں وسعت پیدا کرنے کے لئے وحی کی روشنی کی ضرورت ہے۔	۲۵۱	سائنس حقیقت کے متعلق صرف معلومات ہم پہنچاتی ہے اور وحی یہ بتاتی ہے کہ انسان خود بھی وحی کچھ کیسے بن سکتا ہے۔
۲۵۴	وحی کے متعین کردہ اصولوں کی روشنی میں عقل فریب نہیں دے سکتی۔ فریب اس وقت دیا جاتا ہے جب منزل متعین نہ ہو۔	۲۵۱	خارجی دنیا اور داخلی دنیا میں کوئی اختلاف و تضاد نہیں ہوتا۔ لہذا مسلک رہبانیت کی بنیاد یہی غلط ہے۔
۲۵۸	عقل کی تدبیل و تحقیر حماقت کی دلیل ہے۔ البتہ اس کے دائرہ عمل و نفوذ کا تعین ضروری ہے۔	۲۵۱	وحی کی مدد سے انسان جو کچھ موجود ہے اسے وہ کچھ بنا دیتا ہے جو اسے ہونا چاہیے۔ اسی کو تکمیل منشاء خداوندی یا رضائے الہی کہتے ہیں۔
۲۵۹	انکشاف حقیقت۔ حقیقت کا انکشاف نہیں کیا جاتا بلکہ یہ اپنے آپ کو خود منکشف کرتی ہے۔ اسی کا نام "تنزیل" ہے جس سے وحی کی خارجیت واضح ہو جاتی ہے۔	۲۵۲	اسی طرح نفس انسانی خود حقیقت سے ہمدوش ہو جاتا ہے۔
۲۶۱	"نزدول" سے مراد یہ نہیں کہ وحی اوپر کی سمت ۲۶۱	۲۵۲	یہ ہے بلکہ نفس کا راز جس کی تلاش میں انسان

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
..	وحدت حیات کے تصور نے نوع انسانی	..	نیچے کی سمت کو آتی ہے۔
..	کے تمدن و تہذیب کی اساس کو بدل دیا۔	..	اس سے مفہوم یہ ہے کہ یہ ایک خارجی شے
..	اس سے ایک ایسی ہیئت اجتماعہ وجود میں آتی	..	ہے جسے انسان کسب و ہنر سے اپنے
..	ہے جس میں حیات اپنی کلی طور کر سکتی ہے	..	اند پر پیدا نہیں کرتا۔
۲۴۳	لیکن اس نظام میں ہیئت اجتماعہ کی تشکیل	..	وحی اکتسابی بلکہ نہیں بلکہ خالصتہ وہی عطیہ ہے
..	جن افراد سے ہوتی ہے یہ تعلیم ان کی خودی	۲۴۳	اور قانون مشیت کے مطابق عطا ہوتا ہے۔
..	(سیرت) کی پختگی کا بھی انتظام کرتی ہے	۲۴۴	لیکن یہ انتخاب یونہی نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے
۲۴۴	پھر یہ نظام افراد اور جماعت کے باہمی تعلق کو اس	..	لئے اس پر گزیدہ ہستی کو خاص طور پر مبعوث
..	طرح لاینفک بنا دیتا ہے کہ ایک کے	..	کیا جاتا ہے۔
..	وجود کا انحصار دوسرے پر ہوتا ہے۔	..	جسے اس کے لئے خاص انداز سے تیار کیا جاتا ہے
۲۴۵	اس نظام کی بنیاد عدل پر ہوتی ہے۔	۲۴۸	وحی کی صداقت کے پرکھنے کا استنتاجی طریق۔
۲۴۶	اور عدل ہی پر حقیقی مساوات کا مدار ہے	۲۴۹	چھٹی صدی عیسوی میں تمام تہذیب دنیا کی حالت
..	عیسائیت اور اسلام کی مساوات میں	..	شرک، ہر جگہ مستولی۔
..	فرق۔	۲۵۰	اور ہیئت اجتماعہ کی بنیادیں۔ ملکیت
۲۴۷	دنیا نے وحی کی رو سے لائے ہوئے نظام زندگی	..	برہمنیت، تہذیبی رنگ و نسل، سرپرہ داری
..	کی سخت مخالفت کی لیکن تجربات و مشاہدات	..	اور غلامی پر قائم تھیں۔
..	کے بعد دنیا پھر ٹھوکریں کھا کر اسی نظام کی	۲۵۱	اس ماحول میں عرب کی وحشی سرزمین سے ایک
..	طرف آرہی ہے۔ ملکیت کا خواب پریشان	..	داعی انقلاب اٹھتا ہے اور اس تمام نظام
..	ہو گیا۔ برہمنیت کے جال کا تار و پود بکھر گیا۔	..	کہن کے ایک ایک گوشے کے خلاف اعلان
۲۴۸	غلامی کا وجود مٹ گیا۔ معاشی نظام میں	..	بغادت کرتا ہے۔
..	ایک عظیم الشان انقلاب آ گیا۔	۲۵۲	اس انقلاب آنہیں تعلیم کی اصل و بنیاد وحدت
..	قومیت پرستی کے اصول اپنا پورہ بستر	..	حیات کی حقیقت عظمیٰ پر ہے۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۱۶	رسولوں کا فریضہ صرف پیغام رسانی نہیں ہوتا	۲۹۹	وحی، یقینی علم ہے۔
۳۱۷	بلکہ اس پیغام پر عمل کر کے دکھانا بھی ہوتا ہے	۳۰۰	وحی کے ذریعے رسولوں کو امورِ غیب کی اطلاع ملتی
۳۱۸	رسول خود وحی کا قبیح ہوتا ہے۔	۳۰۱	ہے۔
۳۱۹	لیکن رسول کی اطاعت بھی ضروری ہے۔	۳۰۲	ان امور سے صاحبِ وحی ذاتی طور پر واقف نہیں
۳۲۰	اس لئے کہ رسول اس نظامِ حکومتِ الہیہ کا مرکز	۳۰۳	ہوتا۔
۳۲۱	اولیں ہوتا ہے جسے وہ قائم کرتا ہے۔	۳۰۴	انہی امور کی بنا پر صاحبِ وحی اپنے ماحول سے
۳۲۲	اس مرکز کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے۔	۳۰۵	بہت آگے ہوتا ہے۔
۳۲۳	تبشیر و تنذیر کا مفہوم	۳۰۶	عام ماحول ہی نہیں بلکہ اپنے خویش و اقارب
۳۲۴	رسول ایک طبیبِ مشفق کی طرح لوگوں کی اصلاح	۳۰۷	سے بھی الگ۔
۳۲۵	کے لئے مضطرب و بے قرار ہوتا ہے	۳۰۸	وحی کی قسمیں؛ غیر نبی اور وحی۔
۳۲۶	لیکن رسول صرف ہدایت پہنچا سکتا ہے۔ ہدایت	۳۰۹	خلاصہ بحث۔
۳۲۷	دے نہیں سکتا۔	۳۱۰	
۳۲۸	ایک عظیم الشان حقیقت۔	۳۱۱	
۳۲۹	مذہبِ عالم کی باہمی رقابت و چشمک کیوں ہے	۳۱۲	
۳۳۰	دو متضاد عقیدے۔	۳۱۳	
۳۳۱	(i) تمام مذاہب کے بانی ایک دوسرے	۳۱۴	
۳۳۲	کے خلاف تھے۔	۳۱۵	
۳۳۳	(ii) تمام مذاہب یکساں طوع پر تھے ہیں۔	۳۱۶	
۳۳۴	یہ دونوں عقیدے غلط ہیں۔	۳۱۷	
۳۳۵	تیسری راہ — تمام مذہبی کتابوں سے اچھی اچھی	۳۱۸	
۳۳۶	باتیں یکجا کر کے ایک جدید صحیفہ ہدایت	۳۱۹	
۳۳۷	مرتب کیا جائے۔	۳۲۰	
۳۳۸		۳۲۱	
۳۳۹		۳۲۲	
۳۴۰		۳۲۳	
۳۴۱		۳۲۴	
۳۴۲		۳۲۵	
۳۴۳		۳۲۶	
۳۴۴		۳۲۷	
۳۴۵		۳۲۸	
۳۴۶		۳۲۹	
۳۴۷		۳۳۰	
۳۴۸		۳۳۱	
۳۴۹		۳۳۲	
۳۵۰		۳۳۳	
۳۵۱		۳۳۴	
۳۵۲		۳۳۵	
۳۵۳		۳۳۶	
۳۵۴		۳۳۷	
۳۵۵		۳۳۸	
۳۵۶		۳۳۹	
۳۵۷		۳۴۰	
۳۵۸		۳۴۱	
۳۵۹		۳۴۲	
۳۶۰		۳۴۳	
۳۶۱		۳۴۴	
۳۶۲		۳۴۵	
۳۶۳		۳۴۶	
۳۶۴		۳۴۷	
۳۶۵		۳۴۸	
۳۶۶		۳۴۹	
۳۶۷		۳۵۰	
۳۶۸		۳۵۱	
۳۶۹		۳۵۲	
۳۷۰		۳۵۳	
۳۷۱		۳۵۴	
۳۷۲		۳۵۵	
۳۷۳		۳۵۶	
۳۷۴		۳۵۷	
۳۷۵		۳۵۸	
۳۷۶		۳۵۹	
۳۷۷		۳۶۰	
۳۷۸		۳۶۱	
۳۷۹		۳۶۲	
۳۸۰		۳۶۳	
۳۸۱		۳۶۴	
۳۸۲		۳۶۵	
۳۸۳		۳۶۶	
۳۸۴		۳۶۷	
۳۸۵		۳۶۸	
۳۸۶		۳۶۹	
۳۸۷		۳۷۰	
۳۸۸		۳۷۱	
۳۸۹		۳۷۲	
۳۹۰		۳۷۳	
۳۹۱		۳۷۴	
۳۹۲		۳۷۵	
۳۹۳		۳۷۶	
۳۹۴		۳۷۷	
۳۹۵		۳۷۸	
۳۹۶		۳۷۹	
۳۹۷		۳۸۰	
۳۹۸		۳۸۱	
۳۹۹		۳۸۲	
۴۰۰		۳۸۳	

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۳۵	لیکن وہ تعلیم آج قرآن کے باہر اور کہیں	-	یہ بھی غلط مسلک ہے۔
..	اپنی اصل شکل میں موجود نہیں۔ اس	..	موجودہ کتب مذاہب کے اختلافات
..	لئے اب نوع انسانی کا نصاب زندگی	..	نیکی اور بدی کی تعریف۔
..	صرف قرآن ہے۔	۳۲۷	صحیح راہ عمل۔ قرآن کریم کے پانچ گوشے
۳۳۶	قرآن کریم میں صرف سائنسی مذہب (اقوام) کے	..	(۱) اللہ نے دنیا کی ہر قوم میں رسول بھیجے۔
..	رسولوں ہی کا ذکر کیوں ہے؟	۳۲۸	(۲) ان رسولوں کی تعلیم اصولی اور اساسی
..	ایام اللہ کی اہمیت۔	..	طور پر ایک تھی البتہ عملی تشکیل کی جزئیات
۳۳۹	رسول کا صحیح مقام	..	میں فرق ہوتا تھا۔
۳۴۰	رسول پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔	..	(۳) جب ایک رسول کی تعلیم میں تحریف و
۳۴۱	رسول کی زندگی اس کی صداقت کی دلیل ہوتی ہے	..	الحاق ہو جاتا تو دوسرا رسول آ جاتا۔
..	رسول اجر رسالت نہیں مانگتا۔	۳۲۹	یہ دوسرا رسول وہی اصول پیش کرتا جو پہلا
۳۴۲	رسول خدا کی رحمت ہوتا ہے۔	..	رسول دے گیا تھا۔ البتہ جزئیات میں
..	لیکن اس کے لئے جو.....	..	اقتضائے زمانہ سے فرق ہو جاتا۔ یہ جزئیاتی
۳۴۳	رسول اور نبی۔	..	فرق بھی ارتقاء و عروج کی طرف جاتا تھا۔
..	ایک ہی مقام کے دو پہلو۔	..	(۴) یہ تمام اصولی تعلیم (جب دنیا میں
..	قرآن نے ان حضرات کو انبیاء بھی کہا ہے۔	..	اور کہیں نہ رہی تو) تو قرآن کریم کی رُو سے
..	اور رسل بھی۔	..	نوع انسانی کو ملی۔
۳۴۹	رسول اور نبی دونوں صاحب کتاب ہوتے	۳۳۰	یہ کتاب قیامت تک کے لئے محفوظ ہے۔
..	ہیں۔	۳۳۱	(۵) لہذا قرآنی تعلیم یہ ہے کہ تمام انبیاء
۳۵۰	رسول یا نبی کا تصور بلا کتاب غلط ہے۔	..	اپنے اپنے وقتوں میں سچی تعلیم لائے تھے۔
۳۵۱	خلاصہ بحث۔	..	بعض کو بعض پر فضیلت۔ دائرۃ تبلیغ
		۳۳۲	کے اعتبار سے۔

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
..	یعنی۔ تسخیرِ نفس و آفاق۔	۳۵۳	نگہ بازگشت
..	یہ آخری منزل کشمکشِ ابلیس و آدم کی آویزش ہے	..	نظریہ ارتقاء اور مغرب کی مادہ پرستی۔
۳۵۹	انسان ہنوز انفرادی ملکیت کے تصور سے نا آشنا تھا۔	..	کائنات کا میکا کی تصور۔
..	عقلِ جلد جو کی کارفرمائی اور مختلف عقول کی جنگ۔	۳۵۳	قرآن کریم اور نظریہ ارتقاء۔
..	اندرونی اور بیرونی کشمکش۔	..	حیات اور شعور
..	حکمتِ یونان کی غلط بینی؛	۳۵۵	مغربی نظریہ کا ابطال خود مغربی مفکرین کے ہاتھوں
۳۶۰	اور مغرب کی کوتاہ اندیشی!!	۳۵۶	ہنگامی ارتقاء کا نظریہ۔
۳۶۲	قرآنی نظام۔ انسانوں سے اقتدار چھین لیتا ہے	..	تخلیقی ارتقاء کا نظریہ۔
..	اور انسانیت کے تقاضوں کی تسکین کا	۳۵۷	وہ نظام تہذیب جو مادہ پرستی کی باطل بنیادوں پر
..	سایاں فراہم کرتا ہے۔	..	قائم ہوا۔
۳۶۳	یہ نظام وحدتِ خلق کے اصول پر مبنی ہے	..	ایسی تہذیب کی تعمیر میں تخریب مضمحل ہوتی ہے
..	جس کی رُو سے تمام نوعِ انسانی کی بہبود	۳۵۸	ایک اور اہم گوشہ فکر۔
..	ہی اصل و غایت ہو سکتی ہے۔	..	بے جان چیزوں میں تحفظِ ذات کے لئے کسی
۳۶۵	وحی کی تعلیم خلافِ عقل نہیں ہوتی۔	..	قسم کی کشمکش نہیں ہوتی۔
۳۶۶	منصبِ رسالت	..	زندگی کے ابتدائی مراحل میں خارجی قوتوں سے
۳۶۷	فرقہ بندیاں	..	کشمکش شروع ہوتی ہے۔
۳۶۸	دو غلط راہیں	..	انسانی منزل میں پہنچ کر یہ کشمکش خارجی اور
۳۶۹	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟	..	داخلی دونوں قوتوں سے شروع ہو جاتی ہے
۳۷۰	حکومتِ البتہ کا مفہوم۔		

تعارف

میری زندگی کا مقصود و مطلوب قرآن کریم کا سمجھنا اور اسے اپنی بصیرت کے مطابق دوسروں کو سمجھانا ہے۔ جہاں تک اس کے سمجھنے کا تعلق ہے بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ میں نے اس میں اپنی ساری عمر صرف کی ہے۔ یہ کتاب فی الواقعہ معجزہ ہے۔ ضخامت اتنی چھوٹی سی لیکن حقائق و معارف کے اعتبار سے ایک بحرِ ناپید اکنار۔ سعدیؒ نے ذاتِ خداوندی کے متعلق جو کہا تھا کہ:

د فتر تمام گشت دیبا یاں رسید عمر ما بچناں در اذلی وصف تو ماندہ ایم
تو ہی کیفیتِ خدا سے جلیل کے اس آخری شاہکار کی ہے۔ جوں جوں آپ اس میں آگے بڑھتے جائیں سامنے کا ساحل اور پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہے۔

ایک انفرادیت اس کی یہ ہے کہ اس کا اسلوب بیان انسانی تصانیف کے انداز سے مختلف ہے۔ انسانی تصانیف کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ایک کتاب ایک خاص موضوع سے متعلق ہوتی ہے۔ پھر اسے مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور جس مضمون سے متعلق وہ باب ہوتا ہے وہ پورے کا پورا اس باب میں آجاتا ہے۔ اس طرح جب اس کتاب کا قاری باب در باب آگے بڑھتا جاتا ہے کتاب کا مفہوم ساتھ کے ساتھ سمجھ میں آتا چلا جاتا ہے اور وہ کتاب ختم کر لیتا ہے تو اس کا مفہوم مربوط شکل میں اس کے ذہن میں منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کا انداز اس سے مختلف ہے۔ وہ ایک موضوع کو مسلسل و متواتر ایک ہی مقام پر بیان نہیں کرتا۔ وہ ایک جگہ ایک بات کہتا ہے۔ دوسری جگہ اس میں اضافہ کرتا ہے۔ تیسرے مقام میں اس کی استثنا آجاتی ہے۔ کسی اور جگہ اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ کسی اور سلسلہ میں اس کا ضمنی تذکرہ آجاتا ہے تو اس کا ایک اور گوشہ نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس اسلوب بیان کا نام قرآن کریم کی اصطلاح میں ”تصریف آیات“ ہے۔ یعنی آیات کو پھر پھر کر لانے سے مفہوم کی وضاحت کرنے چلے جانا۔ قرآن کا یہ اسلوب کس قدر بلوغ اور عمیق ہے اس کی تشریح کا یہ موقع نہیں۔ اس وقت مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ اس

کا انداز عام انسانی تصانیف سے مختلف ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس انداز سے قرآن کریم نے اپنی تعلیم کو پیش کیا ہے، اسے کما حقہ سمجھنے کے لئے قرآن مجید پر اتنا عبور ضروری ہے کہ جو بات آپ کے سامنے آئے اس سے متعلق قرآن کے دیگر تمام مقامات آپ کے پیش نظر ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس مبتدی کے دل میں قرآن کریم کے سمجھنے کا شوق پیدا ہوا نہ تو اسے روزِ اول ہی قرآن پر اتنا عبور حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ تم پہلے قرآن پر اتنا عبور حاصل کرو پھر اس کی بات تمہاری سمجھ میں آسکے گی۔ یہ بھی وہ دشواری جس کی وجہ سے اکثر وہ احباب جن کے دل میں قرآن فہمی کا جذبہ بڑا شدید تھا، اسے چوم کر پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ میں نے جب ان کی اس دشواری کا احساں کیا تو اس کا حل اس کے سوا اور کوئی نظر نہ آیا کہ میں خود ان کے سامنے قرآن کریم کی تعلیم اس انداز میں پیش کر دوں جس انداز میں وہ عام تصانیف کے پڑھنے کے عادی ہیں۔ اس مقصد کے لئے میں نے تصنیفی سلسلہ شروع کیا جس کا نام ”معارف القرآن“ رکھا۔ اس سلسلہ کی پہلی جلد جس کا عنوان (دلیل تھا ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی اور ہیچ مینبول ہوئی) (بعد میں اس کا نام — من ویزداں — تجویز کیا گیا تھا) اس سلسلہ زیریں کی دوسری کڑی کا عنوان — ”ابلیس و آدم“ تھا جو ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا اور اب تیسرا ایڈیشن پیش خدمت ہے۔ اس کے بعد اس سلسلہ کی حسب ذیل کتابیں شائع ہوئیں:

(۱) جوئے نور — اس میں حضرت فوئح سے لے کر حضرت شعیبؑ تک کے پیامبران انقلاب کے کوائف جملہ اور ان کی اقوام کی عبرت آموز داستانیں مذکور ہیں۔
(۲) برقی طور — صاحب ضرب کلیمی حضرت موسیٰ اور فرعون کی آویزش اور بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی حقائق پر درسرگزشت۔

(۳) شعلہ مستور — حضرت عیسیٰ کے کوائف حیات، جدید تاریخی انکشافات کی روشنی میں۔

(۴) معراج انسانیت — صاحب قرآن عظیم کی سیرت طیبہ، خود قرآنی آئینہ میں۔

(۵) انسان نے کیا سوچا؟ اور
(۶) خدا نے کیا کہا؟ یعنی
انسانی فکرنے و جی کی راہ نمائی کے بغیر زندگی کے اہم مسائل حل کرنے میں کیا کیا کادشیں کہیں اور کس طرح ناکام رہی۔ اور پھر ان مسائل کو دینی اسکا کیا ہے؟ نے کس خوبصورتی سے حل کر دیا۔

(۷) جہان فردا — مرنے کے بعد کی زندگی سے متعلق قرآنی تفصیل۔

(۸) کتاب التقادیر — انسانی تاریخ کے مشکل ترین مسئلہ کا آسان ترین (قرآنی) حل۔

ان کے علاوہ میں نے لُغَاتُ الْقُرْآنِ مرتب کی جو چار ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکی ہے اور اس کی روشنی میں 'مفہم القرآن' جس میں پورے کے پورے قرآن مجید کا (الحمد سے والناس تک) مسلسل مفہوم آگیا ہے۔ یہ قرآن کریم سمجھانے کے سلسلے میں 'میری حقیر سی کوششوں کا اجمالی تعارف' اب میں 'گزشتہ کئی سالوں' کا تبویب القرآن کے مرتب کرنے میں مصروف ہوں۔ اس انسائیکلو پیڈیا میں پورے قرآن مجید کی تعلیم اس طرح مقلد کردی جائے گی کہ آپ جس عنوان سے متعلق چاہیں قرآن کے تمام مقامات بیک وقت آپ کے سامنے آجائیں۔ یہ سلسلہ کچھ لامتناہی سا ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ کب تک مکمل ہو سکے، وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

سلسلہ معارف القرآن کی پہلی پانچ کتابوں (من ویزال) ابلیس و آدم، جوئے نور، برقی طور، اور شعلہ مستور) کے سابقہ ایڈیشن مدت ہوئی ختم ہو چکے تھے اور اگرچہ ان کے لئے احباب کے تعلق سے مسلسل موصول ہو رہے تھے لیکن چونکہ اس دوران میں 'میری تازہ تصانیف علی التواتر شائع ہو رہی تھیں' اس لئے ان کے جدید ایڈیشن جلدی شائع نہ ہو سکے۔ اب اُمید ہے کہ یہ سب تصانیف یکے بعد دیگرے پھپھتی چلی جائیں گی۔ زیر نظر کتاب میں بڑے اہم بنیادی موضوعات آگئے ہیں جن کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے بڑے الجھاؤ پیدا ہوتے ہیں۔ اس کتاب نے ان اشکال اور پیچیدگیوں کو بصیرت افروز انداز سے حل کر دیا ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

(۲) اس کا پہلا اور دوسرا ایڈیشن بسوڑا مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا تھا لیکن چونکہ میں ان موضوعات پر اپنے مقالات نیز انسان نے کیا سوچا؟ میں شرح و بسط سے لکھ چکا ہوں اس لئے اس مقدمہ کی اب ضرورت نہیں رہی۔ (۳) جن موضوعات سے اس کتاب میں بحث کی گئی ہے ان کے متعلق جو کچھ اس کتاب میں کہا گیا ہے اس میں اور ان کے متعلق ہمارے ہاں جو تصورات و نظریات (بلکہ عقائد) عام طور پر مروج ہیں ان میں آپ اکثر و بیشتر مقامات پر اختلاف پائیں گے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میری بصیرت کے مطابق 'قرآنی تعلیم' ہے۔ اگر آپ اس سے متفق ہوں تو ہوا المراد اور اگر آپ کو اس سے اختلاف ہو تو جو کچھ آپ صحیح سمجھیں اسے اختیار کیجئے۔ میں اپنے فہم قرآنی کو نہ حرف آخر سمجھا کرتا ہوں نہ سہو و خطا سے مبرا ہوں۔ میری تمام کد و کاوشیں سے مقصود یہ ہے کہ قوم کا تعلیم یافتہ طبقہ اس چشمہ زندگی (قرآن کریم) سے سیراب ہو سکے جو مزرع انسانیت کی شادابی و خشکسالی کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر میری اس کوشش سے کوئی ایک سعید روح بھی اس چشمہ زندگی کے قریب آگئی تو میں مجھو گا کہ مجھے میری محنت کا صلہ مل گیا۔

(۴) آیات میں اوپر سورت کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا مثلاً (۳/۱۲) سے مراد ہے سورہ آل عمران کی

ابلیس و آدم

ک

تعارف

آیت ۱۲۔

اب آپ ورق اُلٹے اور میرے ساتھ، خالق کی ان وادیوں میں اُترتے جنہیں قرآن کا مہر عالم کتاب اس قدر درخشندہ و تابناک بنا رہا ہے۔

والسلام

پرویز
جولائی ۱۹۷۲ء

۲۵/ بی، گلبرگ لاہور۔



گماں مبرکہ بیاباں رسید کارِ مغان
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاگ است

بَدَا خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ طِينٍ

انسان

شجر ارتقا کا گل سرسبد

ہزار مرحلہ ہاتے فغانِ نیم شبی
ز خاک تیرہ دروں تا بہ شیشہِ جلی
میانِ قطرہ نیساں و آتشِ غلی

سکوتِ مشام سے تا نغمہِ سحر گاہی
کشاکشِ زم و گرما تپ و تراش و تراش
مقامِ بست و کشاد و فشارِ سوز و کشید

مغاں کہ دانہٴ انگور آب می سازند

ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

انسان

انسانی بچہ کی پیدائش آج ہمارے نزدیک ایک ایسا عادی اور معمولی واقعہ بن چکی ہے جیسے سورج کا طلوع و غروب۔ لیکن اسباب و علل کی کڑیوں میں جکڑا ہوا انسان جب کتاب تخلیق کے اوراق کو پیچھے کی طرف الٹتا ہے تو اُس کی نگہِ استعجاب کا اُس مقام پر جا کر رُک جانا ضروری ہے جسے وہ سلسلہ تخلیق انسانی کی سب سے پہلی کڑی قرار دیتا ہے۔ اس وادی حیرت میں پہنچ کر وہ ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے کہ ”سب سے پہلا انسان“ کس طرح وجود میں آگیا۔ اس کا تخیل بجا اور تعجب درست ہے۔ انسانی تحقیق و تفتیش کا ماحصل اور اس کے تمام انکشافات و ایجادات کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ کارگہ عالم کے مختلف پُرزوں کے اسباب و علل کی کڑیوں پر پڑے ہوئے پردوں کو اپنی مڑگان کاوش سے اٹھا لیتا ہے۔ لیکن جہاں اس سلسلہ دراز کی آخری کڑی آجاتی ہے اُس کی نگہِ تجسس کے سامنے پردہ حیرت کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ یہ مقام تخیل و استعجاب انسانی علم و تحقیق کی نسبت سے متعلق ہوتا ہے یعنی جس قدر علم و دانش کی منازل آگے بڑھتی جائیں گی اسی نسبت سے یہ مقام بھی آگے سرکتا چلا جائے گا یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ایک خدا فراموش مادہ پرست اور ایک حق شناس عبدِ مومن کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ اول الذکر اس مقام سے آگے وادی حیرت کو اپنی ذہنی قیاس آرائیوں کی آماجگاہ بناتا ہے اور اس طرح خود بھی ٹھوکریں کھاتا ہے اور دوسروں کو بھی راہ سے گم کرتا ہے۔ لیکن ایک حکیم مومن وہاں پہنچ کر بلا تامل پکار اٹھتا ہے کہ اس سلسلہ دراز کی ابتدا اس قادرِ مطلق کی اسبابِ فراموشِ مشیت اور علل

نا آشنا صمدیت کی ریڑی منت ہے جو طبعی سلاسل اسباب و ذرائع سے مستغنی اور علائق و علل سے بے نیاز ہے۔ وہ علی وجہ البصیرت اس حقیقت عظمیٰ کا اعلان کرتا ہے اور اس طرح حیرت و استعجاب کی وہ وادی جوں خدا فراموش محقق کی قیاس آرائیوں سے تیرہ دنار ہو چکی تھی اس مرد خود آگاہ و خدا مست کی مشعل ایمان و شمع یقان سے جگمگا اٹھتی ہے۔

سب سے پہلا انسان "سب سے پہلا انسان" کس طرح وجود پذیر ہو گیا۔ یہ وہ مقام تخریب ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ انسانی شعور نے جب پہلے پہل آنکھ کھولی تو

اپنے گرد و پیش ایک نگار خانہ حیرت دیکھا۔ سطح ارض کی حدود فراموش و سعتیں، فضا سے آسمانی کی ناپید کنار پہنائیاں، سامنے ایک خوفناک بحر متلاطم، دائیں بائیں لرزہ انگیز دیو میکل سلسلہ کوہ، اوپر ایک معلق و مہیب چھت، اُفق کے اس پار سے ہر صبح ایک آتشیں انگارہ کی نمود اور ہر شام شفق کی جوئے خونیں میں اس کا غروب، محفل انجم کی شمع فردزاں، کہکشاں کی گرد مر مر میں اور چاند کا ساغر نور! وہ اس طلسم ہوش رُبا کو دیکھتا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ وہ بھلا کیسے سمجھ سکتا تھا کہ کائنات کا یہ میجر العقول سلسلہ کیا ہے؟ زمین کہاں سے آئی ہے۔ پہاڑ کیسے پیدا ہو گئے ہیں۔ سورج کہاں سے آتا اور کہاں چلا جاتا ہے؟ یہ چاند یہ تارے، یہ سمندر کیسے پیدا ہو گئے۔ یہ سوالات بار بار اس کے سامنے آتے اور ہر بار اُسے ایک نئی دنیا سے حیرت میں چھوڑ جاتے۔ وہ بیچارہ کیا سمجھ سکتا کہ ۷

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟

ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟ (غالب)

اور جب وہ عام عالم آفاق کے متعلق کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس کی تخلیق کس طرح ہو گئی ہے تو بھلا اس معتمہ کو کیسے سلجھا سکتا کہ "سب سے پہلا انسان" کس طرح پیدا ہو گیا؟ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لے کہ سب سے پہلے کسی نہ کسی طرح ایک مٹی کا پتلا بن گیا ہو گا جس میں جان ڈال دی گئی ہو گی۔ اور پھر اُس پتے کی پسلی چیر کر اس میں اس کے لئے ایک بیوی پیدا کر دی ہو گی۔ اور اس جوڑے سے اولاد کا سلسلہ آگے بڑھ گیا ہو گا۔ وہ بے چارہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا تھا؟ لیکن جب اس کے شعور میں کچھ بچتگی آگئی اور اس نے زندگی کی کچھ منازل طے کر لیں تو اس کے زیادہ طفولیت کی یہ نوجوہہ باعث طمانیت اور وجہ شکیبانی نہیں ہو سکتی تھی اس کے اضطراب نے کاوش بحسن و خلش

تحقیق کی صورت اختیار کی۔ علمِ اشیائے فطرت (NATURAL SCIENCES) کی رُو سے جس کی صلاحیت اس میں ودیعت کر کے رکھ دی گئی تھی اس نے ان بیج و زرع رموز کی گرہ کشائی کی کوشش شروع کی اور رفتہ رفتہ اُس کی تحقیقات نے اس نتیجہ کی صورت اختیار کر لی جسے آج نظریہ ارتقاء (THEORY OF ORGANIC EVOLUTION) سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی نگہ تفتحص نے بھانپا

نظریہ ارتقاء کہ کائنات میں منظم و مربوط انداز سے ایک سلسلہ تدریج و تحول جاری و ساری و سارن ہے۔ یعنی ہر شے ایک خاص قانون کے ماتحت بتدریج نشو و ارتقاء کے مدارج طے کر رہی ہے اور یوں ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ یہ تحول و قلب کچھ ایسے غیر محسوس انداز سے عمل میں آ رہا ہے کہ سطحی آنکھ اسے محسوس طور پر دیکھ نہیں سکتی، اور پھر یہ تبدیلیاں اتنے طولِ طویل عرصے کے بعد ظہور پذیر ہوتی ہیں کہ انسانی یادداشت کے لئے اس کا ریکارڈ رکھنا مشکل ہے۔ اس لئے ان تدریجی انقلابات کے لئے خود صحیفہ فطرت کے اوراق اور خزانہ و دفائن ارضی کے نقوش و آثار کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ کتاب فطرت کے ان منتشر اوراق کے مطالعہ کے بعد ذہنِ انسانی تخلیقِ انسانی کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ

- (۱) صفحہ ارض پر زندگی (LIFE) کی ابتدا پانی سے چھٹی ہے۔
- (۲) پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کے جرثومہ اولیں کو پیکر عطا ہوا۔
- (۳) زندگی کے یہ جراثیم مختلف نوعوں میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے پھولنے لگے۔

- (۴) ان جراثیم کے پیکروں میں ہزار ہزار سال کے مراحل کے بعد مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔
- (۵) ان طویل المیعاد مراحل کو طے کر کے سلسلہ تخلیق اس منزل پر پہنچا جسے "تخلیق بذریعہ تناسل" کہتے ہیں۔ یعنی حیوانی زندگی۔

- (۶) حیوانی زندگی اسی قسم کے غیر محسوس اور طویل المیعاد مراحل طے کرنے کے بعد منزلِ منزل انسانی پیکر میں جلوہ ریز ہوئی۔

اس طرح نوعِ انسانی کی ابتدا ہوئی۔

انسانی تخلیق کے متعلق یہ انکشافات وہ تھے جو مغربی سائنس دانوں کے سامنے ان کی سائنٹیفک تحقیقات

اور طبعی مشاہدات کے بعد آئے۔ اس کے برعکس، ان کی مذہبی کتابوں (بائبل) میں انسانی تخلیق کے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ اس علمی تحقیق کے سامنے ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے وہاں کے محققین اس نتیجے پر پہنچ گئے (اور ان کا اس نتیجے پر پہنچنا حق بجانب بھی تھا) کہ مذہبی کتابیں دراصل اس عہد کے افسانوں پر مشتمل ہیں جب انسانی شعور ہنوز بچپن میں تھا۔ اس لئے ان کتابوں کے بیانات و مذکورات علم و بصیرت کی روشنی میں پرکھے جانے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ اس حد تک تو مغرب کے محققین اپنے خیال میں سچے تھے لیکن انہوں نے بغیر تحقیق کئے، غلطی سے، یہ سمجھ لیا کہ ہر مذہبی کتاب اس قسم کے توہم انگیز افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اگر وہ اس باب میں جلد بازی نہ کرتے اور جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں علم و تحقیق کے بعد کسی نتیجے تک پہنچتے ہیں، اس بارے میں بھی ذاتی تحقیق سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی کہ دنیا کے مذاہب میں ایک کتاب ایسی بھی ہے جس کا اعلان یہ ہے کہ:

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي ۖ أَدْعُو إِلَى اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (۱۲/۱۰۸)

(اے پیغمبر!) ان سے کہہ دو کہ میری روش یہ ہے کہ میں خدا کی طرف علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی اور جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے وہ بھی (اسی طرح دعوت دیتے ہیں) کائنات میں خدا کا قانون کارفرما ہے جو جہالت کی توہم پرستیوں سے بہت بلند ہے اور اس قدر قوتوں کا مالک کہ اس میں کسی اور کی قوت شامل ہی نہیں۔ (میں اسی قانون کو ماننا اور اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں)۔

یہ آواز صحرائے عرب سے، ایک نبی اُمّی کی زبان اقدس سے، اُس زمانہ میں بلند ہوئی جب اہل مغرب ہنوز درخت کے بتوں اور حیوانات کی کھالوں سے اپنا ستر ڈھانپا کرتے تھے لیکن مغرب نے اس آواز (قرآن کریم) کو اپنی علمی تحقیق کا موضوع نہ بنایا اور پادریوں کے وضع کردہ افسانوں کو حقیقت سمجھ کر اس کی طرف سے مہرمانہ تغافل برتا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قرآن کریم جیسی سراپا علم و بصیرت کتاب، علم و عقل کی حریف سمجھ لی گئی۔ ارتقائے علوم انسانی کے لئے وہ دن انتہائی بد بختی کا تھا جب یورپ کی "مسند تحقیق" سے یہ فتویٰ صادر ہوا کہ قرآن کریم بھی، بائبل کی طرح، اساطیر الاولین (توہم پرستانہ افسانوں) کا مجموعہ ہے۔ دنیا میں اس سے بڑا جھوٹ کبھی نہیں بولا گیا۔ اس سے بڑی حماقت "اہل دانش و ہنیش" نے کبھی نہیں

کی۔ آج اس کا اندازہ بمشکل کیا جاسکتا ہے کہ مغرب اور اس کے ساتھ باقی دنیائے انسانیت اس غلط فیصلہ سے علم کے کتنے بڑے سرچشمے سے محروم ہو گئی۔ اگر مغرب کے متلاشیانِ حقیقت کے سامنے قرآن اپنی اصلی شکل میں آجاتا تو نہ معلوم آج دنیا کیا سے کیا ہو جاتی؛ زیرِ نظر موضوع میں سائنس کا معرکہ آرا کارنامہ نظریۂ ارتقاء (THEORY OF ORGANIC EVOLUTION) ہے۔ ذرا قرآنِ کریم کے اوراق الیئے اور دیکھئے

کہ اس باب میں اس کے ارشادات کیا ہیں۔ (واضح رہے کہ جیسا کہ میں دیگر مقامات پر تفصیلاً لکھ چکا ہوں) قرآنِ کریم سائنس کی تحقیقات کی کتاب نہیں اس کا اصل موضوع ایک ایسے معاشرے کی

قرآن اور سائنس کے انکشافات

تشکیل ہے جس میں تمام نوعِ انسانی کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے اور اس طرح شرفِ انسانیت اپنی تکمیل تک پہنچ جائے۔ لیکن اس میں اس مقصدِ عظیم کی بنیادیں تو توضیح کے سلسلہ میں ضمناً و تبعاً دوسری چیزوں کا بھی ذکر آجاتا ہے۔ اور چونکہ یہ ذکر خدائے علیم و حکیم کی طرف سے ہوتا ہے جو کائنات کا خلاق ہے اس لئے ہو نہیں سکتا کہ اس کی طرف سے کائنات کے متعلق کوئی اشارہ آجائے۔ اور وہ (معاذ اللہ) حقیقت کے خلاف ہو۔ مشین کا مبدع و خالق مشین کے متعلق ذرا سا اشارہ بھی کرے گا تو وہ بنی علیٰ حقیقت ہوگا۔

أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (۶۸)

کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے؛ اور وہ بڑا باریک ہیں اور

انتہائی باخبر ہے۔

اس ضمنی وضاحت کے بعد آپ دیکھئے کہ اشیائے کائنات کے طبعی ارتقاء اور انسانی تخلیق کے متعلق قرآنِ کریم نے کیا کہا ہے۔

نظریۂ ارتقاء اور قرآنِ کریم | سلسلہ کائنات کی ابتدا اور اس کے تدریجی مراحل کے متعلق قرآنِ کریم نے ایک اصول بیان کیا ہے جو اس بحث کا نقطہ

ماکد ہے۔ ارشاد ہے۔

يَذَرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ۚ ذَٰلِكَ عِلْمُ الْغَيْبِ

وَالشَّهَادَةُ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝ (۵-۳۲/۶)

تدابیرِ الٰہیہ (خدا کی اسکیموں) کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی مضمر شکل میں علم الٰہی کی بندوبستوں پر ہوتی ہیں۔ جب ان میں سے کسی اسکیم کو بروئے کار لانا مقصود ہوتا ہے تو زمین کی پستیوں سے اس کا نقطہ آغاز ہوتا ہے۔ پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی اپنے مقام تکمیل کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہے۔ یہ مراحل بڑے بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں۔ جن میں کا ایک ایک وقفہ (PERIOD) تمہارے حساب و شمار کی رُو سے ہزار ہزار برس کا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اس خدا کے قانون کے مطابق ہوتا رہتا ہے جو ہر شے کی موجودہ صورت سے بھی واقف ہوتا ہے اور اس کے مضمر ممکنات سے بھی۔ وہ آپ اندر اتنی قوت رکھتا ہے کہ ہر شے کو مناسب نشو و نما دے کر اس کے نقطہ تکمیل تک پہنچا دے۔

مثبت ایزدی کے سامنے ایک اسکیم ہوتی ہے جسے اس کی انتہائی پستی نقطہ اولیں (سب سے نچلی منزل) سے شروع کیا جاتا ہے۔ پھر وہ اسکیم ان خاص قوانین کے ماتحت جو اس کے لئے متعین کئے جاتے ہیں نشو و ارتقاء کے مراحل طے کرتی اپنی تکمیل کے نقطہ آخریں تک جا پہنچتی ہے۔ یہ مراحل بڑے بڑے طویل المیعاد "ایام" (PERIOD) میں طے ہوتے ہیں۔ کہیں ہزار ہزار سال کا ایک ایک تدریجی مرحلہ کہیں پچاس پچاس ہزار سال کا۔

تَعْرِجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ
أَلْفَ سَنَةٍ (۴/۷۰)

"ملائکہ اور روح" اس کی طرف بلند ہوتے ہیں ایک (ایک) دن میں جس کی مقدار پچاس (پچاس) ہزار سال کی ہوتی ہے۔

نقطہ آغاز | بیج کو درخت، قطرے کو گہرا خاک کے ورے کو انسان بننے کے لئے ان تدریجی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کارگہ مثبت کے ان عظیم المرتبت امور (SCHEMES) میں سے ایک اہم اسکیم انسان کی تخلیق ہے۔ اس اسکیم کا نقطہ آغاز ظہین (درجہ جمادات) بتایا گیا ہے۔

وَبَدَأَ أَخْطَىٰ الْإِنْسَانَ مِنْ طِينٍ ۝ (۳۲/۷)

اس نے انسانی تخلیق کی ابتدا مٹی سے کی۔

واضح رہے کہ خالق کے بنیادی معنی کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا نہیں۔ اس کے معنی میں مختلف عناصر میں خاص ترکیب پیدا کر کے اس سے ایک نئی چیز بنادینا۔ یہاں جس "نقطۂ آغاز" کا ذکر ہے وہ ۰ وہ مقام ہے جہاں سے زندگی ایک محسوس و مشہود شکل میں سامنے آجاتی ہے۔ اس سے پہلے مقامات کا ذکر نہیں۔

سورۃ النعام میں ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا ۖ وَأَجَلٌ مُّسَمًّىٰ

عِنْدَكَ ۖ ثُمَّ أَنْتُمْ تَمْتَرُونَ ۝ (۶/۲)

وہ ذات جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر تمہارے لئے (مختلف مراحل کی) ایک ميعاد مقرر کر دی۔ اور (ان ميعادوں کے بعد) ایک اور ميعاد بھی اس کے علم میں ہے۔ پھر بھی تم (اس حقیقت میں) شک کئے جاتے ہو۔

سورۃ ہود میں طین کے بجائے ارض کہا گیا ہے جو اور بھی جامع اور واضح ہے۔

هُوَ أَنشَأَ لَكُمْ مِنْ أَرْضٍ وَاسْتَعْمَرََكُمْ فِيهَا ۖ (۱۱/۶۱) ذ (۵۳/۳۲)

خدا نے (قانون تخلیق کے مطابق) تمہاری نمودارِ زمین

سے کی۔

سورۃ طہ میں ارشاد ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً ۖ

أُخْرَىٰ ۝ (۲۰/۵۵)

ہم نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اسی میں تمہیں گردشیں دے رہے ہیں اور پھر اسی سے دوسری مرتبہ اٹھائے جاؤ گے۔

مٹی کا پتلا نہیں بنایا، بلکہ مٹی کے خلاصہ سے اس کی تخلیق کی ابتدا کی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ۝ (۲۳/۱۲)۔ (نیز ۷۱/۲)

۱۲/۲۳:۶۹/۳۸

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔

سُلَلَةُ رَمْنٍ طِينٍ (مٹی کے خلاصہ) کے الفاظ غور طلب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر شے کی نشوونما مٹی کے خلاصہ سے ہوتی ہے۔ ہم ایک بیج زمین میں بوتے ہیں۔ اس بیج میں اُگنے کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن جن اجزاء پر اس کی نشوونما کا دار و مدار ہے انہیں وہ زمین سے جذب کرتا ہے۔ اگر زمین میں ان اجزاء (مکئیات، معدنیات وغیرہ) کی کمی ہو جاتی ہے تو اس پودے کی نشوونما رک جاتی ہے۔ یہی اجزاء مٹی کا خلاصہ کہلاتے ہیں زمین کی اس روئیدگی کو حیوانات کھاتے ہیں اور اس طرح وہی اجزاء ان کی نشوونما کا ذریعہ بنتے ہیں گوشت خور جانور ان حیوانات کو کھاتے ہیں تو اس طرح بالواسطہ وہی اجزاء ارض ان کی نشوونما کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یہی وہ طین کا سُلَلہ (مٹی کا خلاصہ) ہے جس سے ان جراثیم حیات (LIFE CELLS) کی نشوونما ہوتی ہے جو انسانی زندگی کا نقطہ آغاز ہیں۔ (تفصیل اس نکتہ کی ذرا آگے چل کر آئے گی)۔ لیکن منزلِ جمادات میں (جو اس سلسلہ کا نقطہ آغاز ہے) زندگی بخواب تھی۔ اس کی بیداری پانی کے چھینٹے سے ہوئی۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ۝ (۲۱/۲۰)

اور ہم نے ہر جان دار شے کو پانی (الماء) سے بنایا۔ کیا یہ لوگ اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے؟

زندگی کی جل پری نے اپنی آنکھ پانی کی گہرائیوں میں کھولی۔ سائنس کی تحقیق | **سرچشمہ حیات** | اسی نقطہ پر پہنچی ہے کہ حیات کے جراثیمہ اولیں (PROTOPLASM) کی ابتدا سمندر میں ہوئی۔ اسی لئے اس میں اسی نوعیت اور اسی تناسب کے املاح (SALTS) پائے جاتے ہیں جیسے سمندر کے پانی میں۔ یوں تخلیقِ انسانی کا قافلہ وادیِ خاک سے منزلِ آب کی طرف منتقل ہوا۔ "پانی اور مٹی کے خلاصہ" کے امتزاج سے اس جراثیمہ نے خلیہ (CELL) کی شکل اختیار کی جس کے بیوی کو قرآن کریم نے طینِ لازب (کچھڑ کی سی چمچی مٹی) سے تعبیر کیا ہے۔

لے خلیہ (CELL) مرکب ہوتا ہے مادہ خمیر (NUCLEUS) اور پیکر (CELL-BODY) سے۔

إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِنْ طِينٍ لَازِبٍ ۝ (۲۴/۱۱)

ہم نے انسانوں کو طینِ لازب (چسپي مٹی) سے تعمیر کیا ہے۔

طینِ لازب | یہ طینِ لازب وہی ہے جو تالابوں کی تہ میں اور جو بڑوں کے کنارے دکھائی دیتی ہے۔ جب پانی سوکھ جاتا ہے تو یہ سیاہ رنگ کی (کالی بھجنگ) مٹی بڑی سخت ہو جاتی ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَإٍ مَسْنُونٍ ۝

(۵۵/۱۴ ذ ۱۵/۲۶)

اور بلاشبہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو خمیر لٹھے ہوئے گارے سے بنایا جو سوکھ کر بجھنے لگتا ہے۔

پانی اور مٹی کی آمیزش سے جرثومہ حیات نے پیکر کی شکل اختیار کی۔ ان خلیات (CELLS) میں ایک لیڈا مادہ (NUCLEUS) زندگی کے تمام عظیم المرتبت امکانات اپنے اندر لئے ہوتا ہے جیسے ایک نسخہ اس بیج ایک تناور درخت کو اپنے اندر سمیٹے نمودِ شگفتگی کے لئے ہمہ تن اضطراب ہو۔ حیات کا یہ نقطہ آغاز وہ نفسِ واحدہ ہے جس سے شجرِ زندگی کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔ ایک خلیہ خاص حد تک پہنچ کر جوشِ نمود سے خود بخود دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے جنہیں (DAUGHTER-CELLS) کہا جاتا ہے۔ اس

شجرِ ارتقا | نفسِ واحدہ سے جاندار مخلوق کی شاخیں پھوٹیں اور ایک طویل القامت درخت کی طرح سطحِ ارض پر پھیل گئیں۔ ہر شاخ کو مخلوق کی ایک الگ نوع (SPECIES) سمجھے جو بڑھتی، پھولتی، پھلتی اپنی اپنی سمت میں نشو و ارتقا کے منازل طے کئے جا رہی ہے۔

ان تمام شاخوں میں سر بلند نوعِ انسانی کی شاخ ہے۔ جو اس نفسِ واحدہ کے ننھے سے بیج سے مختلف مراحل طے کرتی، درجہ بدرجہ، قدم بقدم، جادہ بجادہ، منزل بمنزل اس بلندی تک پہنچتی ہے۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ۚ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۝ ... وَاللَّهُ

أَنبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۚ (۱۳ - ۱۴/۷۱)

تہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ سے وقار کے آرزو مند نہیں ہوتے اور یقیناً اس نے تمہیں مختلف مراحل سے گزار کر پیدا کیا ہے..... اور تمہیں زمین سے اگایا پوری طرح جھاکر

پھیلا کر۔

درجہ بدرجہ طبقاً طبقاً یہاں تک پہنچا دیا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ (۸۴/۱۹)

تم یقیناً ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتے ہوئے شاہراہ زندگی پر آگے بھی
بڑھتے جاؤ گے اور بلند بھی ہوتے جاؤ گے۔

اس خوردبینی نفس واحدہ سے سلسلہ تخلیق آگے بڑھا۔ اس نشاۃ اولیٰ کے بعد وہ نفس واحدہ مختلف
منازل میں ٹھہرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ وہ اُس پیکر بشریت کے مقام تک آپہنچا جو حیات ارضی میں اس
کی جائے قرار ہے۔

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَمُسْتَوْدَعٌ ۝

قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُفْقَهُونَ ۝ (۶/۹۸)

وہی ہے جس نے تمہیں نفس واحدہ سے نشوونما دی۔ پھر تمہارے لئے مختلف منازل مقرر
کیں کہ تم ایک وقت معین کے لئے ایک منزل میں ٹھہرو اور وہ منزل پھر تمہیں اگلی منزل کے
سپرد کر دے۔ بلاشبہ ہم نے اپنے قوانین حیات کو سمجھ بوجھ کر رکھنے والوں کے لئے تفصیل
کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

اس انتقال مکانی، یعنی ایک مستقر سے دوسری منزل تک پہنچنے میں قرنہا قرن (اَلْفَ سَنَةٍ) گزرتے
اور یوں جراثیم حیات، LIFE CELLS کے ابتدائی مرحلہ کے بعد وہ مقام آگیا جہاں تخلیق کا سلسلہ
بذریعہ تناسل شروع ہوا۔

ثُمَّ جَعَلْنَا نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ۝ (۳۲/۸)

پھر اُس کی (انسان کی) نسل کو کمزور سے پانی کے خلاصہ سے بنایا۔

حیوانی زندگی کی ابتدا | یعنی ان تمام سابقہ طبقات سے گزار کر ہزار ہا سال کی تدبیر و تعمیر اور
ساخت و بافت کے بعد اس کا سلسلہ کمزور سے پانی کے پھوڑے سے

جاری رکھا۔ یعنی حیوانی زندگی کا سلسلہ افزائش نسل تولید کے ذریعے شروع ہوا۔ (اس سلسلہ میں یہ آیات
بھی دیکھئے) یعنی (۱۲-۱۳/۲۳)؛ (۳۶/۴۴)؛ (۱۶/۴)؛ (۳۲/۵)؛ (۴۰/۶۷)؛ (۷۷/۲۰)؛ (۵۱-۵۲/۸۶)؛

(۱۸/۳۷)

قافلہ حیات کی اس منزل میں جو مخلوق پیدا ہوئی اس میں رینگنے والے اور پاؤں کے بل چلنے والے حیوانات سب شامل ہیں۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِّن مَّاءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّن يَّمْشِي عَلَىٰ بَطْنِهِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّن يَّمْشِي عَلَىٰ رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّن يَّمْشِي عَلَىٰ أَرْبَعٍ ۚ (۲۴/۴۵)

اللہ نے ہر جاندار حیوان کو پانی سے پیدا کیا۔ ان میں سے وہ ہے جو اپنے پیٹ کے بل رینگتا ہے اور ان میں وہ بھی ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے۔ اور ان میں وہ بھی ہے جو چار پاؤں پر چلتا ہے۔

صرف رینگنے اور پاؤں کے بل چلنے والے ہی نہیں، بلکہ پرندے بھی۔ یعنی وہ تمام مخلوق جس کا سلسلہ افزائش بذریعہ ناسل آگے بڑھتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ زنگی کی اس بڑی شاخ سے بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں ادھر ادھر پھوٹیں۔ اس لئے اس حد تک یہ مختلف اقسام کی مخلوق، دراصل ایک ہی نوع کی مختلف شکلیں اور ایک ہی قافلہ کے مختلف افراد ہیں۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا ظَلِيرٍ يَّطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمُّ أَمْثَلِكُمْ ۚ مَا فَرَطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ۝ (۶/۳۸)

اور زمین میں چلنے والا کوئی حیوان اور ہوا میں اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں جو تمہاری ہی طرح کی نوع نہ ہو۔ یہ سب کچھ ہمارے قانون کے مطابق ہو رہا ہے جس کے دائرے سے کوئی چیز باہر نہیں رہ سکتی۔ یہ سب خدا کی طرف سے عطا شدہ راہ نمائی کے گرد جمع رہتے ہیں۔ کوئی اس سے باہر نہیں رہ سکتا۔

نروادہ کا امتیاز | یہ وہ مقام ہے جہاں ذکور و اناث (نر اور مادہ) کا امتیاز محسوس طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّن تُّرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ أَزْوَاجًا ۚ (۳۵/۱۱)

اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے۔ پھر تمہیں جوڑے بنا دیا۔

یعنی اس مقام پر خلیات حیات (LIFE-CELLS) میں جنسی تخلیق (SEXUAL REPRODUCTION) کا جوہر نمایاں ہو گیا۔ یہ جرثومے (GERM CELLS OR GAMETES) دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک (OVUM) یعنی مادہ کا خلیہ اور دوسرا (SPERMATOZOON) نر کا خلیہ۔ یعنی ایک جرثومہ زندگی و ذوق تخلیق سے نر اور مادہ کے خلیوں میں بٹ گیا۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا.....

(۴/۱۸۹)

وہی تمہارا پروردگار ہے جس نے تمہیں ایک نفس واحدہ (جرثومہ حیات) سے پیدا کیا اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنادیا۔

اس سلسلہ میں ان آیات کو بھی دیکھئے۔ (۲۰-۳۰/۲۱) (۴/۱۱) (۲۹/۶) (۲۲/۱۱) (۵۳/۴۵) (۶۵/۳۹)۔



بر چند اپنے موضوع کے اعتبار سے ہم اس مقام پر احاطہ بحث کو صرف حیوانی زندگی تک محدود رکھنا چاہتے ہیں لیکن بعض دیگر نکات کا (جو ابھر کر سامنے آجاتے ہیں) اجمالی ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے نر و مادہ کی تمیز کا ذکر صرف حیوانات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کے جوڑے بنائے ہیں۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (۵۳/۴۹) نیز (۲۲/۱۲)

اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بنا دیئے ہیں۔ (ہم نے ان امور کا تذکرہ اس لئے ضروری سمجھا ہے) تاکہ تم قانونِ خداوندی کی ہمہ گیری کو پیش نظر رکھ سکو۔

نباتات میں جوڑے حیوانات کے ذکور و اناث کے متعلق تو کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ تحقیق جدید نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ نباتات میں بھی نر اور مادہ کا جوڑا ہوتا ہے اور ان کا مسکن بالعموم پودے کا پھول ہوتا ہے۔ پھول کی نرم اور نازک پتیوں میں اوپر کی طرف ایک ایسا مادہ ہوتا ہے جس میں نر کا جوہر تولید (MALES TAMENS) حفاظت سے رکھا ہوتا ہے۔ پھول کے درمیانی حصہ میں ایک اور خانہ ہوتا ہے جسے (PISTIL) کہتے ہیں۔ اسے مادہ کا گوشہ رحم سمجھئے۔ بعض پودوں میں جنہیں (MONOECIOUS) کہتے ہیں۔ یہ دونوں جوہر ایک ہی پھول

ہیں نہیں ہوتے بلکہ ایک پھول میں صرف نر کا مادہ تولید ہوتا ہے اسے (STAMINATE) کہتے ہیں اور دوسرے پھول میں مادہ کا جو ہر جسے (PISTILLATE) کہتے ہیں بعض پودے ایسے ہوتے ہیں جن میں ایک پودا نر اور دوسرا پودا مادہ ہوتا ہے اس نوع کا نام (DIOECIOUS) ہے۔ سطح میں نگاہوں کے نزدیک یہ تحقیق بھی دورِ حاضرہ کی رہنِ منت ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ نہ صرف نباتات میں نر و مادہ کے امتیاز کا علم بلکہ اصولی طور پر خود نظریۂ ارتقاء مغربی محققین سے بہت پہلے مسلمان حکماء دریافت کر چکے تھے۔ اس باب میں حکیم ابن مسکویہ (المتوفی ۴۲۱ھ) کی

مسلمان حکماء اور نظریۂ ارتقاء

معمرہ آراء تحقیق دنیائے علم میں ایک خاص امتیازی شان رکھتی ہے۔ اس نے اپنے مشہور رسالہ "الفوز الاصح" میں اس نظریہ پر خصوصیت سے بحث کی ہے۔ نباتات کے تدریجی ارتقائی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے یہ حکیم لکھتا ہے:

اب یہی تدریجی ترقی کر کے خرما کے درخت میں بغایت شرف ظہور کرتا ہے اور نباتات کو مرتبہ اعلیٰ پر پہنچاتا ہے۔ کہ اگر اس مرتبہ سے ذرا سا بھی آگے بڑھے تو حدِ نباتی سے نکل جائے اور صورت حیوانی اختیار کر لے۔ خرما کے درخت میں نفس کا اثر اس درجہ قوی اور زیادہ ہوتا ہے کہ حیوان سے کثیر مشابہت اور قوی نسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک تو مثل حیوان کے اس میں نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ اور بار آور ہونے کے نر کو مادہ سے ملانا ضروری ہوتا ہے۔ اس ملائے کو تلقیح کہتے ہیں جو حیوانات کے جماع کے مثل ہے۔ پھر خرما کے درخت میں علاوہ جڑ اور رگوں کے ایک چیز مثل دماغ حیوانات کے ہوتی ہے۔ یہ اس کے لئے ایسی ضروری ہے کہ اگر اس کو کوئی آفت لاحق ہو جائے تو درختِ خرما ضائع ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ مسلمان حکماء کے زمانہ میں دورِ حاضرہ کے ریسرچ کے ذرائع موجود نہ تھے۔ لیکن ان کے پاس قرآنِ کریم کی ایک ایسی درخشندہ قندیل تھی جس کی روشنی میں حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتے تھے۔

ہر شے کے جوڑوں کے متعلق قرآنِ کریم کے اشارات کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ خود نباتات کے متعلق ارشاد ہے۔

سُبْحَنَ الَّذِي خَلَقَ الْوَرْدَ وَاجَعَهَا مِمَّا تُثْبِتُ الْأَرْضُ وَ مِنْ

أَنفُسِهِمْ وَمَتَّأ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۳۶/۳۶)

وہ ذات تمام نقائص و عیوب سے پاک ہے جس نے زمین سے اُگنے والے پودوں میں سے ہر ایک کے جوڑے بنادیئے اور خود ذریعہ انسانی میں سے بھی اور (ان چیزوں سے بھی) جنہیں وہ (ہنوز) نہیں جانتے۔

زوج کے معنی واضح رہے کہ بنیادی طور پر زوج کے معنی جوڑا ہی نہیں ہوتے۔ اس سے مراد ایسا جوڑا ہوتا ہے جس میں ایک فرد کی تکمیل دوسرے فرد کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ مثلاً گاڑی کے دو پہیئے ایک دوسرے کے زوج کہلاتے ہیں۔ ان میں سے اگر ایک نہ ہو تو دوسرا بیکار ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ دونوں موجود ہوں اور ایک جیسے ہوں تو ان کا مقصد تخلیق پورا ہو سکتا ہے۔ زوج کے اس تصور کو سامنے رکھنے سے بہت سے گوشے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔



اس ضمناً تذکرہ کے بعد ہم پھر اپنے اصلی موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس نفسِ واحدہ نے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، پیکرِ حیوانی میں بھی قرنہا قرن گزارے۔ ان ادوار میں ”انسان“ ابھی قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا (۹۶/۱)

کیا انسان پر وہ زمانہ نہیں گزر چکا جب یہ قابلِ ذکر شے نہ تھا۔

حیوانی زندگی کی ان تمام شاخوں میں سے ایک شاخ اوپر کو ابھری۔ یہ پیکرِ انسانی کی شاخ تھی۔ یعنی پیکرِ حیوانی کو بتدریج سنوارا گیا۔ اسے حشو و زوائد سے پاک کر کے اس کے لطیف و نازک جوہروں میں جلادی گئی اور پوں عروسِ حیات، حریمِ بشریت میں جلوہ ریز ہوئی۔

الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ (۸۲/۷)

وہ ذات جس نے تجھے پیدا کیا۔ پھر (ہر طرح سے) درست کیا

پھر (اعضاء و جوارح میں) تناسب پیدا کیا۔

پھر اسے احسنِ تقویم عطا فرمائی۔ یعنی بہترین توازن و تناسب کو لئے ہوئے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۹۵/۴)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا جس میں توازن و تناسب حسین ترین مقام تک پہنچ گیا۔

دوسرے مقام پر ”احسن صور“ کہا گیا ہے (۲۱-۲۲/۳)۔

یہ احسن تقویم کیا ہے؟ اس بہترین ہیئت میں کون سی امتیازی خصوصیت ہے؟ وہ کون سا جوہر خصوصی ہے جس کی بنا پر انسان سلسلہ ارتقاء کی سابقہ کڑیوں سے الگ حیثیت کا مالک بن گیا، قرآن کریم نے اسے ایک لفظ میں بیان فرمایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہی لفظ اس کی امتیازی خصوصیات کو ایک نمایاں جانت سے ادا کر سکتا ہے۔ فرمایا: شَعْرَ سَوْبَهُ وَ نَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ (۳۲/۴)۔ (پھر اسے درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی) یعنی شجر ارتقاء کی اس شاخ بلند و بالا کو ہر طرح سے درست کیا۔ اس میں مناسب صلاحیت و استعداد پیدا کی، اسے سنوارا۔ آگے بڑھایا اور جب اس میں یہ صلاحیتیں پیدا ہو گئیں تو اسے درجہ حیوانیت سے آگے بڑھا کر اس میں خدائی توانائی (DIVINE ENERGY) کا شمع ڈالا۔ اب وہ دیکھنے، سننے اور سمجھنے سوچنے والا انسان بن گیا۔ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۖ قَلِيلًا مِمَّا تَشْكُرُونَ ۝ (۳۲/۹) اور اس نے تمہارے لئے سمع، بصر اور فواد بنایا۔ (یعنی عقل اور جذبات دونوں عطا کر دیئے) لیکن تھوڑے ہیں جو ان صلاحیتوں کی بھرپور نشوونما کرتے ہیں۔ یہ ”روح خداوندی“ کیا ہے جس کی کرشمہ سازیوں نے ایک

شرف انسانیت پیکر آب و گل کو کائنات کا جان مدعا بنا دیا؟ اس کی تفصیل تو اپنے مقام پر آئے گی، اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ اس ”نفخ روح“ سے حاصل کیا ہوا؟ قرآن کریم کے الفاظ میں اس سے سمع و بصر و فواد عطا ہوا۔ کہنے کو تو یہ تین لفظ ہیں لیکن غور سے دیکھئے تو شرف و مجد انسانیت کی پوری کی پوری دنیا ان تین گوشوں میں سمٹ آتی ہے۔ سمع و بصر انسانی حواس کے نمائندے ہیں جو خارجی دنیا کی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ معلومات انسانی قلب (MIND) تک پہنچتی ہیں اور اس سے انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے لئے کچھ فیصلہ کرے۔ اس کے اس طرح فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو اس کا اختیار ارادہ کہتے ہیں۔ اسی سے انسان ایک ذمہ دار مخلوق بن گیا ہے۔ سورہ الذھر میں ہے:

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ ۖ نَبْتَلِيهِ ۖ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۚ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ ۖ إِمَّا شَاكِرًا ۖ وَإِمَّا

کَفُورًا ۵ (۲-۳/۷۶)

یقیناً ہم نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا جس میں مختلف امکانی صلاحیتیں باہم گرا مخلوط ہوتی ہیں۔ (پھر اسے) ہم مختلف حالتوں میں گردش دیتے رہے۔ (حتیٰ کہ) اسے سننے اور دیکھنے والا بنادیا۔ اسے (پھر) ہدایت کا راستہ دکھا دیا۔ اور اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا کہ یہ چاہے تو اسے قبول کر لے اور چاہے تو اس سے انکار کر دے۔

اختیار و ارادہ کا جوہر یہ ہے وہ سب سے بڑا امتیاز جو انسان کو حیوانی زندگی سے الگ کرنا ہے۔ یعنی انسان کا صاحب اختیار و ارادہ ہونا۔ اس مقام پر پہنچ کر سلسلہ ارتقاء کی یہ کڑی اپنی سابقہ کڑیوں سے یکسر الگ ہو جاتی ہے۔ انسانی پیکر اپنے سلسلہ کے گزشتہ طبقات کی استعداد اور صلاحیتوں کا حاصل جمع (SUM-TOTAL) نہیں بلکہ یہاں پہنچ کر ان تمام صلاحیتوں اور جوہروں میں ایک ہی قسم کی تبدیلی پیدا ہوئی جو ارتقاء کے اس سلسلہ سے بالکل مختلف تھی جو اس وقت تک چلا آ رہا تھا۔ (اب تو خود مغرب کے سائنسدان بھی اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ یہ تبدیلی ارتقاء کے میکانیکی اثر کا نتیجہ نہیں۔ تفصیل دہی کے عنوان میں ملے گی) اس تبدیلی کا نتیجہ انسانی اختیار و ارادہ ہے جس سے نبض کائنات میں متوجہ اور زندگی کی جوئے رواں میں تلاطم برپا ہے۔ اختیار و ارادہ کے بغیر یہ دنیا پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں کا بے رنگ مجموعہ اور درندوں، پرندوں کا بے کیف مسکن (ZOO) رہتی جس کی ضیائے تابندہ اور عشق کی آتش سوزندہ اس کے نصیب میں نہ ہوتی۔ یہ سب ”نفع رُوح“ کی سحر کاریاں ہیں جن سے یہ دیرانہ رنگ و تعطر کا کاشانہ بن گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں صفات خداوندی محدود (FINITE) شکل میں بطور ممکنات (POTENTIALITIES) ودیعت کر دی گئیں۔ یہ خصوصیت اس سے پہلے کسی مخلوق کے حصے میں نہیں آئی تھی یہی وہ ”نفع رُوح“ تھی جس سے یہ آدم خاکی مسجود ملائکہ قرار پایا۔

لہٰذا اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم میں کہیں رُوح انسانی کا ذکر نہیں۔ اس میں رُوح خداوندی کا ذکر ہے۔ ”روح“ کے معنی توانائی کے ہوتے ہیں۔ یہی وہ الوہیاتی توانائی ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے اور جو انسانی اختیار و ارادہ کی حامل ہے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهُۥ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدٰیْنَ ۝

(۴۱ - ۳۸/۷۲)

جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں۔ پس جب آئے (مختلف مراحل ارتقاء کے بعد) سنواروں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔



یہ ہے قرآن کریم کی رو سے جواب اس سوال کا کہ ”سب سے پہلا انسان“ کس طرح وجود میں آگیا؟ کہیے کہ ”علم و عقل“ دانش و بینش، سائنس اور علوم و فنون متعلقہ“ اس سے کچھ زیادہ یا الگ بھی پیش کر سکتے ہیں۔ اور یہ تبیان حقیقت ہو اس زمانہ میں، اُس زمانے میں جب دنیا، ہنوز سائنس اور اس کے لزومات ماحریت سے آشنا تک نہ تھی۔ آگے بڑھنے سے پیشتر ایک مرتبہ پھر ننگہ باز گشت ڈالنے اس آیت مقدسہ پر جس سے اس موضوع کی ابتدا ہوئی ہے۔ ننگہ ڈالنے اور غور کیجئے کہ یہ پوری کی پوری داستانِ طولِ طویل کس حُسن و اعجازِ نگاری سے چند جملوں میں سمیٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ ارشاد ہے۔

یَذَرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ إِلَیْهِ فِی یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعْلَمُونَ ۝ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝ (۵۱ ذہ ۸۹/۳۲)

تدبیرِ الٰہیہ (خدا کی اسکیموں) کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی مضمحل شکل میں علمِ الٰہی کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ جب ان میں سے کسی اسکیم کو بروئے کار لانا مقصود ہوتا ہے تو زمین (مادہ) کی پستیوں سے اس کا نقطہ آغاز ہوتا ہے۔ یہاں سے وہ اسکیم اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی

(گذشتہ صفحے کا فٹ نوٹ) اسے بھی سمجھ لیجئے کہ خدا نے اپنی ذات کا کوئی حصہ انسان میں داخل نہیں کیا۔ اس لئے یہ تصور کہ انسان روح کا منتہی یہ ہے کہ یہ آخر الامر خدا کی ذات میں جا کر مل جائے، یکسر غیر قرآنی ہے۔ یہ ہندوؤں کے ہاں سے ویدانت کی شکل میں ابھر اور ہمارے ہاں تصوف کے روپ میں جلوہ پیرا ہوا۔

اپنے مقام تکمیل کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہے۔ یہ مراحل بڑے بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں جن میں کا ایک ایک وقفہ ہمارے حساب و شمار کے مطابق ایک ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔..... مثلاً اس کی اسکیم یہ ہے کہ ہر شے کو مختلف تخلیقی ترکیب سے گزار کر بہترین تناسب و توازن کا حامل بنا دیا جائے۔ (اس اسکیم کی ایک شق خود انسان کی تخلیق ہے)۔ اس تخلیق کی نمود مٹی (طبقہ جمادات) سے ہوئی۔ (پھر یہ مختلف مراحل میں سے گزرتا ہوا اس منزل میں پہنچا جہاں) اس کی تولید کا سلسلہ نطفہ کے ذریعے قرار پایا۔ پھر اس میں ہر طرح کا اعتدال پیدا کیا، اس کے بعد اس میں خدا کی توانائی کا ایک ششم ڈال دیا گیا۔ اور اسے علم و عقل اور احساسات و جذبات عطا کر دیئے لیکن بہت تھوڑے لوگ ہیں جو ان صلاحیتوں کی کامل نشوونما کرتے ہیں اور انہیں صحیح مقام پر صرف کرتے ہیں۔

اس سلسلہ ارتقاء سے، فروع انسانی (نہ کہ کوئی خاص فرد) وجود پذیر ہوئی۔



لیکن اس مقام پر ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو سامنے لے آئے جس کا ذکر ابتدا میں کیا جا چکا ہے۔ یعنی قرآن کریم، تاریخ و جغرافیہ، طبیعیات و کیمیات، حیاتیات و طبقات الارض کی کتاب نہیں۔ وہ ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جس کے مطابق عمل پیرا ہونے سے انسانیت نشو و ارتقاء کے مراحل طے کر کے اس منزل تک پہنچ جائے جو اس سفر زندگی کا مقصود ہے۔ اس میں اگر متذکرہ صدر علوم و فنون کے متعلق اشارات پائے جاتے ہیں تو ان سے مفہوم اس منزل کی طرف راہ نمائی اور اس نصب العین کی طرف نگاہوں کا مرکوز کرنا ہے۔ مثلاً اسی نظریہ ارتقاء کو لیجئے۔ اس سلسلہ دراز کی اولین کڑی طین (طبقہ جمادات) سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک ایک مادہ پرست سائنسدان بھی متفق ہے۔ اس کی تحقیق اسے از خود اس مقام تک لے گئی ہے۔ لیکن قرآن کریم، نکتہ تجسس کو اس سے پیچھے جانے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس مادہ کو (جسے سلسلہ ارتقاء کی محسوس طور پر ابتدائی کڑی کہا جاتا ہے) کہیں ازلی اور ابدی نہ سمجھ لینا۔ ایک وقت وہ تھا کہ یہ مادہ بھی کوئی شے نہ تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، انسانی تخلیق کے متعلق کہا کہ اس پر ایک

زمانہ ایسا بھی گزر چکا ہے۔ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مِّنْ كُورًا ۝ (۷۶/۱) یہ قابل ذکر شے ہی نہیں تھا۔ وَ لَمْ تَكُنْ شَيْئًا (۱۹/۹) تم کوئی شے نہیں تھے۔

یہ تو تھی ابتدا۔ اب انتہا کی طرف چلتے۔ مغرب کے محققین نے جب یہ دریافت کر لیا کہ خاک کا ذرہ کس طرح اپنی ارتقائی منازل طے کر کے درجہ انسانی تک پہنچا ہے، تو انہوں نے کتاب کائنات کے اس باب (CHAPTER) کو ختم کر دیا اور سمجھ لیا کہ انسان کی موجودہ منزل، ارتقاء کے سلسلہ دراز کی آخری کڑی ہے، اس کے بعد کچھ نہیں۔ لیکن قرآن کریم نے اس سلسلہ دراز کی مختلف کڑیوں کی طرف توجہ منعطف کرانے کے بعد نیکو جستجو کو فوراً اس طرف پھیر دیا کہ انسان کی موجودہ زندگی اس سلسلہ کی آخری کڑی نہیں بلکہ اسے ابھی قانون ارتقاء کے مطابق آگے بڑھ کر کسی اور منزل تک پہنچنا ہے۔ اس موجودہ منزل سے اگلی منزل کا نام حیاتِ اُخروی ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ انسانی زندگی دو درجات پر مشتمل ہے۔ ایک درجہ حیوانی زندگی کا ہے جو اسے نچلے درجے سے ارتقائی طور پر ملا ہے۔ یہ اس کی طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے جو انہی قوانین کے تابع ہے جن قوانین کے تابع دوسرے حیوانوں کی زندگی ہے۔ یعنی کھانے پینے سے زندہ رہنا اور پھر ایک مدت کے بعد مر جانا۔ لیکن یہ موت انسان کے طبعی جسم کی موت ہے۔ یہ اس زندگی کا خاتمہ ہے جسے ہم نے درجہ حیوانی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی زندگی کا دوسرا درجہ انسانی درجہ ہے جس کی بنیاد ”لفح روح“ (صفاتِ خداوندی) پر ہے۔ یہ انسانی ذات یا اس کی خودی ہے جو طبعی موت کے بعد بھی باقی رہ سکتی ہے۔ یہ درجہ انسانیت کا ہے۔ اس درجہ میں زندگی کی نشوونما اور فلاح و بقاء کے لئے طبعی قوانین کام نہیں دیتے۔ یہاں پر ایک اور ضابطہ قوانین کا فرما ہوتا ہے اس کی تفصیل دوسرے مقام پر ملے گی۔ یہی وہ زندگی ہے جو حیاتِ اُخروی کے میدان میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ قرآن کریم نظریہ ارتقاء کو بیان ہی اس انداز سے کرتا ہے کہ حیاتِ اُخروی یا نشاۃ ثانیہ ایک منطقی نتیجہ (LOGICAL INFERENCE) کی حیثیت سے خود بخود سامنے آجائے۔ وہ سلسلہ تخلیق میں سب سے پہلے اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ کائنات کی کوئی شے بلا مقصد پیدا نہیں کی گئی بلکہ جب کائنات کی دیگر اشیاء کے متعلق یہ تصریح فرمادی کہ وہ

(گزشتہ صفحے کا فٹ نوٹ) اس کی مختصر تفصیل عنوان زیرِ نظر کے آخر میں دیکھئے۔
لے فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے۔

بلا مقصد پیدا نہیں کی گئی، تو کیا انسان جو اس بزم کائنات کا صدر اور نظم عالم کا ٹیپ کا بند ہے، بلا مقصد پیدا کر دیا گیا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ بیج سے لے کر کوئیل تک درخت کا ایک ایک ریشہ کسی نہ کسی مقصد کو لئے ہو۔ لیکن اس کا پھل بلا غرض و غایت پیدا کر دیا گیا ہو؟ یہ ناممکن ہے۔ اسی لئے فرمایا:

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ۝ (۲۳/۱۱۵)

کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بلا مقصد پیدا کر دیا ہے اور تمہاری زندگی کی گردشوں کا رُخ ہماری طرف نہیں! (تمہارا ہر قدم ہمارے قانون مکافات کی طرف نہیں اٹھ رہا؟)

مہدار سے معاد پر استدلال

دوسرے مقام پر اس کی تصریح ان الفاظ میں فرمائی۔

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى ۚ أَلَمْ يَكُنْ نُطْفَةً مِنْ مَنِيٍّ يُُمْنَى ۚ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّى ۚ فَجَعَلَ مِنْهُ الرُّوحَ جِئِنِ الدَّكَرَ وَالْأُنْثَى ۚ أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقْدِيرٍ عَلَى أَنْ يُنْحِيَهُ الْمَوْتُ ۚ (۳۶-۴۵/۴۰)

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ اسے بغیر کسی مقصد اور نصب العین کے یونہی چھوڑ دیا گیا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ یہ پانی کے کمزور سے قطرہ میں زندگی کا چھوٹا سا جڑوڑ تھا۔ پھر اس نے علقہ کی سی شکل اختیار کی۔ (پھر اللہ نے) اس کی دوسری صورت میں تخلیق کی۔ پھر اسے درست کیا، اُس

(گڈ شے صفحہ ۱۸۸، نوٹ) یہ مسئلہ کہ یہ کائنات بلا مقصد نہیں پیدا کی گئی، ایک عظیم الشان حقیقت کو اپنی آغوش میں لئے ہے۔ لیکن اس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں جس مقام پر یہ تفصیل آئے گی وہاں بنایا جائے گا کہ خود یورپ کے مادہ پرست سائنسدان کس طرح بالآخر اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں جس کی طرف قرآن کریم نے اتنا عرصہ پہلے توجہ دلائی تھی:

لہ سُدًى کے لفظی معنی ہیں تانا باسی تانا جس میں بانا نہ ہو۔ اس سے قرآن نے ایک ایسی عظیم القدر حقیقت بیان کی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ مختصر یہ سمجھئے کہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ مقصود حیات 'روح اور مادہ' دنیا اور آخرت "ارض اور سماء" کے امتزاج (تالنے بانے) سے حاصل ہوگا۔ تنہا تالنے یا تنہا بانے سے نہیں۔

کے بعد اس نے نرا ورادہ کا جوڑا بنایا۔ کیا (یہ سب کچھ کر سکنے والا خدا) اس پر قادر نہیں کہ وہ مردوں کو زندگی عطا کر دے۔

قرآن کریم نے مقصد تخلیق انسانی کی تکمیل کے لئے اس زندگی سے اگلی زندگی کو ضروری قرار دیا ہے اور یہی ہے وہ مقصد جس کی طرف قرآن کریم سلسلہ ارتقاء کے تدریجی مراحل کا ذکر کرنے کے بعد ذہن انسانی کو منتقل کرنا چاہتا ہے۔ فرمایا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ طِينٍ ۚ ثُمَّ إِذَا تُكْفَرُ
يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۝ (۱۲-۱۶/۲۳)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ (یعنی زندگی کی ابتدا یہاں سے ہوئی) پھر ہم نے اسے نطفہ بنایا ایک ٹھہر جانے اور جماؤ پانے کی جگہ میں۔ پھر نطفہ کو ہم نے علقہ بنایا پھر علقہ کو ایک گوشت کا ٹکڑا کر دیا۔ پھر اس مضغہ کو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنایا۔ پھر ڈھانچہ پر گوشت کی تہہ چڑھا دی پھر (دیکھو) اسے کس طرح ایک دوسری ہی طرح کی مخلوق بنا کر نمودار کر دیا۔ دیکھو! خدا کے پاس سامانِ نشوونما کی کس قدر فراوانیاں ہیں جس سے وہ اس قسم کے تخلیقی مدارج طے کرے کہ انسان کو بہترین تناسب و توازن کا پیکر بنا دیتا ہے۔ اس قسم کا حسن تناسب کوئی اور عطا نہیں کر سکتا۔

ان مراحل کے بعد تم سب کو مرنا ہے پھر (مرنے کے بعد) ایسا ہونا ہے کہ قیامت کے

دن اٹھائے جاؤ۔

سطح ہیں نگاہوں کو انسان کی نشاۃ ثانیہ کے خلاف یہ اعتراض نظر آتا ہے کہ جب ان عناصر ترکیبی کا شیرازہ بکھر جائے گا تو اس کے بعد ایک ترکیب جدید کیسے ہوگی؟ اور سطح میں نگاہوں پر ہی کیا موقوف ہے۔ آج یورپ کے اکثر حکماء جنہیں دنیا علم و بصیرت کی انتہائی بلندیوں پر خیال کرتی ہے اسی سطح بینی میں گرفتار ہیں۔ اس لئے کہ جس طرح وہ پہلے راستوں میں محض اپنے ذہن کی قیاس آرائیوں کی مدد سے چلتے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے تھے اس منزل سے آگے بھی اپنے تصورات ہی کی روشنی میں بڑھنا چاہتے ہیں اور ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ دنیا دیکھے گی کہ جس طرح ایک مدت کی صحرا نوردیوں کے بعد یہ لوگ تخلیق انسانی کے متعلق حقیقت کے ایک گوشہ تک جا پہنچے ہیں۔ بالآخر انہیں نشاۃ ثانیہ کے متعلق بھی وہیں آنا پڑے گا جہاں

کی دعوت قرآن دیتا ہے۔ اس لئے کہ قرآن کی دعوت ظن و تخمین کی آواز نہیں۔ علم و بصیرت اور حتم و یقین کی دعوت ہے۔ اس کا اعلان ہے کہ

مَا خَلَقُكُمْ وَلَا بَعَثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۖ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ
بَصِيرٌ ۝ (۳۱/۲۸)

تمہاری (موجودہ) پیدائش اور دوبارہ زندگی (نشاۃ ثانیہ) ایک نفس واحدہ کی مثل ہے۔
بے شک اللہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

جس دست قدرت میں یہ طاقت ہے کہ وہ زندگی کے جراثیمہ اذلیں سے موجودہ ہیئت کا انسان بنا دے اس کے لئے اس کے عناصر طبیعی کے انتشار کے بعد ترتیب جدید میں کیا مشکل ہو سکتی ہے؟

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰی ۝
(۲۰/۵۵)

اُس نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا۔ اسی میں تمہیں مختلف مراحل میں گردشیں دیں اور
پھر اسی سے دوسری مرتبہ اٹھائے جاوے گے۔

لے خود سائنس معترف ہے کہ ابدی حقائق کی لم اور کثہ ابھی تک بے نقاب نہیں ہو سکی۔ الفرید کوہن اپنی کتاب
(THE CRISIS OF CIVILISATION) میں لکھتا ہے:-

اس امر کا خیال تک بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ہم قطعی حقیقت کا علم حاصل کر چکے ہیں۔ حتیٰ کہ
سائنس کے محدود دائرہ میں بھی نہیں جب تک اس تمام محسوس دنیا کا علم حاصل نہ ہو جائے۔ (۱۶)
اس کی تصریحات کے لئے وحی کا عنوان دیکھئے۔

لے قرآن کریم حیات (LIFE) کو ایک ناقابل تقسیم وحدت (INDIVISIBLE UNIT) قرار دیتا ہے۔ اور
افراد کو اس وحدت کے مظاہر جس طرح (محض سمجھنے کی خاطر یوں سمجھئے کہ) بجلی کی قوت (یا اس کی لہر) ایک ناقابل
تقسیم وحدت ہے اور قہقہے، پنکھے، آلات مکبر الصوت وغیرہ اس قوت کے مظاہر وحدت حیات (اور اس کی
بنا پر فرو اور جماعت کا باہمی ربط) اسلام کا ماہر الانیاز فلسفہ ہے اور اسی پر اس کا تمام نظام قائم ہے۔ اس کی تفصیل
بھی وحی کے عنوان میں ملے گی۔

دوسرے مقام پر ہے۔

وَ قَالُوا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَ رُفَاتًا ؕ اِنَّا لَمَبْعُوثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا
..... قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ (۴۹-۵۱/۱۷)

اور یہ کہتے ہیں کہ جب ہم (مرنے کے بعد) محض چند ہڈیوں کی شکل میں رہ جائیں گے، تو پھر کیا ایسا ہو سکے گا کہ از سر نو اٹھا کھڑے کئے جائیں۔ تم کہہ دو کہ ہاں تم (مرنے کے بعد) کچھ ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔ پتھر ہو جاؤ۔ لوہا ہو جاؤ یا کوئی چیز جو تمہارے خیال میں (دوبارہ زندہ ہونے کے لئے) بہت ہی سخت ہو۔ (لیکن تم دوبارہ زندہ ہو کر رہو گے)۔

اس پر یہ کہیں گے کہ وہ کون ہے جو اس طرح ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا؟

تم کہہ دو وہی جس نے پہلی مرتبہ تمہیں پیدا کیا۔

اس کے ساتھ سورہ حج کی اس آیت (۲۲/۵) کو بھی دیکھئے۔ اور حقیقت اور بھی اُبھر کر سامنے آجائے گی۔ اس

موت اور حیات

مقام پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم صرف اس زندگی کے بعد کی دوسری زندگی ہی سے بحث نہیں کرتا۔ بلکہ وہ اس زندگی کی ”موت اور حیات“ کے متعلق بھی ہدایات دیتا ہے۔ وہ قوموں کے عروج کو ان کی زندگی اور ان کے زوال و مہبوط کو ان کی موت سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ بار بار بتاتا ہے کہ وہ کون سے اصول ہیں جن کے مطابق قوموں کو زندگی عطا ہوتی ہے۔ اور کون سی روش ہے جسے اختیار کرنے سے ان پر موت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ اقوام سابقہ کے عروج و زوال کی داستانیں پیش کرتا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ ایک تاریخ کی کتاب ہے بلکہ ان کے اعمال کے انجام و عواقب سے قانونِ فناء و بقاء پر شہادت لائے۔ اس کے لئے اُس نے کھلے کھلے الفاظ میں ایک اصول بیان کر دیا کہ:-

تَبٰرَكَ الَّذِي يَمِيْدُ الْمُلْكُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ
الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا
وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ (۱-۲/۶۷)

زیست کی تمام فراوانیاں قانونِ خداوندی سے وابستہ ہیں جو تمام اختیارات و اقتدارت کا مالک ہے۔ لیکن اس نے تمام امور کے لئے پیمانے اور اندازے مقرر کر رکھے ہیں جن کے

مطابق اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اسی قانون کے مطابق قوموں کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یہ گردشیں اس لئے دی جاتی ہیں تاکہ زندگی اور عروج اس کے حق میں رہے جو سب سے زیادہ توازن بدوش زندگی بسر کرے۔ اس کا قانون سب پر غالب رہنے والا اور تباہیوں سے بچنے کا سامان فراہم کرنے والا ہے۔

یعنی موت و حیات کا قانون اسی لئے متعین کیا گیا ہے کہ یہ نمایاں طور پر سامنے آجائے کہ تم میں سے کون ایسے کام کرتا ہے جو اس قانون کے مطابق زندگی بخش ہیں۔ اور کون ایسا ہے جو اپنے اوپر ہلاکت وارد کر لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ واضح اور غیر مبہم قانون اسی لئے بیان کیا گیا ہے تاکہ

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۗ
إِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (۸/۴۲)

جسے ہلاک ہونا ہے واضح قوانین (کے ماتحت) ہلاک ہو۔ اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی واضح قوانین (کی رُو سے) زندہ رہے۔ اور اللہ بے شک (سب کچھ) سننے والا اور ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔

اعمال صالحہ سے مراد | وہ قانون ارتقاء کے اس بنیادی اصول کو مختلف گوشوں اور متنوع پہلوؤں سے دل نشین کراتا ہے کہ اس کا رگہ سعی و عمل میں وہی نوع باقی رہ سکتی ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہو (جس کے اعمال صالح ہوں) وہی آگے بڑھ سکتی ہے جو اپنے اندر آگے بڑھنے کی استعداد پیدا کرے۔ وہ دیگر انواع کی مثال دے کر اس سے خود انسانی زندگی پر استشہاد کرتا ہے کہ ارتقاء کے اس عظیم نشان درخت کو دیکھو اور غور کرو کہ کتنی شاخیں تھیں جو سوکھ سوکھ کر گر گئیں۔ کتنے پھول تھے جو مڑھماڑھما کر زمین پر آئے اور راستہ چلنے والوں کے پاؤں تلے آکر مسلے گئے۔ اس کے برعکس اتنی شاخیں ہیں جو سرسبز و شاداب ہوئیں۔ کیسے کیسے شکفتہ اور نورستہ پھول لائیں۔ اور کیسے کیسے نفیس و لطیف پھول پیدا کئے۔ وہ کہتا ہے کہ فطرت کے اس قانون پر غور کرو اور یہ سوچو کہ اقوام و ملل گزشتہ کا کیا حشر ہوا؟ اس کا ارشاد ہے کہ مختلف انواع کی طرح قوموں کی موت و حیات کا بھی یہی قانون ہے۔ جو قوم زندگی کی اہل نہیں رہتی فنا ہو جاتی ہے۔ اسے کوئی رعایت نہیں دی جاتی۔ اس فیصلہ یعنی ان کے اعمال کے ظہور نتائج میں ذرہ بھر تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی ہے

(لے فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

و يَكُلْ أُمَّةً أَجَلٌ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً
وَّ لَا يَسْتَقْدِرُونَ ۝ (۴/۳۳)

اور ہر امت (گروہ، جماعت، نوع) کے لئے (ظہورِ نبیؐ) کا وقت معین ہے۔ جب وقت آجاتا ہے تو پھر ایک ساعت کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔

اس اصولی نکتہ کو بیان کر دینے کے بعد، اگلی آیت میں یہ بتا دیا کہ زندہ اور باقی رہنے کے لئے کیا قانون مقرر ہے۔
يَسْبِخُ آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي ۖ
فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۴/۳۵)

اے نوحِ انسان! جب ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تمہارے پاس آئیں اور میرے قوانین سے تمہیں مطلع کریں، تو (اس وقت) جو ان قوانین سے ہم آہنگ ہو کر میری حفاظت میں آجائے گا اور (یوں) اپنے اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لے گا، تو اس پر (مٹنے اور زوال پذیر ہو جانے کا) کوئی غم اور اندیشہ نہ ہوگا۔

یہ تو ہیں جو باقی رہیں گے اور آگے بڑھیں گے، جنہیں ہلاکت و بربادی کا اندیشہ نہ ہوگا، ان کے برعکس۔

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (۴/۳۶)

لیکن جو لوگ ان قوانین کو جھٹلائیں گے اور ان سے سرکشی برتیں گے تو ان کی کہیتیاں جہنم کر رہ جائیں گی اور وہ زندگی کی خوشگوار یوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائیں گے۔

قوموں کے عروج و زوال کے اصول | غور فرمائیے پہلی آیت میں قوموں کی موت و حیات کا ایک اصول بیان فرما دیا۔ اس کے بعد

اس کی وضاحت کر دی کہ ہلاکت سے مامون اور بربادی سے مصئون دلبے خوف رہنے کا کیا طریقہ ہے اور وہ کونسا نظام ہے جس پر چل کر انسان امن و سلامتی کی جنت میں پہنچ سکتا ہے۔ اس وقت اس نظام کی تشریح کا موقع نہیں، یہاں صرف اسناد بخشنے کہ قرآن کریم کی رو سے اس نظام کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس

لے ان امور کی تشریح دوسرے مقام پر ملے گی، جہاں قوموں کے عروج و زوال کی داستان پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے گی۔

ضابطہ کو نصب العین حیات بنایا جائے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کو ملا ہے۔ آئندہ ادراقی میں اسی پیغام حیات بخشش اور اسی نظام روح پرور کی بصیرت افزا داستان کو پیش کیا جائے گا۔ وہ جس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ انسان میں وہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی جس سے وہ فنا و برباد کر دینے والی قوتوں کا مردانہ وار مقابلہ کر سکے اور اسے کسی قسم کا خوف ہلاکت و حزن بربادی نہ رہے (لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۵) اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو

خدا کا قانون استخلاف و استبدال (THE LAW OF SUCCESSION AND SUBSTITUTION) اپنا اٹل فیصلہ کر دے گا اور اس قوم کی جگہ دوسری قوم آجائے گی۔

وَرَبَّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ إِنْ يَشَأْ يُدْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ
مَنْ بَعْدَكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ۝

(۶/۱۳۲) نیز (۳۵/۱۶)

اور دیکھو تیرا نشوونما دینے والا اپنی نشوونما کے لئے کسی کا محتاج نہیں بلکہ اس کے پاس تمام کائنات کی نشوونما کا سامان افرادِ موجد ہے۔ (لیکن یہ نشوونما اس کے قانون کے مطابق متی ہے) اگر تم اس کے قانون کے خلاف چلو گے تو تمہیں ہٹا دے گا اور تمہاری جگہ اس قوم کو لے آئے گا جس میں اس قانون کے مطابق جانشینی کی صلاحیت ہوگی۔ یہ اس قانون کے مطابق ہو گا جس کے مطابق اس نے تمہیں دوسری قوم کی ذریت اٹھا کر کیا تھا۔ دوسری جگہ ہے۔

وَإِنْ تَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا
أَمْثَلَكُمْ ۝ (۳۸/۳۷) نیز (۵۶/۹۱) و (۷۰/۲۱)

اور اگر تم نے (ان قوانین سے) سرکشی اختیار کی تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو لے آئے گا۔ اور وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ (بلکہ تم سے بہتر ہوگی۔ اسی لئے تو وہ تمہاری جگہ لے گی)۔

مغنی آتشِ نفس، موسیقار کی طرح ایک قوم کی راکھ کے ڈھیر سے دوسری قوم وجود کو شش ہوتی ہے۔ مٹنے والی قومیں مٹ جاتی ہیں اور باقی رہنے والی ان کی جگہ لے لیتی ہیں، ے

چوں جہاں کہنہ شود پاک بسوزند او را
وز ہماں آب و گل ایجاد جہاں نیز کنند

شرف انسانیت کے لئے قانون ارتقاء

جیسا کہ اوپر کہا چکا ہے، قانون ارتقاء کی اصل یہ ہے کہ وہی نوع باقی رہ

سکتی ہے اور آگے بڑھ سکتی ہے جس میں حفظِ نفس اور بقائے ذات کی صلاحیت و استعداد موجود ہو، اُن تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کر سکے جو اسے مٹانے پر آمادہ ہوں۔ جو ناسازگار ماحول، نامساعد فضا اور ہلاکت آفریں اسباب کی مدافعت کا سامان اپنے اندر رکھتی ہو۔ وہ اقوام و ملل جنہوں نے سامانِ مدافعت اور قوتِ محافظت کو کھو دیا، ہلاک ہو گئیں۔ جنہوں نے اس کو قائم رکھا، ہلاکت سے محفوظ رہیں۔ قانون ارتقاء کا اتم حصہ انسان کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) سے متعلق ہے اور اس اعتبار سے انسان اور اس سے پہلی کڑی (طبقہ حیوانات) میں کچھ فرق نہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، انسان دیگر حیوانات سے ایک قدم آگے ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جو اسے اُلٹی حیوانیت سے بلند کر کے درجہ انسانیت میں لے آتا ہے۔ وہ مقام جہاں قرآن کریم اسے (وَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُّوحِنَا) سے دیگر حیوانات سے ممتاز کر دیتا ہے۔ لہذا وہ قانون ارتقاء جو انسان سے پیشتر تمام انواع میں محض طبیعی زندگی سے متعلق تھا، درجہ انسانیت میں پہنچ کر طبیعی زندگی کے علاوہ نفسِ انسانی کو بھی اپنے حلقہ اثر و نفوذ میں لے آیا۔ یعنی جس طرح انسان کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی طبیعی زندگی کی حفاظت کے لئے مخالف قوتوں سے مدافعت کی صلاحیت پیدا کرے (جس طرح دوسرے حیوانات کرتے ہیں) اسی طرح اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے "نفس" کی حفاظت اور نشو و ارتقاء کے لئے تمام متصادم و متحارب قوتوں کے خلاف اپنے اندر سامانِ مدافعت پیدا کرے۔ نفسِ انسانی کی حفاظت اور نشو و ارتقاء سے تغافل برت کر محض حیوانی زندگی کے حفظ و بقا کو مقصود زندگی سمجھ لینا، کفر ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ
وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝ (۱۲/۴۷)

وہ لوگ جو (قوانینِ الہیہ سے) انکار کرتے ہیں (ان کی کیفیت یہ ہے کہ) وہ پیش پا افتادہ مفاد سے اس طرح متمتع ہوتے ہیں اور یوں (محض) کھانے پینے ہی کو مقصدِ زندگی سمجھ

لیتے ہیں جس طرح حیوانات (کا مقصد زندگی محض) کھانا پینا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کا

ٹھکانا جہنم ہوتا ہے۔

یعنی جو لوگ قوانین الہیہ کی جگہ انسانوں کے خود ساختہ نظام کے تابع زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا مقصد زندگی محض طبعی حیات کی پرورش اور حفظ و بقا ہوتا ہے اس سے آگے کچھ نہیں۔ جو قوم تحفظ "نفس" یعنی ارتقاء انسانیت سے یوں غفلت اختیار کر لے، وہ ہلاک و بربادی سے کیسے بچ سکتی ہے؟

اس سے اگلی آیت میں ہے:

وَكَايَتُنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِي أَخْرَجْتِكَ ۖ أَهْلُكُنْهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ۝ (۴۷/۱۳)

اور کتنی ایسی بستیاں تھیں جو قوت میں ان لوگوں سے بھی بڑھ کر تھیں جنہوں نے تجھے (اے رسولِ مکہ سے) باہر نکال دیا ہے ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ سوال کا کوئی مددگار نہ ہوا۔

یہ کیوں؟ اس لئے کہ:-

أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ يَتْنَةٍ مِّنْ رَبِّهِ كَمَن زُرِنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ۝ (۴۷/۱۴)

کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے آمدہ واضح قوانین پر قائم ہو، اس کی مانند ہو سکتا ہے جس کے غلط اعمال اس کی نگاہوں میں مرتب بنادینے جائیں، اور وہ لوگ اپنی خواہشات کے اتباع ہی کو (مقصد زندگی) قرار دے لیں۔

یعنی جس شخص نے اللہ کے ضابطہ حیات کے بجائے اپنے خیالات و نظریات کو شاہراہِ عمل بنا لیا وہ بھی ہلاکت سے نہیں بچ سکتا۔ اس لئے کہ وہ قانونِ ارتقاء جو انسانیت کے تحفظ اور عروج کے لئے ضابطہ ہے صرف خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت ہے۔ وہ خدا جو ذی المعارج ہے۔

مِنَ اللَّهِ ذِي الْمَعَارِجِ ۝ (۴۰/۳)

اس خدا کی طرف سے جو بندوں کی راہوں کا مالک ہے۔

اب تو خود یورپ کے مادہ پرست محققین بھی رفتہ رفتہ اقرار کر رہے ہیں کہ سلسلہ ارتقاء میں مادیات کے علاوہ "اخلاقیات" کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ارتقاء کا مقالہ نگار اپنے

مضمون کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے۔

حب وطن، مذہب، آرٹ، سائنس اور لٹریچر کا بھی (میزان) بقائیں بڑا وزن ہے اور یہ سلسلہ ارتقاء میں بڑا مفید کام کرتے ہیں۔ (اس سلسلہ میں) اخلاق کسی غیر متعلق خارجی قوت کی حیثیت نہیں رکھتا جو ایک مستبد اور بیگانہ اخلاق آفاقی نظام کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ بلکہ یہ خود ارتقاء کی تخلیق ہے اور سلسلہ ارتقاء کے تدریجی تغیرات کو صحیح سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک اہم قوت۔ ہمیں امید ملے یقین ہے کہ وہ تہاذیب جو عدل و حریت، آئین و انضباط اور مستحکم اخلاقیات پر مبنی ہیں آخر الامر سب سے زیادہ کامیاب اور دیرپا ثابت ہوں گی۔

اے کاشن! یورپ کے سامنے قرآن ہوتا تو وہ دیکھ لیتا کہ وہ کون سی تہذیب ہے جو عدل و حریت، نظم و ضبط اور مستحکم اخلاقیات پر مبنی ہے۔ اگر وہ قرآن کی رُو سے ان الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھ لیتا تو آج اس طرح برباد اور ہلاک نہ ہوتا کہ خود اس کی تباہی بھی قانون ارتقاء ہی کے ماتحت ہو رہی ہے۔



یہ تو حقی محض طبعی زندگی کو منتہائے نگاہ بنالینے والوں کی کیفیت۔ اس کے برعکس طبعی زندگی کے لوازم سے چشم پوشی کر کے محض "روحانیت" کی ترقی کے لئے بزعم خویش سعی و کاوش میں زاویہ نشینی اور سر بریری اختیار کر لینا بھی قانون ارتقاء کی رُو سے غلط اندیشی ہے، جس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ فوج کی حفاظت کے لئے قلعہ کی دیواروں کا آہنی ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہاں نفس انسانی کے تحفظ و بقا اور عروج و ارتقاء کے لئے تاکید کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی رہبانیت کی زندگی کو غلط قرار دے کر طبعی زندگی کے استحکام کے لئے مادی قوتوں کے حصول و استبقاء کو بھی ضروری قرار دیا ہے اور اس طرح صحیح قانون ارتقاء کے مطابق ایک ایسا مکمل ضابطہ حیات عطا فرمایا ہے جس میں انسان اپنی موجودہ منزل میں بھی اپنے آپ کو قائم رکھ سکے اور اس کے بعد کی منزل میں موجودہ زندگی سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت بھی اپنے اندر پیدا کرتا جائے۔



گذشتہ صفحات میں بیان کردہ اشارات سے ہم نے دیکھ لیا ہے کہ تمام کائنات میں جس میں

انسان بھی شامل ہے (خدا کا ایک قانون کارفرما ہے جس کی رُو سے ہر وہ شے جو اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا کر لیتی رہے زندہ رہتی ہے اور جو اس صلاحیت کو کھودیتی ہے وہ مٹ جاتی ہے۔ اس قانون "محو اثبات" کو قرآن نے ایک جامع آیت میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا کہ

يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ ۖ وَرَعْنَدَ ۚ أَمْرُ الْكِتَابِ ۖ (۱۳/۲۹)

خدا کا قانون مشیت یہ ہے کہ جو فرد یا قوم مٹنا چاہے اسے مٹا دیا جائے۔ جو ثبات و

استحکام چاہے اسے ثبات و تمکن عطا کر دیا جاتا ہے۔ اس کا یہ قانون کارگزار کائنات میں

نافذ ہے اور اس کی اصل و بنیاد خود خدا کے پاس ہے (اس لئے کوئی اس میں تغیر

نہیں پیدا کر سکتا)۔

یہ آیت ایک اور عظیم الشان حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے جس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ہم گذشتہ اوراق میں دیکھ چکے ہیں کہ قانون ارتقاء کی رُو سے زندہ وہی رہ سکتا ہے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو۔ آگے وہی بڑھ سکتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی استعداد ہو یعنی وہ نوع جو کشمکش حیات میں نامساعد قوتوں سے نبرد آزما ہو کر انہیں شکست دے اور یوں اپنے زندہ رہنے کا ثبوت پیش کرے وہ زندہ رہتی ہے لیکن جو ایسا نہ کرے وہ مٹ جاتی ہے۔ ڈارون نے اس اصول کو بقا (SURVIVAL OF THE FITTEST) سے تعبیر کیا ہے۔ (اگرچہ یہ الفاظ خود

ایک اہم حقیقت ڈارون کے نہیں بلکہ ہر برٹ اسپنسر کے ہیں) لیکن ڈارون اور اس

کے رفقاء سفر ان الفاظ سے جو مراد لیتے تھے وہ قرآنی مفہوم سے جدا گانہ تھی۔ انیسویں صدی میں یورپ کے علمائے طبیعیات کے نزدیک کائنات کا تصور میکا نیکی تھا۔ اس تصور کی تشریح تو طول طویل ہے لیکن اس سے مختصر مفہوم یہ تھا کہ یہ کائنات کسی نہ کسی طرح وجود میں آگئی ہے اور اب خود بخود اپنی اندرونی قوتوں کے زور سے چلی جا رہی ہے۔ نہ اس کی تخلیق میں اور نہ اس کے بعد اس کے نشو و ارتقاء میں کسی مقصد، ارادہ یا اسکیم کو کوئی دخل ہے۔ ایک اندھی قوت (BLIND FORCE) ہے جس سے یہ تمام

۱۔ (MECHANISTIC CONCEPTION OF UNIVERSE) اس کی تشریح آئندہ چل کر

لئے گی۔ اب خود یورپ اس تصور کو باطل قرار دے چکا ہے۔

کارگہ عالم حرکت میں ہے۔ لہذا جو نوع قوت حاصل کریتی ہے اُسے باقی رہنے اور آگے بڑھنے کے لئے چُن لیا جاتا ہے۔ ان علمائے طبیعیات کے نزدیک اس طریق کا نام "انتخاب طبیعی" (NATURAL SELECTION) ہے۔ عام الفاظ میں یوں سمجھئے کہ (اس نظریہ کی رُو سے) آج کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ اس لئے موجود نہیں کہ کسی مقصد یا اسکیم کے ماتحت اس کا موجود رکھنا ضروری تھا بلکہ اس لئے کہ ان میں کسی نہ کسی طرح باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی قوت پیدا ہو گئی اس لئے فطرت نے انہیں باقی رہنے کے لئے منتخب کر لیا۔ قرآن کریم، اس تصور اور نظریہ کو بنیادی طور پر غلط قرار دیتا ہے اس کے نزدیک یہ تمام سلسلہ کائنات ایک خاص اسکیم (مقصد یا حکمت) کے ماتحت وجود میں لایا گیا ہے اور اسی مقصد کے ماتحت آگے بڑھ رہا ہے۔ لہذا جو چیز خدا کے قانون کے مطابق زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اس کا زندہ رہنا اور آگے بڑھنا اس مقصد کے لئے مفید ہوتا ہے اور جو چیز اپنے اندر ایسی صلاحیت نہیں پیدا کرتی اس کا اس مقصدِ عظیم کی راہ سے ہٹ جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔ "وَعَسَىٰ أَن تَكُونُوا مِنَ الْمُكْتَبِينَ" کا مطلب یہی ہے کہ یہ قانونِ محو و ثبات یونہی اندھا دھند کام نہیں کر رہا۔ اس کے پیچھے ایک بلند مقصد ہے جس کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

اب رفتہ رفتہ خود علمائے مغرب اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ انیسویں صدی کا میکائیکی تصور باطل تھا۔ اور وہ اس حقیقت کا اقرار کر رہے ہیں کہ یہ تمام سلسلہ کائنات ایک عظیم الشان مقصد کے ماتحت وجود میں لایا گیا ہے اور ایک اہم اسکیم کے ماتحت آگے بڑھ رہا ہے۔ (تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی) لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تمام سلسلہ کائنات ایک لگے بندھے ضابطہ کے مطابق ایک معین پروگرام کے ماتحت سرگرم عمل ہے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ یہ ایک گھڑی کے مانند ہے جسے اس کے خالق نے ایک مرتبہ کوک دیا اور اس کے بعد وہ ایک مرتب شدہ نقشہ کے مطابق چلی جا رہی ہے۔ کائنات کے متعلق یہ تصور بھی قرآنی تصور کے خلاف ہے۔ قرآن کی رُو سے کائنات حرکتی ہے، سکونی نہیں۔ یَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ "كُلٌّ يُّوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ" (۵۵/۲۹) کائنات میں جو کچھ ہے سب اپنی نشو و نما کے لئے خدا کی ربوبیت کا محتاج ہے۔ وہ قانون ان چیزوں کی نشو و نما کرتا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر آن ایک نئی شان میں سامنے آتی ہیں۔ اس طرح کائنات میں مختلف تخلیقی اضافے ہوتے رہتے ہیں۔

آرائشِ جمالی سے فارغ نہیں بنوز پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ایک ترک شاعر کے الفاظ میں ”کُن کے غنّہ کی گونج ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہے۔“ قرآن میں ہے۔

يَزِيدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاءُ (۳۵/۱)

خدا اپنی تخلیقات میں نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔

اس مقام پر (برسبیل تذکرہ) ایک اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ بھی بے محل نہ ہوگا۔ یہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ کائنات ایک متعین پروگرام کے مطابق ایک خاص مقصد اور اسکیم (حکمت بالغہ) کے ماتحت سرگرم عمل ہے۔ اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس صورت میں جب کائنات کی ہر شے ایک خاص پروگرام کے مطابق عمل پیرا ہے انسان کو (جو خود کائنات ہی کی ایک شے ہے) مجبور مانا جائے گا۔ لیکن (جیسا کہ آئندہ باب میں بیان ہوگا) انسان کو اختیار و ارادہ بھی دیا گیا ہے۔ اگر انسان اس پروگرام کے خلاف چلتا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے (یعنی تخلیق کائنات کے مقصد کے حصول کا پروگرام) تو اس کا اس عظیم الشان پروگرام پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ

جبر و اختیار

نظام کائنات اس خالق کائنات کے ہاتھوں میں ہے جس کے حیطہ قدرت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس سے انسان کی اپنی ذات ارتقاء و عروج کے بجائے پستی اور تنزل کے جہنم میں جاگرتی ہے۔ لیکن اگر یہ اس پروگرام کی تکمیل میں کوشاں ہوتا ہے تو اس پروگرام کی تکمیل سے خود اس کی اپنی ذات کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہاتھ اُس کے ہوتے ہیں اور اُن میں قوت اللہ کی تیرا س کے ہوتے ہیں اور ان کی انیوں کے ساتھ قضائیت کی۔ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی (۸/۱۷) ”جب تُو نے تیر چلایا تو وہ تُو نے نہیں چلایا۔ بلکہ درحقیقت خدا نے چلایا۔“ یہ وہ مقام ہے جس کے متعلق ڈاکٹر ہنس ڈریش کہتا ہے کہ وہاں پہنچ ”ہم اپنے آپ کو خدا کے سپاہی کہہ سکتے ہیں“ (THE GREATEST DESIGN اور علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں)۔

”اس ارتقائی تبدیلی کے طرق و نہج میں خدا خود بندہ کا رفیق کار ہو جاتا ہے بشرطیکہ انسان اس میں سبقت کرے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۱/۱۲)۔ لیکن اگر وہ اس باب میں سبقت نہیں کرتا۔ اگر وہ اپنی خودی کی مخفی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا۔ اگر وہ اُبھرنے والی زندگی کے اندرونی تلاطم کا احساس نہیں کرتا تو اس کی رُوح پتھر کی سی قساوت اختیار کر لیتی ہے اور وہ (انسان نہیں رہتا

بلکہ جامد مادہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔“

(خطبات تشکیل جدید، صفحہ ۱۱-۱۲)

جس جماعت کو ڈریش نے ”خدا کی سپاہ“ کہا ہے یہ وہی ہے جسے قرآن کریم حزب اللہ کے ممتاز لقب سے تعبیر کرتا ہے۔

أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۵۸﴾

سابقہ صفحات میں ضمنی طور پر لکھا گیا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے ایک وقت تھا کہ خور مادہ کا بھی وجود نہ تھا حدوث و قدم مادہ کا مسئلہ شروع سے بحث و جدل کا مرکز بنے چلا آ رہا ہے۔ شعور انسانی اپنے عہد طفولیت میں سمجھ نہیں سکتا تھا کہ یہ مجیز العقول مادی کائنات کس طرح عدم سے وجود میں آگئی۔ مادہ کہاں سے پیدا ہو گیا؟ لیکن مادہ کی حقیقت کے متعلق دورِ حاضرہ کی سائنس کی تحقیق کیا ہے؟ اس کے متعلق چند صفحات آگے چل کر، وحی کے عنوان میں واضح تصریحات سامنے آئیں گی۔ اس وقت صرف ایک اقتباس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ دورِ حاضرہ کا ماہر علم الافلاک، سر جیمز جینس لکھتا ہے۔

دورِ حاضرہ کے علم طبیعیات کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ تمام مادی کائنات سوائے لہروں (WAVES) کے اور کچھ نہیں۔ یہ لہریں دو قسم کی ہیں۔ محصور لہریں (BOTTLED

UP WAVES) جسے ہم مادہ کہتے ہیں اور آزاد لہریں جسے روشنی کہا جاتا ہے۔

فنائے مادہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ ان محصور لہروں کو آزاد کر دیا جائے کہ وہ فضا کی پہنائیوں میں منتشر ہو جائیں۔ ان تصورات کے ماتحت یہ تمام کائنات سمٹ سمٹا کر فقط ”دنیلے نور“ رہ جاتی ہے۔ مضمیر یا مشہود۔ اس اعتبار سے تخلیق کائنات کی تمام داستان بالکل صحیح اور مکمل طور پر ان چند الفاظ میں بیان کی جاسکتی ہے کہ خدا نے نور (LIGHT) سے کہا کہ ہو جا (اور وہ ہو گیا)۔

(THE MYSTERIOUS UNIVERSE)

سر جیمز جینس نے یہ بات آج سے کچھ سال پہلے کہی تھی۔ اب ایٹمی توانائی کی تحقیقات اور عملی تجارب

نے یہ حقیقت ردِ زور و دشمن کی طرح بے نقاب کر دی ہے کہ جسے ہم مادہ کہتے ہیں وہ درحقیقت کہربائی سالمات سے زیادہ کچھ نہیں۔ یعنی بجلی کی مثبت اور منفی قوت اور جب اسے ایک قدم اور پیچھے لے جائیں تو یہ قوت توانائی محض (PURE-ENERGY) رہ جاتی ہے جسے عالمِ خلق (دنیا کے محسوسات) نہیں بلکہ عالمِ امر سے متعلق سمجھنا چاہیئے۔



خلاصہ مباحث

یہ سوال کہ دنیا میں ”سب سے پہلا انسان“ کس طرح وجود میں آگیا، ذہنِ انسانی کے لئے وجہ ہزار حیرت و استعجاب رہا ہے۔ چنانچہ اُن مذاہب میں جن میں توہم پرستی نے حقائق کی جگہ لے رکھی ہے اور دنیا کا کونسا مذہب ہے جس میں ایسا نہیں ہوا، اس عقیدے کے حل میں عجیب و غریب افسانہ طرازیوں سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اس کے متعلق جو کچھ بتایا ہے وہ ٹھیک ٹھیک، وہی ہے جس کی طرف علم بصیرت کے انکشافات راہ نمائی کئے جا رہے ہیں۔ سائنس کے انکشافات کی رو سے خاک کے ذرے مختلف ارتقائی منازل طے کر کے ’قرنہا قرآن کے بعد انسانی شکل میں متشکل ہو گئے۔ یعنی سب سے پہلے کوئی ایک فرد صورتِ انسانی میں جلوہ گر نہیں ہوا، بلکہ ایک نوع وجود پذیر ہوئی۔ ان متنوع مراحل کی تفصیل قرآن کریم کی آیاتِ جلیلہ میں عجیب انداز میں سمٹی ہوئی ہے۔ لیکن قرآن کریم اس سے بھی ایک قدم اور آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں بلکہ یہ پیش خیمہ ہے آنے والی زندگی کا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ حیات اس کے نزدیک ایک جوئے رواں ہے جس کا خاتمہ موجودہ وادی میں نہیں ہو جاتا۔ انسان کی زندگی محض حیوانی زندگی نہیں بلکہ اس سے بلند و بالا ہے۔ اب اس انسانی زندگی (یعنی شرفِ انسانیت) کے ارتقاء کا سلسلہ شروع ہو گا۔ اس کے لئے قرآن کریم ایک مکمل نظام عطا کرتا ہے جس کے تابع زندگی بسر کرنے سے اس شرفِ انسانیت میں بڑھنے پھیلنے اور پھولنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے یہ بتدریج بلندیوں کی طرف اُٹھتا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اجتماعی زندگی میں ہوتا ہے۔ انفرادی طور پر نہیں۔

خود یورپ کے محققین و مفکرین جو انسان کے طبعی ارتقاء کو حرفِ آخر میں سمجھا کرتے تھے اب رفتہ رفتہ

اس سے آگے بڑھ رہے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ ارتقائے طبیعی کے بعد اب ارتقائے نفسی کے مراحل آئیں گے۔ چنانچہ پروفیسر جوڈ لکھتا ہے :

انسانیت کے ارتقاء کی اگلی منزل طبیعی نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی ہوگی۔ پہلے پہل انسان ارتقاء کی منزلیں طے کر کے حیوانیت سے انسانیت کے مقام میں آیا۔ پھر اس نے صنعت و حرفت کی مدد سے اپنے آپ کو آلات و اسباب سے آراستہ کیا۔ ہمارے اس دور میں انسان نے صنعت و حرفت میں پورا کمال حاصل کر لیا ہے۔ اب اس کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے اور جس طبیعی ارتقاء نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ حیوان سے ترقی کر کے انسان کے درجے میں قدم رکھے۔ پھر اس کی جبلی ضرورتوں نے اس سے اوزار و آلات بنوائے اور وہ مشین اور سٹیم کا خالق بنا۔ اسی طرح وہ آج مجبور ہے کہ اپنا قدم آگے بڑھائے۔ اور اس کا یہ قدم مادی نہیں بلکہ نفسی اور ذہنی ترقی کی طرف ہو گا۔ لیکن یہ ترقی، وحی کے بغیر ممکن نہیں۔



أَنَا جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً

آدم

(نماینده آدمیت)

خود گمراخته خود شکنی خود نگری پیدا شد

ادم

(۲)

حُسن کے ذوقِ نمود نے انگڑائی لی۔ خطیرۃِ قدس کی ملکوتی فضا میں ہلکا سا متوج پیدا ہوا۔ ملاءِ اعلیٰ کے حرمِ ناز کے حریری پردوں میں غیر محسوس سی جنبش نظر آئی۔ بربطِ عدم کے خاموش تاروں میں نورانی ارتعاش سا محسوس ہوا۔ فرشتوں کی معصوم سی نگاہیں اُد پر کواٹھیں اور ”سُبُّوْمُہ“ ”قُدُّوْمُہ“ کی بے صوت صدائیں، نور و نہکت کے رنگین ترشح کی صورت میں زم زمہ ریز و نغمہ بار ہوئیں۔ دُورِ جانبِ عرشِ عظیم سے ”گُن“ کی تخلیقی آواز نے اس طلسمِ سکوت کو توڑا۔ عدم کے پردے اُٹھنے لگے اور اُفق کے اس پار، عالمِ امر سے نگارخانہ کائنات نے خاموشی سے اُبھرنا شروع کیا۔ سائنسدان نے اسے حرکت و حرارت سے تعبیر کیا۔ فلسفی نے اسے حلقہٴ دِامِ خیال قرار دیا۔ صوفی نے جلوۂ یکتائی محبوب کہا۔ اربابِ قصا و قدر نے ایک متعین پروگرام کا نقطہٴ اولیٰ بتایا۔ اور قرآن نے امرِ تکوین کا کرشمہٴ ایمان افروز نام رکھا جسے قلبِ سلیم نے قانونِ مشیت مان کر سر جھکا دیا۔

ہیوانانے کائنات اُبھرنے کو تو اُبھرا لیکن بڑا بے کیف اور بہت بے رنگ۔ آہستہ آہستہ اس نے جھکے ہوئے ذردوں میں ربط و ضبط پیدا ہونا شروع ہوا۔ ربط و ضبط سے اس خاکہ میں کچھ رنگینیوں کے آثار محسوس ہونے لگے۔ منتشر رنگینیوں نے آہستہ آہستہ ایک نقطہ پر مرکوز ہونا شروع

کیا۔ بھری ہوئی شوخیاں سمٹ کر بجلیاں بننے لگیں۔ جنت کی حوروں نے گز آنکھیوں سے باہم اشارے کئے۔ نوامیس فطرت کی نگاہوں میں ہلکا سا تبسم پیدا ہوا۔ حرم قدس کے رازداروں نے کانوں ہی کاٹا میں کچھ سنا۔ زمین کانپی۔ آسمان تھر تھرا یا۔ چاند کا سا غر زریں چمک گیا۔ ستاروں کے ننھے سے دل دہل گئے۔ فضا میں ایک شور اٹھا اور ے

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگر سے پیدا شد حسن لرزید کہ صاحب نظر سے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور خود گرے خود شکستے، خود تگرے پیدا شد
خبرے رفت ز گردوں بشتان ازل حذر سے پرد گیاں پردہ در سے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش باغوش حیات چشم واکرد و جہان دگر سے پیدا شد

زندگی گفت کہ در خاک پیدم ہمہ عمر
تا ازین گنبد دیرینہ در سے پیدا شد

حوروں نے نعمت تبریک گایا۔ فرشتوں نے سر جھکایا۔ ارض و سموات نے اپنی باج گزاری کا خریطہ پیش کیا۔ ابلیس نے مقابلہ کا چیلنج دیا۔ اور یوں یہ عالم بے کیف، دنیاے رنگ دہواور جہان سوز و ساز بن گیا۔ اب درحقیقت اس پروگرام کی پہلی منزل شروع ہوئی جس کے پیش نظر عالم جمادات سے لے کر پیکر انسانی تک کے ارتقائی مراحل قرنہا قرن کے عرصہ دراز میں طے ہوئے۔ تھے، اب وہ مقام آگیا جہاں انسان مخاطب کے قابل ہو گیا۔ جہاں اسے سمع و بصر، شعور و ادراک، ارادہ و اختیار عطا کر کے ہو (وہ) کے بجائے (گم) نم سے خطاب کیا گیا۔ یہ تو ہم پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ انسان کی پیدائش کس طول طویل سلسلہ ارتقار کے ماتحت واقع ہوئی ہے اور اس سلسلہ ارتقار کے بعد کسی ایک فرد کی تخلیق نہیں ہوئی بلکہ ایک نوع کی تخلیق ہوئی جسے نوع انسانی کہا گیا۔ ہے، لہذا آدم سے یہ مراد نہیں کہ وہ ”سب سے پہلا انسان“ تھا جو کسی نہ کسی طرح یونہی بنا دیا گیا تھا اور اس سے پھر نسل انسانی آگے بڑھی بلکہ آدم سے سدا آدمی

لہ سابقہ عنوان میں ۳۲/۹ ملاحظہ کیجئے ”نفع روح“ سے پہلے تمام ارتقائی منازل میں انسان کے لئے ہو (ضمیر غائب) استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً (سوا کا) وغیرہ۔ لیکن نفع روح کے فوری بعد یہ ضمیر غائب، مخاطب (گم) سے بدل گئی ہے۔ وجعل لکم السمع لکیا اب انسان مخاطب کے قابل ہو گیا۔

آدم سے مراد! (THE MAN) ہے۔ قصہ آدم خود آدمی کی سرگذشت ہے نہ کہ کسی خاص فرد کی داستان زندگی۔ ”بابا آدم اور اماں حوا“ کا تصور بائبل کا تصور ہے قرآن کا نہیں۔ قرآن نے آدمی کی سرگذشت کو مثیلی رنگ میں بیان کیا ہے تاکہ مجرد حقیقتیں تشبیہات کے لباس مجاز میں سامنے آسکیں۔

آغازِ داستان قرآن کریم کا پہلا ورق اللہ نے اس عظیم المرتبت کتاب کی غرض و غایت اور انسانوں کی تین جماعتوں (مؤمنین، کفار اور منافقین) کے اجمالی تذکرہ کے بعد سرگذشتِ آدم کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۱۱)

اور جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

لفظ خلیفہ کی تشریح، اس عنوان کے آخر میں ملے گی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ اس سے مراد ”خدا کا خلیفہ“ نہیں اس سے مطلب سابقہ آبادی یا نوع کا جانشین ہے۔ ”خلیفۃ اللہ“ قرآن میں کسی کو نہیں کہا گیا۔

انسان سے پہلی انواع میں (ہم دیکھ چکے ہیں کہ) اختیار و ارادہ کی قوت نہیں تھی۔ سلسلہ ارتقاء میں یہ پہلی کردی تھی جسے اختیار و ارادہ دیا گیا تھا۔ باقی کائنات (جسے اختیار و ارادہ حاصل نہیں) بلا چون چرا قانونِ خداوندی کے مطابق اپنے اپنے مفوضہ فرائض کی تکمیل میں سرگرم عمل ہے۔ لیکن انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو قانونِ خداوندی کی اطاعت کرے اور چاہے تو اس سے سرکشی اختیار کر لے۔ قانونِ خداوندی سے سرکشی کا نتیجہ فساد کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ لہذا کائنات کی قوتوں (ملائکہ) نے کہا کہ اَتَجْعَلُ فِیْہَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْہَا وَیَسْفِلُ السَّمٰوٰتُ (۲/۳۰) کیا اب دنیا میں ایک ایسی مخلوق کو پیدا کیا جائے گا جو اس میں فساد انگیزیاں اور خون ریزیاں برپا کر دے گی؟ اس کے برعکس ہماری یہ حالت ہے کہ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ (۲/۳۰) ہم ہمیشہ تیرے پروردگار کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں جس کے نتائج دیکھ کر ہر دیدہ بینا مصروفِ حمد و ستائش ہو جائے اور اس میں جتنی دُور تک بھی ہمیں جانا پڑے جاتے ہیں، کبھی ٹھکتے ہی نہیں۔

خلاقِ فطرت کے چہرہ جمال آگئیں پر ایک حسین سی ہنسی برقی طور بن کر لہرائی اور ارشاد ہوا کہ

إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۲/۳۰)

میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

استحقاق خلافت استحقاق خلافت کے لئے تسبیح و تقدیس ہی کافی نہیں اس کے لئے اور بھی بہت کچھ درکار ہے۔ بقول اقبالؒ:

مقام بندگی دیگر مقام عاشقی دیگر

زوری سجدہ می خواہی زخا کی بیش ازین خواہی

کائنات کی قوتیں اس مشینری کو خدا کے حکم کے مطابق چلا سکتی ہیں۔ اس کے حُسن میں خود کوئی اضافہ نہیں کر سکتیں۔ وہ خدا کے حکم کی فرماں پذیر ہو سکتی ہیں اس کی رفیق نہیں بن سکتیں۔ یہ مقام صرف انسان کے لئے مختص ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کے اظہار کے لئے یہ کیا گیا کہ

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ ۖ

وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ۝ (۲/۳۳-۳۱)

اور اس نے آدم کو علم الاشیاء عطا کر دیا۔ پھر ان اشیاء کو ملائکہ کے سامنے رکھا اور کہا اگر تم اپنے دعوئے استحقاق خلافت میں سچے ہو تو ان کی خاصیت و ماہیت کے متعلق مجھے بتاؤ۔ انہوں نے (سر جھکا لیا اور) عرض کیا کہ (بارِ الہا!) ہم تو صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنے کا علم تو نے ہمیں دیا ہے۔ اس سے زیادہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ بے شک تو ہی سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس نے آدم سے کہا کہ تو اس سے ملائکہ کو مطلع کر دے۔ سو جب اس نے ایسا کر دیا تو (اللہ نے ملائکہ سے) کہا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں پستیوں اور بلندیوں کی تمام غیب کی باتوں سے واقف ہوں اور تمہاری بارز اور مستتر صلاحیتوں سے بھی۔

یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ آدم کو اسماء (NAMES) کا علم دیا گیا۔ اس میں ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ علم کا پہلا درجہ (PERCEPTUAL) ہوتا ہے یعنی وہ علم جو حواس (SENSES) کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ قرآن نے اس علم پر بھی بڑا زور دیا ہے۔ وہ سمع و بصر سے کام لینے کی اہمیت

کو بار بار اجاگر کرتا ہے۔ لیکن اس سے آگے علم کا وہ درجہ ہے جسے (CONCEPTUAL) کہتے ہیں۔ یعنی مدركات (PERCEPTION) سے تصورات (CONCEPTS) متعین کرنا۔ یہ حصہ خاص انسانی سطح زندگی پر حاصل ہو سکتا ہے۔ جہاں تک تصورات اور اسماء کا تعلق ہے، اسے سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی تصور ذہن میں نہیں آ سکتا جب تک اس کے لئے لفظ (اسم) موجود نہ ہو۔ اور کوئی لفظ بغیر تصور کے وجود پذیر نہیں ہو سکتا۔ اسماء اور تصورات کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس کے لئے علم الاشیاء کی بخشش | ہمارے زمانے میں (SEMANTICS) میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بہر حال قرآن نے یہ بتایا ہے کہ آدم کو تصوراتی علم (CONCEPTUAL KNOWLEDGE) کی صلاحیت دی گئی۔ یہ وہ خصوصیت تھی جس کے سامنے ملائکہ (کائنات کی مختلف قوتوں) کا سر جھک گیا۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ
أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۝ (۲/۳۴)

اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کے سامنے جھک جاؤ تو وہ سب کے سب جھک گئے۔ لیکن ابلیس نہ جھکا، اس نے سرکشی برتی۔ اس نے استکبار کیا اور وہ نہ ماننے والوں میں سے تھا۔

ملائکہ نے اپنا سر تسلیم خم کر دیا۔ قوائے ملکیت کی فطرت میں جھک جانا ہے۔ ان کی خصوصیت طاعت و انقیاد، تسلیم و رضا ہے۔ اس کے برعکس قوت ابلیسی کی شعلہ مزاجی کی فطرت میں سرکشی و استکبار ہے۔ قوانین الہیہ کے سامنے جھک جانا اسلام اور ان سے اعراض و سرکشی برتنا کفر ہے۔ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۝ (ملائکہ اور ابلیس کی تفسیر آگے چل کر ملے گی)۔ اس مقام پر صرف اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ اگر انسان قانون فطرت سے آگہی حاصل کر لے تو یہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر سکتا ہے لیکن خود اس کے اپنے جذبات (اگر انہیں وحی کے تابع نہ رکھا جائے) تو وہ سرکشی اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ ملائکہ ہیں۔ اور یہ ابلیس (یا شیطان)۔

یہ پہلی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے آدم کو ملائکہ پر شرف حاصل ہے۔ اس کے بعد دوسری

دوسری خصوصیت اختیار و ارادہ | خصوصیت کا تذکرہ فرمایا۔ یعنی اختیار و ارادہ۔
اشیائے کائنات کے متعلق تشریح کریم
میں ہے۔

وَاللّٰهُ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ
وَالْمَلٰئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ قُوَّتِهِمْ
وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (۲۹-۵۰/۱۶) (نیز ۲۲/۱۸)

اور آسمانوں (بلندیوں) میں جس قدر چیزیں ہیں اور زمین (پستیوں) میں جس قدر
جاندار اور ملائکہ ہیں، سب قوانین خداوندی کے سامنے سرسجود ہیں اور وہ سرکشی نہیں
کرتے اپنے پروردگار کے قانون ربوبیت سے ڈرتے ہیں جو ان کے اوپر موجود ہے اور جو کچھ
انہیں حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں!

اختیار و ارادہ کی سحر کاریاں | یہاں انسان اور دیگر اشیا کے کائنات کا فرق ظاہر ہو گیا۔
یہ انسان کا اختیار و ارادہ ہے جس سے دیگر اشیائے کائنات

سے ممتاز اور متمیز ہے۔ انسان کے سوا کسی اور مخلوق میں یہ قوت ہی نہیں کہ وہ جس بیج و اسلوب پر چلنے
کے لئے پیدا کی گئی ہے اس سے سرکشی و انحراف اختیار کرے۔ (كُلُّ لَهٗ قَابِئُتُوْنَ ۝) لیکن انسان
میں سجدہ ریزی اور سرکشی دونوں کی قوتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں۔ یہی قوت اس کی سرفرازی و
سر بلندی کا باعث ہے۔ اسی سے سجدہ ملائکہ اور مخدوم خلائی ہے۔ کش مکش حیات میں پر کیف جاؤ بیٹیں
ہیں تو اسی سے اور کش کش زندگی میں رنگین کیفیتیں ہیں تو اسی کے دم سے۔ ربط ہستی کے تاروں میں
خوابیدہ نغمے بیدار ہوتے ہیں تو اسی مضرب سے، اور مینائے حیات کے سادہ پانی میں کیف رنگ و نعت
کی ارغوانی موجیں اٹھتی ہیں تو اسی کے جوش سے۔ سینہ کائنات میں ایک دھڑکنے والا دل ہے تو اسی کے
تموج سے اور اگر اس دل میں مچلنے والی آرزوؤں کی رسیلی بجلیاں ہیں تو اسی تھرک سے۔ غرضیکہ انسان
انسان ہے تو اسی کی بدولت اور یہ دنیا، دنیا ہے تو اسی کے صدقے۔ اگر یہ اختیار و ارادہ نہ ہوتا تو انسان
پتھر کا بُت ہوتا، یا اشیائے کائنات میں سے کوئی عام شے۔ سجدہ ملائکہ و مسخر کائنات کبھی نہ ہوتا۔
قصہ آدم کا پہلا باب اسی اختیار و ارادہ کے مظاہر سے شروع ہوتا ہے جو معصیت آدم کی شکل میں

سامنے آتا ہے۔ نیکی وہی نیکی ہے جو بدی کی قدرت رکھتے ہوئے عمل میں آئے۔ اطاعت وہی اطاعت ہے جو سرکشی کی استطاعت کے باوجود سرزد نہ ہو۔ نیاز مندی اسی کی قابلِ شناس ہے جو خود سراپا ناز ہو۔ اسی سر کے جھکنے میں لذت ہے جس کی پیشانی میں دنیا بھر کی سرفرازاں جھلک رہی ہوں۔ جس میں انتقام کی قوت نہیں اس کے عفو میں کیا خوبی ہے۔ جس میں ہمسری کی ہمت نہیں اس کا جھک کر سلام کرنا خوشے غلامی ہے۔ جس کے پاؤں تلے تختِ حکومت نہیں اس کا بورہ نشین ہونا گد اگری ہے۔ اختیار رکھتے ہوئے خود پر کنٹرول رکھنا ہی انسانیت کا شرفِ اعتبار ہے۔ اسی سے اس کی خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور استحکام خودی ہی انسانیت کی معراج ہے۔ نظریۂ ارتقار میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض حیوانات جس مقام میں تھے وہیں ٹھٹھڑ آگے بڑھنے کی صلاحیت

کر تے کرتے بہت دور آگے نکل گئے۔ عروج دار ارتقار کن کے حصے میں آیا اور جمود و تعطل کن کے مقدر میں تھا؟ اس باب میں ماہرِ فن کی تحقیق یہ ہے کہ ہر وہ نوع جسے اپنی بقا (یعنی ارتباطِ جسم و جان) کے لئے کسی خاص تگ و دو کی ضرورت نہ پڑی وہ بیکار ہو کر رہ گئی۔ مثلاً جو نوع کسی ایسے مقام میں آباد تھی جہاں اشیائے خورد و نوش کی فراوانی تھی۔ کسی قسم کا خوف و خطر نہ تھا۔ جہاں نے تیر کماں میں کھانا صیاد کیا ہیں!

وہ نوع یا تو رفتہ رفتہ مٹ گئی یا منجمد ہو کر رہ گئی۔ آگے نہیں بڑھ سکی۔ لیکن اس کے برعکس جس نوع کو اپنی بقا اور حفاظت کے لئے تگ و تاز کی سہرا حرکتِ زندگی بسر کرنی پڑی۔ جس کا ہر لمحہ کشمکشِ حیات میں گزارا جسے ہم زندگی کے ساحل پر لہروں کی موسیقی میں جذب ہو کر رہ جانے کے بجائے تلاطمِ دریا میں موجوں سے ہم آغوش ہونا پڑا۔ اس میں باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیتیں پیدا ہو گئیں اور اسی نے ارتقائی منازل طے کیں۔ چونکہ انسان کی تخلیق کا مقصد ہی اسے ارتقائی منازل طے کرا کر آگے بڑھانا تھا اس لئے خارجی دنیا کی کشمکش کے علاوہ خود اس کے قلب کی دنیا کو ایک کشمکش کی آماجگاہ بنا دیا۔ جس میں ہر وقت اور ہر آن خیر و شر کی نبرد آزمائی اور اہرمن و یزداں کی ستیزہ کاری دجہ گرمی حیات رہے۔ یہی کشمکش پیہم اور کشمکش مسلسل ہے جو اس کی شمشیرِ خودی کے لئے فساں اور جوہر انسانیت کے لئے سامانِ بالیدگی ہے۔ صرف انسان اپنی ذات ہی کے لئے وجہِ بالیدگی نہیں بلکہ کائنات

ہیں حسین ندرت کاریوں کے اضافے بھی انسان کے اختیار و ارادے ہی کے رہیں منت ہیں۔ باقی مخلوق خدا کی بنائی ہوئی کائنات کو چھیڑتی نہیں۔ لیکن انسان کی یہ حالت ہے کہ بقول علامہ اقبالؒ

گفت یزدال کہ جنیں است و چنان خواهد ماند

گفت آدم کہ جنیں ہست و چنان خواهد بود

جو کچھ ہے (WHAT IS) کو جو کچھ ہونا چاہیے (WHAT OUGHT TO BE) بنادینے کا جذبہ انسان ہی کے سینے میں پنہاں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خود کائناتی قوانین کے مطابق بھی کائنات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح پوری کی پوری کائنات ارتقائی منازل طے کئے جا رہی ہے۔ لیکن یہ تبدیلیاں (قرآن کے الفاظ میں) ایسے ایسے طویل المیعاد منازل (PERIODS) کے بعد ہوتی ہیں جن میں سے ایک ایک منزل (یوم) ہزار ہزار اور پچاس پچاس ہزار سال کی ہوتی ہے۔ لیکن اس کائناتی قانون کے ساتھ جب انسان کی رفاقت شامل ہو جاتی ہے تو یہ تبدیلیاں دنوں کے اندر واقع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ انسان ان تبدیلیوں کو اپنی عمر کے پیمانوں کے مطابق ظہور میں لاتا ہے۔ خدائی پیمانوں کے مطابق نہیں لاتا۔ یہ سب کچھ انسان کے اختیار و ارادہ کی قوت سے ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے انسان کی خصوصیت علم الاشیاء کے ساتھ ہی اس خصوصیت کا بھی ذکر کر دیا جس کی رو سے یہ معصیت و قانون شکنی کا بھی اختیار رکھتا ہے۔

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا
حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ
الظَّالِمِينَ ۝ (۲/۳۵)

اور ہم نے کہا کہ اے آدم! تو اور تیری بیوی (یعنی مرد اور عورت دونوں) جنت میں رہو اور اس میں جہاں سے جی چاہے با فراغت کھاؤ (پو) لیکن اس شجر کے قریب نہ جانا ورنہ ظالمین میں سے ہو جاؤ گے۔

یہ جنت کہاں تھی جس میں آدم کو رکھا گیا تھا؟ وہ شجر کونسا تھا جس کے پاس جانے سے اسے روکا گیا تھا؟ اس کے قریب جانے سے ان میں کس قسم کی کمی آ جانی تھی۔ (ظلم کے معنی کمی کے بھی ہیں) ان نکات کی تشریح ذرا آگے چل کر ملے گی۔ اس مقام پر صرف اتنا دیکھ لینا کافی ہے کہ خدا نے حکم دیا کہ یہ کام نہ کرنا۔ اس کے بعد

کیا ہوا؟

فَاَزَلَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ص (۲/۳۶)

اس کے بعد شیطان نے انہیں پھسلا دیا اور اس طرح وہ جس (جنتی کیفیت) میں تھے وہاں سے انہیں نکال دیا۔

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ بہوٹ۔ آدم نیچے گر گیا۔ ارتقار میں عروج و بلندی ہے، جمود میں سکون اور بہوٹ میں زوال و انحطاط۔ انسان عروج و ارتقار کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ جمود یا انحطاط کے لئے نہیں۔ لیکن جب یہ قانون خداوندی سے سرکشی برتا ہے تو یہ بلند ہونے کے بجائے پستی کے گڑھوں میں گر جاتا ہے اور اس کی کیفیت حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ اس کش مکش کی رزمگاہ ارضی زندگی ہے جس میں اس کے لئے قیام اور تمتع ہے۔

وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ

وَمَتَاعٌ اِلٰى حِينٍ ۝ (۲/۲۶)

ہم نے کہا کہ (اس مقام) سے نیچے گر جاؤ (کیونکہ سرکشی کا یہی نتیجہ ہے) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اب تمہارے لئے زمین میں ایک وقت معین تک کے لئے ٹھکانہ اور سامانِ زیست ہے۔

بہوٹ میں کس طرح ایک انسان اور دوسرے انسان میں بیگانگی اور مغائرت آ جاتی ہے۔ (عداوت کے یہی معنی ہیں) اور ارض میں مستقر اور متاع کا مفہوم کیا ہے۔ یہ چیزیں چند صفحات آگے چل کر سامنے آئیں گی۔ اس وقت یہ دیکھئے کہ کیا ایک بار کی لغزش کا نتیجہ ابدی ہلاکت ہو گیا یا اس کے بعد باز آفرینی کی صورت بھی باقی رہی؟ قرآن کہتا ہے کہ اس سے آدم ہمیشہ کے لئے راندہ درگاہ نہیں ہو گیا۔

باز آفرینی | فَتَلَقَّى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ اِنَّهٗ هُوَ
التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (۲/۳۷)

اس کے بعد آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے اور یوں سیدھی راہ کی طرف پھر لوٹا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اللہ بھی اس کی طرف لوٹ آیا۔ (اس کے قانونِ مکافات نے باز آفرینی کی راہیں اس کے لئے کٹا دیں)۔ کیونکہ باز آفرینی کے لئے سامانِ نشوونما

عطا ہو جانے کی گنجائش اس کے قانون ربوبیت میں موجود ہے۔
لیکن یہ باز آفرینی اب اس مقام میں جس مقام میں آدم گر گیا ہے، قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوگی۔

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ﴿۳۸﴾
ہم نے کہا کہ اس مقام سے تو (بہر حال اب) سب کو نیچے گرنا ہوگا۔

اس پستی سے اُبھرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ
فَاِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۳۸)
ہماری طرف سے تمہارے پاس ہدایت پہنچا کرے گی۔ سو جو شخص میری ہدایت کا اتباع کرے گا تو انہیں کسی قسم کا خوف اور غم نہ ہوگا۔

فردوسِ گمشدہ کی بازیابی کی صورت | ہلاکت اور بربادی سے مصون رہنے
کی ایک ہی صورت ہوگی اور وہ یہ کہ
زندگی قوانینِ الہیہ کے تابع بسر کی جائے۔ اگر ان قوانین کی تکذیب و انکار کی روش اختیار کی تو ہلاکت کا جہنم سامنے ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا ذُكِّرُوا بِآيَاتِنَا اُولَٰئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ
هُمُ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (۲/۳۹)
اور جو لوگ ہمارے قانون سے انکار کریں گے اور اس کی تکذیب پر اتر آئیں گے تو یہ
لوگ جہنم کے رہنے والے ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

آیات متذکرہ بالا میں کئی ایک اہم نکات ہیں جن کی تشریح اپنے اپنے مقام پر آئے گی۔ مثلاً
خلیفہ۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ علم الاشیاء۔ جنت۔ ظالم۔ توبہ۔ اصحاب النار وغیرہ۔ لیکن
یہاں ایک چیز قابل غور ہے۔ لغزشِ آدم تک ”آدم اور اس کی بیوی“ کا ذکر ہے جن کے لئے عربی
زبان کے قاعدے کے مطابق افعال و ضمائر تنبیہ (دو) آئے ہیں۔ لیکن اس کے بعد قُلْنَا اهْبِطُوا

بَعْضَكُمْ - وَلَكُمْ - جَمِيعًا - يَأْتِيَنَّكُمْ - وَخَوْفٌ عَلَيْهِمْ - يَحْزَنُونَ - وَ
الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا - هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ ان سب میں تشبیہ کے
بجائے جمع کے صیغے ہیں اور خطاب تمام

قصہ آدم خود انسان کی سرگزشت ہے نوع انسانی سے ہے۔ لہذا قصہ آدم کسی
ایک "میاں بیوی" کا واقعہ نہیں بلکہ خود انسان کی سرگزشت ہے۔ دیگر آیات میں یہ نکتہ اور بھی کھلے کھلے

الفاظ میں واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً سورۃ اعراف میں ہے۔
وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا
لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّاۤ اِبٰلِیْسَ ۖ لَمْ یَّكُنْ مِنَ السَّٰجِدِیْنَ ۝ (۷/۱۱)
اور (دیکھو) ہم نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر تمہیں بہترین صورت عطا کر دی۔ پھر ملائکہ کو حکم
دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ اس پر سب جھک گئے مگر ابلیس کے کہ وہ جھکنے والا

میں سے نہ تھا۔

دیکھئے! یہاں نوع انسانی کی تخلیق اور صورت گری کے بیان کے بعد قصہ آدم شروع کیا
گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آدم اس مقام کا مظہر ہے جہاں زندگی درجہ حیوانیت سے نکل کر دای
انسانیت میں پہنچی اور جہاں سے انسان کی تمدنی زندگی کی ابتدا اور کشش مکش حیات کا آغاز ہوا۔ اس
مقام میں سب سے پہلے ہمارے سامنے ابلیس و آدم کی کشمکش آتی ہے۔ اس کشمکش سے مراد کیا ہے
اس کی تفصیل ابلیس کے عنوان میں آئے گی۔ سر دست اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ملائکہ سے مراد
فطرت کی قوتیں ہیں جنہیں انسان جب جی چاہے مستحضر کر سکتا ہے۔ لیکن ابلیس سے مراد اس کے وہ جذبات
ہیں جو قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کر لیں تو انہیں شیطان یا ابلیس سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ
قرآن کریم میں متعدد مقامات میں بتایا گیا ہے کہ "آدم اور اس کی بیوی" جنت کی زندگی کرتے تھے کہ
شیطان نے انہیں معصیت پر آمادہ کر دیا۔ اور وہ اس زندگی سے نکل کر پست سطح پر آ گئے۔ اس مقام پر آدم
سے کہا گیا۔

قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ
وَمَتَاعٌ ۖ إِلَىٰ حِينٍ ۝ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَ مِنْهَا
تُخْرَجُونَ ۝ (۲۴ - ۲۵/۴)

فرمایا (بہر حال ایہاں سے سب نکل جاؤ) یا اس مقام سے نیچے گر جاؤ (تم ایک دوسرے
کے دشمن ہو۔ اب تمہارے لئے زمین میں ٹھکانا ہے۔ اور ایک وقت خاص تک کے لئے
وہاں سامانِ زندگی سے فائدہ حاصل کرنا۔) پھر کہا کہ تم اسی (زمین) میں زندگی بسر کر دو گے۔
اسی میں مرد گے اور (پھر مرنے کے بعد) اسی میں سے (دوبارہ) نکالے جاؤ گے۔

مزید وضاحت | سورہ اعراف کی آیات (۱۱ - ۲۵/۴) پر پھر غور کیجئے۔ ابتدا میں نوع انسانی
کی تخلیق کا ذکر ہے۔ (خَلَقْنَاكُمْ وَصَوَّرْنَاكُمْ) پھر آدم کے لئے سجدہ۔

اس کے بعد ابلیس کا انکار اور چیلنج۔ لیکن چیلنج کے مخاطب صرف آدم اور اس کی بیوی (تثنیہ) نہیں بلکہ
جمع کا صیغہ ہے (لَا قُعْدَنَ لَكُمْ شُمْ ۖ لَا تَتَّبِعُهُمْ ۖ خَلَفَهُمْ وَغَيْرُهُمْ) نہ صرف ابلیس، بلکہ خود
اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی جواب میں انسانوں کے متعلق جمع ہی کا صیغہ ہے (فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ
.....) اس کے بعد آدم اور اس کی بیوی کا ذکر ہے۔ جن کے لئے تثنیہ کا صیغہ آیا ہے لیکن آخر میں جہاں
مہبوط کا ذکر ہے وہاں پھر صیغہ جمع ہے (آیات ۲۲ - ۲۵) اس سے ظاہر ہے کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے)
قصہ آدم نوع انسانی کا تذکرہ ہے نہ کسی ایک میاں بیوی کی سرگذشت۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ سورہ بقرہ میں مہبوط کے بعد فرمایا تھا کہ اِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هَذِي (۲/۲۸)۔
سورہ اعراف میں بنی آدم کو خاص طور پر مخاطب کر کے کہا گیا ہے،

يٰۤاِبْنَیَّ اٰدَمَ اِمَّا يٰۤاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ
..... اُوْلٰئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۲۵ - ۲۶/۴)

اے بنی آدم! میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں گے اور وہ میرے قوانین تمہارے سامنے پیش
کریں گے۔ سو جو کوئی اپنے آپ کو ان قوانین کی حفاظت میں لے آئے گا اور (یوں) ان
اندر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا کر لے گا تو ان لوگوں کو کسی قسم کا
خوف اور غم نہیں ہوگا لیکن جو لوگ میرے قوانین کی تکذیب کریں گے اور ان سے سرکشی

اختیار کریں گے تو ان کی صلاحیتیں مجلس کر رہ جائیں گی اور وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے۔

اس سے واضح ہے کہ سورۃ بقرہ کی آیت (۲/۲۰) میں بھی بنی آدم ہی مقصود ہیں۔



سورۃ حجر میں اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں آئی ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ صَلٰٰصٰلٍ
مِّنْ حَبٍ مَّسْنُونٍ ۖ فَاِذَا سَوَّيْتُهُۥ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ
رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدٰٓيْنَ ۝ (۲۸-۱۵/۲۹)

اور جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں خیر لٹھے ہوئے کارے سے جو سوکھ کر بجھنے لگتا ہے بشر پیدا کرنے لگا ہوں۔ سو جب اُسے میں درست کر دوں (یعنی وہ تکمیل تک پہنچ جائے) اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے سامنے جھک جانا۔

یہاں کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہی کہ مسجد ملائکہ وہی بشر ہے جسے مٹی سے پیدا کیا تھا (اور جس کی تشریح سابقہ عنوان میں گزر چکی ہے) اس کے بعد انکار ابلیس کی سرگزشت ہے جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ (دیکھئے آیات ۳۰-۱۵/۴۴)۔ ان آیات میں بھی ضمائر کا استعمال قابل غور ہے۔ ابتدائیں بشر کا ذکر ہے اور ضمیر واحد غائب کی ہے۔ لیکن جب ابلیس چیلنج دیتا ہے تو ضمائر جمع غائب کی شروع ہو جاتی ہیں۔ جن سے واضح ہے کہ مقصود تمام نوز انسان ہے۔ اس باب میں سورۃ ص کے آیات (۷۱-۳۸/۸۵) بھی غور طلب ہیں۔ نیز آیات (۶۱-۱۴/۶۵) (۱۱۶-۲۰/۱۲۲)۔

جنت اور دنیا کی زندگی | اتنا سمجھ لینے کے بعد کہ یہ قصہ کسی خاص میاں بیوی کا نہیں بلکہ نوز انسانی کی سرگزشت ہے۔ ان مقامات کا صحیح مفہوم بھی

سمجھ لیجئے جنہیں قرآن کریم نے تشبیلی رنگ میں بیان کیا ہے۔ سب سے پہلے دیکھئے کہ اس میں جنت سے کیا مراد ہے؟ سورۃ بقرہ میں اس کے متعلق فرمایا تھا۔ فَاَكْلًا مِنْهَا رَغَدًا اٰحِيْثُ يَشْتُمُوْنَ (۲/۳۵)۔ اس میں سے جہاں سے جی چاہے با فراغت کھاؤ (بیو)۔ سورۃ طہ میں کہا اس میں نہ بھوک ہوگی نہ برہنگی نہ تشنگی نہ سورج کی مجلس دینے والی تپش (۱۱۸-۲۰/۱۱۹)۔ یعنی انسان کی طبعی زندگی کے لئے جس سامان

معیشت کی ضرورت ہے اس کی فراوانی۔ اور اس "جنت" سے باہر نکلنے کا نتیجہ کیا ہوا؟ اسی سامانِ معیشت (خوراک، لباس، مکان) کے حصول کے لئے سخت مشقت اٹھانی پڑی۔ یعنی وہ سامانِ نشوونما جو حیوانات تک کے لئے اس آسانی سے میسر آجاتا ہے انسان کو اس سامان کے حصول کے لئے بھی جانکاہ مشقتوں سے گزرنا پڑے گا۔ (فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَى) آدم جنت کی زندگی کھو بیٹھا۔ اور اسے ان تمام مشقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اب ان مشقتوں سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟ (فَمَنِ اتَّبَعَ هَذَا هِيَ فَلَا يَصِلُ وَلَا يَشْقَى) (۲۰/۱۲۳) جو اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کا اتباع کرے گا تو نہ تو اس کی محنت رائیگاں جائے گی اور نہ ہی وہ مشقت میں پڑے گا یعنی اُسے بھوک اور پیاس، تشنگی اور خستگی کے مصائب سے نجات مل جائے گی۔ اس کے برعکس:

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَ
نَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْيٰی ۝ (۲۰/۱۲۳)

جو میرے قوانین سے اعراض برتے گا تو اس کی معیشت تنگ کر دی جائے گی اور قیامت کے دن بھی وہ اندھا اٹھایا جائے گا۔

یعنی قوانینِ الہیہ کا لازمی نتیجہ خوش حالی اور اسبابِ معیشت کی فراوانی ہے۔ اس کے برعکس ذکرِ الہی سے اعراض اور روگردانی کا نتیجہ روزی کی تنگی ہے۔

اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ قصہ آدم میں "جنت کی زندگی" سے مراد فہرِ انسانی کی زندگی کا وہ ابتدائی دور ہے جس میں سامانِ رزق کی فراوانیاں تھیں۔ یعنی وہ دور جس میں ہنوز اس کی تمدنی زندگی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ علمائے انسان (ANTHROPOLOGISTS) کا کہنا ہے کہ زمانہ قبل از تمدن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انسان ملکیت کے لفظ سے نا آشنا تھا جس کا جہاں سے جی چاہتا سامانِ زیست لے لیتا۔ اس کے بعد اس کی تمدنی زندگی شروع ہوئی جس کا پہلا دور

لے لفظ آدم کا مادہ (ا-د-ہ) ہے اور اذمۃ کے معنی ہیں مل جل کر رہنے کی صلاحیت۔ چونکہ اس زمانہ کے ساتھ انسان کی ایک نئی زندگی (یعنی تمدنی زندگی) کا آغاز ہوا تھا اس لئے اس کے غائدہ کو تشلی انداز میں آدم کہا گیا۔

قبائلی زندگی کا تھا۔ یعنی اب نوع انسانی مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر الگ الگ ہو گئی۔ عربی زبان میں الگ الگ ہونے کو مشاجرت کہتے ہیں۔ اسی کا نام وہ شجر ہے جس کے قریب جانے سے انسان کو روکا گیا تھا۔ اس مشاجرت کا نتیجہ کیا ہوا؟ ارض (سامانِ معیشت یا رزق کے سرچشمے) مختلف لوگوں نے اپنی اپنی ملکیت میں لے لئے اور اس طرح وہی سامانِ زیست جو اس سے پہلے اس طرح فراوانی سے ملتا تھا اس کا حصول مشقت طلب ہو گیا۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) زندگی کا جعلی تقاضا ہے۔ کوئی فرد مرنا نہیں چاہتا۔ زندگی کا دار و مدار سامانِ رزق پر ہے اس لئے انسانی عقل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہر فرد زیادہ سے زیادہ سامانِ رزق اپنے لئے سمیٹ لے۔ اسی سے انفرادی زندگی کی وہ افراتفری شروع ہوتی ہے جو انسانی معاشرہ کو جہنم بنا دیتی ہے۔ حیوان صرف اپنا پیٹ بھرنا جانتا ہے۔ لیکن انسان کا پیٹ کبھی بھرتا ہی نہیں۔ وہ سمیٹنا چلا جاتا ہے۔ تا آنکہ اسے موت آ جاتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر بہت سے انسانوں نے ایک ہی جگہ رہنا ہو اور ان میں سے ہر ایک اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سمیٹنا شروع کر دے تو اس سے معاشرہ میں سخت ناہمواریاں پیدا ہونا شروع ہو جائیں گی۔ انفرادی عقل کا یہ تقاضا کہ دنیا میں سب کچھ میرے ہی لئے ہونا چاہیئے، المیس کہلاتا ہے۔ ملائکہ یعنی کائنات کی قوتیں (جن سے رزق پیدا ہوتا ہے) انسان کے تابع فرمان ہیں۔ وہ سب اس لئے سرگرم عمل ہیں کہ انسان کو نشو و نما کا سامان ملتا رہے۔ وہ سب اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں لیکن اس کی اپنی ہوس ہے کہ زندگی کے عالمگیر تصور کے خلاف سرکشی اختیار کرتی ہے وہ اپنے انفرادی مفاد کے مقابلے میں کسی اور کے مفاد کی کوئی جہنیت نہیں سمجھتی۔ یہ ہے المیسی کشمکش یعنی عالمگیر انسانیت کے مفاد اور ہر فرد کے ذاتی مفاد میں تضاد۔

اگر انفرادی مفاد کا دائرہ ایک فرد کی اپنی زندگی تک ہی محدود ہوتا، تو بھی اس کی حد مقرر ہو سکتی تھی۔ لیکن اپنے مفاد کے بعد انسان اپنی اولاد کے مفاد کا تحفظ شروع کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ وہ مرنے کے بعد اپنی اولاد کے ذریعے اپنا نام روشن رکھنا چاہتا ہے اور اس طرح اس حیاتِ جاوید کی ہوس پوری کر لیتا ہے جس سے طبعی موت نے اسے محروم کر دیا تھا۔ یہ ہے وہ جذبہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ المیس نے آدم کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ وہ اسے حیاتِ جاوید عطا کر دے گا۔ اور اس کا ذریعہ بتایا اولاد۔ یہ ہے مفہوم اس تمثیلی بیان کا جس میں کہا گیا ہے کہ اس حیاتِ جاوید کے حصول کی تمنا میں انسان کے جنسی ترغیبات کے

عنوان اُبھر کر سامنے آگئے۔

یہ ہے اس معاشرے کی تصویر جسے انسان نے اپنی تمدنی زندگی کے ساتھ شروع کیا اور جس نے رفتہ رفتہ اسے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا کہ کوئی فرد کسی دوسرے قریب نہ رہ سکا۔ ان میں انفرادی مفاد کی (WEDGES) اس طرح درانداز ہوئیں کہ گوشت سے ناخن جدا ہو گیا۔ یہ ہے آدم کا مہبوط۔ اس کا وہ تنزل جس میں یہ حیوانات کی سطح سے بھی نیچے گر گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا انسان کے لئے اس پستی سے نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے؟ قرآن اس کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان اپنے اس مقام سے اُبھر کر سطح انسانی پر آ سکتا ہے اور وہاں سے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا "اِقْطَارِ السَّمُوتِ وَ اَلْاَرْضِ" سے بھی آگے نکل سکتا ہے۔ (جیسا کہ ہم سابقہ عنوان میں دیکھ چکے ہیں) قرآن کہتا ہے کہ انسان کی زندگی فقط طبعی زندگی نہیں۔ زندگی کی اس سطح تک تو حیوان اور انسان دونوں مشترک ہیں۔ انسان کے اندر ایک اور چیز بھی ہے جسے قرآن نے "روح خداوندی" (الوہیاتی توانائی) کہہ کر پکارا ہے اور جسے ہماری اصطلاح میں آقا یا خودی یا انسانی ذات (یا) کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی طبعی ضروریات کا بھی تحفظ کرے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کا بھی تحفظ اور استحکام کرے۔ انسان کو حیاتِ جاویدہ طبعی جسم کی پرورش سے ملتی ہے اور نہ ہی اولاد کے ذریعے۔ اسے حیاتِ جاویدہ ملتی ہے اس کی ذات (خودی) کے استحکام سے۔ قرآن ایک ایسا نظام تجویز کرتا ہے جس میں انسانی جسم کی پرورش بھی بطریق احسن ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی ذات کا استحکام بھی ہوتا جاتا ہے۔ استحکام ذات کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ سے آگے بڑھ کر نوع انسانی کے مفادِ کلی اور عالمگیر رُبوبیت کا بھی انتظام کرے۔ اگر انسان اپنے معاشرے کو وحی کے مطابق متشکل کر لے تو اس سے اس کی یہ زندگی بھی جنت کی زندگی بن جاتی ہے اور اس کے بعد کی زندگی بھی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے، اس طرح انسان، تباہی اور بربادی کے عذاب سے بے خوف ہو جاتا ہے۔ اَوْخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَاَوْهُمْ يَخْزَوْنَ ۝

انسانی عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کے لئے اسباب و ذرائع فراہم کرتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس فیصلے کو ہم انسان کا اپنا فیصلہ کہتے ہیں وہ فیصلہ کس کا ہوتا ہے ظاہر ہے کہ انسان کے اندر ایک تو اس کی جبلت (INSTINCT) کے تقاضے ہیں۔ ان تقاضوں کو بھی انسان ہی کے فیصلے کہا جاتا ہے۔ مثلاً جب مجھے بھوک لگتی ہے تو میں اٹھتا ہوں کہ کہیں سے کچھ کھاؤں۔ غذا کا حصول میرا فیصلہ ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ درحقیقت میری جبلت کا تقاضا ہے جو میری حیوانی زندگی کی سطح پر ہے۔ میری عقل مجھے یہ بتاتی ہے کہ فلاں جگہ کھانے کا سامان رکھا ہے یا فلاں جگہ پیسے رکھے ہیں جن سے کھانا خریداجا سکتا ہے۔ عقل کا یہ کام نہیں کہ وہ بتائے کہ وہ کھانا جتنا بڑے یا ناجائز اور وہ پیسے مجھے لینے چاہئیں یا نہ لینے چاہئیں۔ چونکہ عقل کا کام جبلت کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے، اس لئے وہ عقل مجھے بار بار یہی کہے گی کہ اٹھ اور کھانا لے لے۔ جا اور پیسے لے آ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے سامنے ایک اور تقاضا آتا ہے اور وہ یہ کہ وہ کھانا حلال نہیں اس لئے مجھے نہیں کھانا چاہیئے۔ وہ پیسے میرے نہیں اس لئے مجھے نہیں لینے چاہئیں۔ اگر میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ پیسے مجھے چرا لینے چاہئیں تو میرا یہ فیصلہ عقل بے باک کے تابع ہو گیا۔ اسے ابلیسی فیصلہ کہیں گے۔ اگر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ نہیں جو کچھ میرے لئے ناجائز ہے مجھے وہ کبھی نہیں لینا چاہیئے، تو میرا یہ فیصلہ وحی کے تابع ہو گا جس نے جائز و ناجائز کی تمیز سکھائی ہے۔ اس فیصلے کے بعد میں عقل سے کہوں گا کہ وہ کوئی تدبیر سوچے جس سے مجھے حلال و طیب رزق مل سکے۔ اب جس روش پر عقل کام کرے گی اس کے متعلق کہیں گے کہ عقل وحی کی روشنی میں کام کر رہی ہے۔ اس کا نام ہے وحی کا اتباع۔ اگر ہم عقل بے باک کا اتباع کرتے جائیں گے تو شر شخص کی ساری تنگ دانا اس کے اپنے ذاتی مفاد (یا اپنی اولاد کے مفاد) کے تحفظ تک محدود رہے گی اور اس میں جائز و ناجائز کا کوئی سوال پیدا نہیں ہو گا۔ لیکن اگر ہم اسی عقل کو وحی کے تابع چلائیں گے تو اس سے تمام نوع انسانی کے مفاد کا تحفظ ہو گا اور انسانی جسم کے ساتھ ساتھ انسانی ذات کا استحکام بھی ہوتا جائے گا۔ پہلی روش ”آدم“ کو جنت سے نکلوا دیتی ہے اور دوسری روش اسے پھر سے جنت میں داخل کر دیتی ہے۔ یہ ہے قصہ آدم کی رویداد اور اس کا مقصود و غنتہی۔

تصریحات سابقہ سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ سجدہ ملائکہ اور انکار ابلیس وغیرہ کے تذکرہ میں آدم سے مراد خود انسان ہے۔ کوئی خاص فرد (INDIVIDUAL) نہیں۔ اور انسانوں کی ہر دو اصناف

(ذکور و اثاث) کا بیان ہے۔ اس لئے آدم درحقیقت نمائندہ آدمیت ہے نہ کہ کوئی خاص فرد۔
نبوت آدم | قرآن کریم میں اللہ ایک مقام پر آدم کا لفظ اس انداز سے بھی آیا ہے جو ”فرد واحد“ کے مفہوم کا حامل ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَ نُوحًا وَ آلَ إِبْرَاهِيمَ وَ آلَ
 عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ ذُرِّيَّتَهُمْ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۝ وَ اللَّهُ
 سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (۳۱-۳۳/۳)

یقیناً اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو ان کی ہم عصر اقوام پر
 فضیلت دی۔ ان میں سے ایک دوسرے کی نسل (میں سے) تھے۔ اور اللہ (سب کچھ)
 سننے والا، جاننے والا ہے۔

یہاں آدم کا ذکر حضرت نوحؑ کے ساتھ آیا ہے جس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس سے مفہوم
 کوئی خاص فرد ہے جو غالباً نبی تھا۔ اگرچہ اصطفیٰ کا لفظ قرآن کریم میں غیر نبی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے
 مثلاً حضرت مریمؑ کے متعلق فرمایا ہے،

وَ إِذْ قَالَتِ الْمَلَأِكَةُ يَمْرُؤُا إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَ طَهَّرَكِ
 وَ اصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ ۝ (۳۱/۳)

اور جب ملائکہ نے کہا کہ اے مریم! بے شک اللہ تجھے برگزیدہ اور مطہر بنانے والا ہے اور
 تجھے تمام اقوام کی عورتوں پر بزرگی عطا کرنے والا ہے۔

اور خود امت محمدیہ کے متعلق ہے۔

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ
 عِبَادِنَا ۝ (۲۲/۲۵)

پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث بنا دیا جنہیں اپنے بندوں میں سے برگزیدہ کیا تھا۔
 لیکن سورہ آل عمران کی متذکرہ بالا آیت (۲/۲۲) میں چونکہ آدم کا ذکر نوحؑ کے ساتھ آیا ہے اور دونوں کے
 لئے اصطفیٰ کا لفظ استعمال ہوا ہے اس لئے گمان غالب ہے کہ یہ آدم نبی تھے۔ اگرچہ قرآن کریم
 میں اس کی تائید میں کوئی نص صریح موجود نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آدم کسی نبی کا نام ہو جس کی ذریت کے

متعلق سورۃ مریم ہے :

أُولَئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَةِ
آدَمَ قَدْ..... عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَقِيلَ لَهُ (۱۹/۵۸)

یہ ہیں وہ لوگ (یعنی جن کا تذکرہ سابقہ آیات میں گزر چکا ہے) جو انبیاء میں سے ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا۔ آدم کی نسل میں سے اور ان کی نسل سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا۔ نیز ابراہیم اور اسماعیل کی نسل سے۔ اور ان گروہوں میں سے جنہیں ہم نے راہِ راست دکھائی اور منتخب کر لیا۔ (یہ وہ لوگ ہیں کہ جب خدا کے احکامات انہیں سنائے جاتے تھے تو ان کے سامنے جھک جاتے تھے اور ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔

لیکن جو قرآنی تصریحات گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہیں ان کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ سجدۂ ملائکہ وغیرہ کے قصہ کا آدم ایک فرد نہیں۔ یہ خود انسان کی سرگزشت ہے جسے قصے کے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اس تمثیل میں آدم کا لفظ غالباً اس رعایت سے لایا گیا ہے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعی کے اولین مراحل میں جن کا تعارف قرآن کریم نے کر لیا ہے۔ آدم نامی کسی شخصیت کو ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ لیکن اس تمثیل میں اس شخص کی ذات مراد نہیں ہے۔ (عربی زبان میں اِحْدٰی مُرْکَبِیْنِ کسی خاندان کے ایسے مثالی فرد کو کہتے ہیں جس سے اس قبیلہ کو پہچانا جاسکے)۔ علاوہ ازیں ایک نبی سے حکم خداوندی کی ایسی کھلی ہوئی خلاف ورزی ممکن نہیں جیسی اس تمثیل میں مذکور ہے۔ اور ابلیس اللہ کے بندوں پر کبھی غلبہ نہیں پاسکتا۔ سورۃ حجر میں ہے۔

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۲۷)

یقیناً میرے بندوں پر تجھے (کبھی) غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔

لہذا اگر قصہ زیرِ نظر کے آدم کوئی نبی تھے تو انہیں ابلیس کبھی نہیں پھسلا سکتا تھا۔ اس لئے تصریحات قرآنی کے مطابق جنت سے نکلنے والا آدم کوئی خاص فرد نہیں تھا۔ بلکہ انسانیت کا تمثیلی نمائندہ تھا جس کی ذریت سے مراد تمام نوعِ انسانی ہے نہ کہ کسی فردِ خاص کی نسلِ اولاد۔ یہی وہ نوعِ انسانی ہے جو ابلیسی قوتوں کے ساتھ قیامت کے لئے حریفانہ کشمکش میں ستیزہ کار ہے۔

قَالَ أَرَأَيْتَكَ هَذَا الَّذِي كَرَّمْت عَلَىٰ لَدُنَّ أَخْرَسِينَ إِلَى
يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَخْلُتَنِيَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (۱۷/۶۲)

«ابلیس نے کہا کہ ذرا اس پر غور تو فرما کہ تو نے اس (حقیر) ہستی کو مجھ پر بڑائی دے دی ہے۔ اگر تو مجھے قیامت کے لئے ہلکے دے دے تو میں اس کی ناک میں ٹیکل ڈال کر لئے لئے پھروں گا اور اس سے بہت تھوڑے لوگ بچ سکیں گے۔

ان تصریحات کی رو سے اس تمثیلی داستان کے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ ذہن سے اس تصور کو نکال دیں کہ یہ کسی سچ مچ کے واقعہ کا بیان ہے۔ یہ بیان (یعنی تمثیل) نہ کسی خاص زمانے سے متعلق ہے نہ کسی خاص مقام سے۔ یعنی یہ نہیں کہ آج سے پانچ دس ہزار سال پہلے اس زمین پر یا کہیں آسمانوں پر اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا تھا۔ ایسا نہیں بلکہ اس قصہ میں انسانی خصوصیات کو استعارہ کے رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔ (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس قصے میں) ملائکہ سے مراد کائنات کی قوتیں ہیں جنہیں خاص قوانین کے تابع سرگرم عمل رکھا گیا ہے ان قوانین کا نام قوانین فطرت (LAWS OF NATURE) ہے۔ ان قوانین کے علم سے انسان ان تمام قوتوں سے اپنے منشاء کے مطابق کام لے سکتا ہے۔ یہ سجدہ ملائکہ ہے۔ پھر اس زندگی کو جس میں انسان نے ہنوز "میری اور تیری" کی تفریقات پیدا نہیں کی تھیں اور جس میں ہر فرد جہاں سے جی چاہتا پیٹ بھر کر کھاپی سکتا تھا 'جنت' کی زندگی سے تعبیر کیا گیا۔ یہ جو انسانی تمدن سے پہلے کی زندگی تھی۔ اس کے بعد ایک طرف شعورِ خویش بیدار ہوا اور دوسری طرف مدنیت کی زندگی اختیار کرنے سے باہمی مفاد کا تصادم شروع ہو گیا۔ عقل جیلہ جو نے ہر فرد (یا ہر گروہ) کے دل میں اس کے اپنے مفاد کے تحفظ اور اس کی طبعی زندگی کی بعت کا جذبہ اتارا۔ یہ فریبِ ابلیس ہے اور اس کشمکش کی زندگی مہبوطِ آدم۔ اس کشمکش کی زندگی میں متصادم قوتوں پر غالب آنے کے لئے وحیِ آسمانی کی تائید و نصرت کی ضرورت ہے۔ یعنی علم و عقل کی رو سے کائنات کی تمام قوتوں کو مسخر کیا جائے (کہ اسی خصوصیت کی بناء پر آدم مسجود ملائکہ قرار پایا تھا)۔ اور پھر ان تمام قوتوں کو وحیِ آسمانی کی روشنی میں کام میں لایا جائے تاکہ اس سے نہ صرف طبعی زندگی عزت و تکریم سے گزرے بلکہ ثقائے ذات سے وہ حیاتِ جاوید حاصل ہو جس کے حصول کے لئے انسان نے عقل بے ہاک (ابلیس) کا فریب کھایا تھا۔ یہ وہ اندازِ زندگی ہے جس میں انسانی ذات صحیح نشوونما پا کر (جس کا ذریعہ عالمگیر ربوبیت ہے) حیاتِ جاوید کے قابل بن

جائی ہے اسے جنت کی زندگی کہا جاتا ہے۔ یہ اُن اعمال کی بدولت ملتی ہے جو انسان میں بقائے دوام کی صلاحیت پیدا کر دیں۔ یہ ہے انسان کا مثیلی بیان جسے قصۂ آدم کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔

خليفة في الارض کا مفہوم | جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں قصۂ آدم کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی ہے۔ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ

خَلِیْفَۃً۔ اس میں لفظ خَلِیْفَۃ تشریح طلب ہے۔ خلیفہ، خلف سے مشتق ہے جس کے معنی میں پیچھے آنا۔ لہذا خلیفہ کے معنی میں پیچھے آنے والا۔ جانشین (SUCCESSOR) اور خلافت، کے معنی میں جانشینی (SUCCESSOR)۔ خلیفۃ الرسول کے معنی میں رسول کا جانشین۔ استخلاف کے معنی میں جانشین بنانا۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں یہ لفظ ان معنوں میں آیا ہے۔ لیکن یہ بھی واضح ہے کہ جب کوئی قوم یا جماعت کسی سابق قوم یا جماعت کی جانشین ہوتی ہے تو اس میں ممکن و تسلط بھی داخل ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جانشینی سے مفہوم ہی یہ ہے کہ کسی قوم کو قوم یا سبق کی جگہ متمکن و مسلط کر دیا جائے۔ قرآن کریم میں استخلاف کا لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے۔

غلبہ و تسلط سے جانشینی | لہذا آدم (نوع انسانی) کے خلیفہ فی الارض سے مفہوم اپنے سے پہلی مخلوق کی جانشینی اور تسلط و تمکن اور قوت و غلبہ کے ساتھ جانشینی ہے۔ یہ کون سی مخلوق تھی جس کا جانشین انسان کو بنایا گیا تھا، اس کے متعلق سورۃ الحج میں ہے۔

وَالْجَانَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُومِ (۱۵/۲۷)

انسان سے پہلے ہم نے جان کو تیز آگ سے پیدا کیا۔

اس سے واضح ہے کہ انسانوں سے پہلے زمین میں کوئی اور مخلوق آباد تھی جو آبِ ناپید ہے۔ (تفصیل اس کی جنات کے عنوان میں ملے گی)۔ بہر حال آدم (انسان) اس مخلوق کا جانشین تھا۔

نیا بت | خلیفہ کا مفہوم آپ کے سامنے آگیا۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں عام طور پر جو عقیدہ مروج ہے کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا، یعنی خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ اس عقیدے کی کوئی

سند قرآن میں نہیں۔ اس لئے کہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں خلیفہ کے معنی ہیں کسی کا جانشین (SUCCESSOR) اس لئے خدا کا جانشین (SUCCESSOR) ہونا نہ صرف مضحکہ خیز بلکہ گمراہ کن تصور ہے۔ حضرت ابو بکر

صدیق خلیفہ الرسول (یعنی رسول اللہ کے جانشین تھے) خلیفہ اللہ (خدا کے جانشین) نہیں تھے۔ اگر خلیفہ کے معنی نائب یا قائم مقام لئے جائیں تو بھی انسان خدا کا نائب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ نیابت اس کی ہو سکتی ہے جو خود موجود نہ ہو۔ خدا ہر جگہ اور ہر مقام پر موجود ہے اس لئے اس کا نائب (REPR ESENTATIVE) ہونا کیا معنی؟ اسی نیابت کے غلط تصور نے ہمارے ہاں یہ عقیدہ پیدا کر دیا کہ خدا نے اپنے اختیارات انسان کو تفویض (DELEGATE) کر دیئے ہیں۔ یہ عقیدہ بھی یکسر غلط ہے۔ جو شخص اپنے اختیارات کسی اور کو تفویض (DELEGATE) کر دیتا ہے وہ اختیارات اس شخص کے پاس باقی نہیں رہتے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خدا نے اپنے بعض اختیارات انسان کو تفویض کر دیئے ہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اختیارات خدا کے پاس نہیں رہے اور وہ ان قوتوں سے عاری ہو گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی حیثیت نہ تو خدا کے خلیفہ (جانشین) کی ہے اور نہ ہی اس کے نائب (VICEGERENT) کی اور نہ ہی خدا نے اپنے اختیارات اسے تفویض کئے ہیں۔ خدا نے انسان کو (ایک محدود پیمانے کے اندر) اختیار و ارادہ دیا ہے۔ اگر وہ اپنے اختیار و ارادے کو وحی کی حدود کے اندر (قوانین خداوندی کے مطابق) استعمال کرے تو انسانی معاشرے میں صحیح توازن پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے انسانی ذات کی ایسی نشوونما ہو جاتی ہے جس سے وہ زندگی کے مراحل طے کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا اور اوپر کو اُٹھ جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ ان اختیارات کا استعمال اس طرح نہیں کرتا تو اس کے معاشرے میں ایسی ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں جو اسے جہنم بنا دیتی ہیں اور جس میں انسانی ذات کی تمام صلاحیتیں مجھل کر رہ جاتی ہیں۔

اسے پھر دہرایجئے کہ انسان دنیا میں کسی سابقہ مخلوق (سلسلہ ارتقاء کی سابقہ کڑی) کا جانشین (SUCCESSOR) ہے۔ خدا کا خلیفہ (جانشین) نہیں ہے۔ وہ خدا کے احکام کو دنیا میں نافذ کرنے پر مامور کیا گیا ہے۔ اور یہی اس کی صحیح یوزیشن ہے۔

باہمی عداوت ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ ”مہوڑ آدم“ کے وقت نسل انسانی سے کہہ دیا گیا کہ بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدَاوَةٌ ”حیات ارضی میں تم ایک دوسرے کے باہمی دشمن ہو گے۔ شیطان ہی چاہتا ہے۔ اس کے برعکس ہدایت خداوندی کی تعلیم اتحاد اور مودت، ایک جہتی دیکھ بھجی تمام نوع انسانی کی وحدت ہے۔ جو آسمانی تعلیم کا اتباع کریں گے ان میں تخریب و تشیع، اختلاف و تباہی

گروہ سازیاں اور فرقہ بندیاں نہیں ہوں گی۔ ان میں باہمی مداخلت و محنت ہوگی۔ وہ سب متحد اور یک جان ہوں گے۔ لیکن وحی خداوندی سے انحراف اور اشباع شیطانی کا نتیجہ باہمی اختلاط، قتل و خونریزی اور فساد و مناجرت ہوگا۔ چنانچہ سورہ مائدہ میں ”تمثیلی“ انداز میں دو بھائیوں کا قصہ بیان کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ قتل کی ابتدا کس طرح باہمی حسد سے ہوئی۔ ہے۔ (دیکھئے ۲۷-۵/۲۱)۔



سجدہ | گزشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو سجدہ کا حکم دیا۔ اور انہوں نے آدم کو سجدہ کیا۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ملائکہ نے آدم کے سامنے اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ دیا۔ سجدہ کے معنی جھکنے کے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ اقرار اطاعت کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ وہ سجدہ جس میں پیشانی زمین بوس ہو جاتی ہے۔ درحقیقت اقرار اطاعت ہی کی ایک محسوس شکل ہے۔ اس لئے قصہ آدم میں ملائکہ کے سجدہ سے مراد اقرار اطاعت ہے۔ سورہ رعد میں ہے۔

وَاللَّهُ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَ
ظُلْمًا لَهُم بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ ۝ (۱۳/۱۵)

اور پستیوں اور بلند یوں میں جو کچھ ہے سب خدا (کے قوانین) کے آگے جھکا ہوا ہے۔
خوشی سے ہو یا مجبوری سے۔ اور (دیکھو) ان کے سامنے صبح و شام کس طرح گھٹتے، بڑھتے
اور اُدھر اُدھر ہوتے رہتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ایک خاص نظام
کے ماتحت واقع ہو رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس سے مفہوم اطاعت کوشی کا عملی اعتراف و اقرار ہے۔ اس مفہوم کی وضاحت سورہ نحل میں یوں کر دی گئی۔

وَاللَّهُ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ
وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ قَوْلِهِمْ
وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ۝ (۱۶/۵۰-۴۹)

اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جتنے ذی حیات ہیں سب اللہ (کے قوانین) کے
آگے سرسجود ہیں اور ملائکہ بھی وہ (بھی) سرکشی نہیں اختیار کر سکتے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ملائکہ کے سجدے سے مراد اقرارِ اطاعت ہے۔ یعنی کائناتی قوتیں انسان کے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہیں جن سے یہ اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا ہے۔



تورات اور قصہ آدم | بائبل (عہدِ عتیق) میں بھی قصہ آدم مذکور ہے لیکن اس کی اور قرآنِ کریم کی بیان کردہ تفصیل میں جو تین فرق ہے وہ انسانی ہاتھوں سے مسخ شدہ تعلیم اور خالص آسمانی تعلیم کی ایک زندہ شہادت ہے (اور یہ شہادت آپ کو آئندہ اوراق میں اکثر و بیشتر ملے گی۔ سب سے پہلے بائبل میں مذکور ہے کہ:-

”خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔“ (تورات کتابِ پیدائش ۱:۲۶)

تخلیقِ انسانی کے متعلق قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۹۵/۴)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین متوازن ہیئت میں پیدا کیا۔

نگار خانہ کائنات میں انسانی تخلیق بلاشبہ فطرت کا شاہکار ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ خدا نے اسے اپنی صورت پر پیدا کیا اس حُسنِ ازل کو (جس کا تصور بھی حیطہٴ انسانی سے باہر ہے) اس کے بلند و بالا مقام سے کھینچ کر بہت نیچے لے آتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ ارشادِ خداوندی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ تصور ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے جس نے جذبہٴ خود ستائی سے سرشار ہو کر اتنا بھی نہیں سوچا کہ اپنی نسبت کہاں ملا رہا ہے؟ اور نہ ہی یہ کہ اس عقیدہ سے خدا کے متعلق ذہنِ انسانی میں کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

(۲۱) جنتِ آدم کے متعلق ہے۔

اور خداوند خدا نے عدن میں پورب کی طرف ایک باغ لگایا اور آدم کو جسے اُس نے بنایا تھا وہاں رکھا اور خداوند خدا نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوش نما اور کھانے میں خوب تھا اور باغ کے بیجوں بیج حیات کے درخت اور نیک و بد کی پہچان کے درخت کو زمین سے اگایا۔ اور عدن سے ایک ندی باغ کے سیراب کرنے کو نکلی اور وہاں سے تقسیم ہو کر چار سرے نہروں کے بنی۔ پہلی کا نام فیسوں جو حویلیہ کی ساری زمین کو گھیرتی ہے۔ وہاں سونا ہوتا ہے اور اس زمین کا سونا اچھا ہے۔ اور وہاں موتی اور بلور بھی ہیں اور دوسری نہر کا نام جیحون

ہے جو کوش کی ساری زمین کو گھیرتی ہے۔ اور تیسری نہر کا نام دجلہ ہے جو اسور کے پورب

جاتی ہے اور چوتھی نہر کا نام ذات ہے۔ (پیدائش ۲/۱۲)

قرآن نے انسان کو گزشت کو تمثیلی رنگ میں بیان کیا ہے اس لئے اس میں کسی مقام کا نام نہیں لیا گیا کیونکہ اس طرح وہ تمثیل نہ رہتی تاریخ کا ایک واقعہ بن جاتی۔

(۳) شجر ممنوعہ کے متعلق لکھا ہے :-

اور خداوند خدا نے آدم کو لے کر باغ عدن میں رکھا کہ اس کی باغبانی اور نگہبانی کرے۔

اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دے کر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھا یا کر لیکن نیک

و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا کیونکہ جس دن تو اسے کھائے گا ضرور مرے گا۔

(پیدائش ۱۶-۱۷/۲)

انسان کو نیک و بد کی پہچان وحی کے ذریعے کرائی جانی مقصود تھی۔ لہذا اس شجر کے قریب آنے سے منع کرنے کے کیا معنی؟

(۴) آدم کی بیوی کی پیدائش کے متعلق لکھا ہے :-

اور خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں

سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے جو

اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا۔ اور آدم نے کہا کہ اب یہ

میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور گوشت میں سے گوشت ہے۔ اس سبب سے وہ ناری

کہلائے گی۔ کیونکہ وہ نہ سے نکالی گئی۔ اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور

اپنی جوڑو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔ اور وہ دونوں آدم اور اس کی جوڑ

ننگے تھے اور شرائے نہ تھے۔ (پیدائش ۲۱-۲۵/۲)

اس کے بعد یہ مذکور ہے کہ کس طرح سانپ نے (ابلیس نے نہیں بلکہ سانپ نے) اس عورت کو بہکایا اور

اس نے شجر ممنوعہ کا پھل خود بھی کھا یا اور اپنے خاوند کو بھی کھلا دیا۔ اس کے بعد :-

اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سنی۔ اور آدم اور

اس کی جوڑو نے آپ کو خداوند خدا کے سامنے سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب

خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے۔ وہ بولا کہ میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور ڈرا کیونکہ میں نشکا ہوں۔ اس لئے میں نے اپنے آپ کو چھپایا۔ اور اس نے کہا کہ تجھے کس نے جتایا کہ تو نشکا ہے؟ کیا تو نے اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم کیا تھا کہ اسے نہ کھانا؟ آدم نے کہا کہ اس عورت نے جسے تو نے میری ساتھی کر دیا مجھے اس درخت سے دیا اور میں نے کھایا۔ تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ عورت بولی کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا۔

(پیدائش ۸ - ۳/۱۳)

چنانچہ اس جرم کی پاداش میں:

اس نے (یعنی خداوند خدا نے) عورت سے کہا کہ میں تیرے حمل میں تیرے درد کو بہت بڑھاؤں گا اور درد سے تو لڑکے جنے گی اور اپنے خصم کی طرف تیرا شوق ہوگا اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔

(پیدائش ۳/۱۶)

اور آدم سے کہا کہ:

اس واسطے کہ تو نے اپنی جو رو کی بات سنی اور اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم کیا کہ اس سے مت کھانا۔ زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا اور وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹ کٹاراگا اگائے گی اور تو کھیت کی نبات کھائے گا۔

اس کے بعد مذکور ہے کہ

اور خداوند خدا نے کہا۔ دیکھو کہ انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اور اب ایسا نہ ہو کہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے اور کچھ کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لئے خداوند خدا نے اس باغ کو عدن سے باہر کر دیا۔ تاکہ وہ زمین کی جس میں سے وہ لیا گیا تھا کھیتی کرے۔ چنانچہ اس نے آدم کو نکال دیا اور باغ عدن کی پورب کی طرف کروبیوں کو چمکتی تلوار کے ساتھ جو چاروں طرف پھرتی تھی مقرر کیا کہ درخت حیات کی راہ کی نگہبانی کریں۔

(پیدائش ۲۲ - ۳/۲۳)

آپ نے غور فرمایا کہ اس قصہ کی مذکورہ صدر تفصیل میں کس طرح زمین کی پستی اور خاک کی کثافت جھلک رہی ہے یہ چیز بھی خاص طور پر قابل غور ہے کہ تورات میں عورت کو مجرم قرار دیا گیا ہے کہ وہی سانپ کے فریب میں آئی اور اس نے پھر اپنے خاوند کو بھی بہکایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے نزدیک عورت ایک ایسی جنس ملعون ہے جسے شرف انسانیت سے کچھ علاقہ نہیں۔ عیسائیت کے اربابِ حل و عقد میں چھٹی صدی عیسوی تک یہ مسئلہ نہایت متانت و سنجیدگی سے مرکزِ بحث و تمحیص رہا کہ عورت میں روح انسانی ہوتی ہے یا نہیں۔ بڑے بڑے بزرگانِ کلیسا عورت کو فریب کا مجسمہ اور دنیا کی تمام تکالیف و مصائب کا سرچشمہ قرار دیتے رہے۔ (ST. HEVONYMUS) کا قول ہے کہ "عورت شیطان کا دروازہ، برائیوں کی راہ اور بچھو کا ڈنک ہے؛ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت میں متاثر زندگی مذہبی تقدس و روحانیت کے مانع ہے۔ عیسائیوں کے قانون کی رُو سے سوسائٹی میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کی انفرادیت تک بھی تسلیم نہیں کی جاتی۔ ہندو دھرم میں بھی عورت کی یہی حالت ہے۔ منوسمرتی میں ہے۔

کسی لڑکی، جوان عورت یا بڑھیا کو خواہ اپنے ہی گھر میں کیوں نہ ہو کوئی کام بھی اپنی مرضی کے مطابق نہیں کرنا چاہیئے۔ بچپن میں لڑکی کو اپنے باپ کی مرضی کے تابع رہنا چاہیئے جوانی میں اپنے خاوند کی۔ اور اگر خاوند کی موت ہو جائے تو اپنے لڑکے کی مرضی کے ماتحت۔ عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کبھی بھی اپنی مرضی، رت سکے، حتیٰ کہ خرچ اخراجات میں بھی اسے کوئی اختیار نہیں ہونا چاہیئے۔

(THE BIBLE OF THE WORLD, P-81)

ملکیت کے معاملہ میں فیصلہ یہ ہے کہ

ہیوی لڑکے اور غلام کی اپنی جائیداد کوئی نہیں۔ پس جو کچھ ان کا ہے وہ ان کے مالک کا

(ایضاً صفحہ ۸۴)

ہے۔

چنانچہ ہندو سوسائٹی میں لڑکیوں کو دان (خیرات) دیا جاتا ہے۔ بطور استحقاق انہیں کچھ نہیں مل سکتا۔ لیکن قصہ آدم میں قرآن کریم میں تنہا عورت کو مجرم نہیں ٹھہرایا۔ اُس نے کہا کہ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ اُن دونوں کو شیطان نے بہکایا اس لئے کہ یہ انسان کی کیفیات کا بیان ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انسانی کیفیت مرد و عورت دونوں میں موجود ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے عورت کو محض عورت ہونے کے اعتبار سے مجرم و معصوم

قرار نہیں دیا۔ (اسلام میں عورت کی کیا حیثیت ہے اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں فقط اتنا ہی دیکھتے کہ قرآن نے معصیتِ آدم کا باعث عورت کو قرار نہیں دیا)۔

یہ ہے بائبل اور قرآنِ کریم میں بیان شدہ قصہٴ آدم کی تفصیل کا بدیہی فرق۔ بائبل میں ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کس طرح (معاذ اللہ) خدا کو یہ خطرہ پیدا گیا کہ کہیں آدم نیکی و بدی کی پہچان کے درخت کی طرح شجرِ حیات سے بھی نہ کچھ کھالے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لئے خدا نے اسے جنتِ عدن سے باہر نکال دیا۔ لیکن اس سے بھی کچھ نہ بنا اور اللہ میاں (معاذ اللہ) تخلیقِ آدم کے اپنے اس فعل پر پشیمان ہی رہا۔ لیکن اس پیدائش کے بابِ ششم کی پانچویں سے آٹھویں آیت میں ہے۔

اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی ہے اور اس کے دل کے تصور اور خیال روز بروز صرف بدی ہی ہوتے ہیں۔ تب خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتاؤ اور نہایت دل گیر ہوا۔ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا روئے زمین پر سے مٹا دوں گا۔ انسان کو بھی حیوان کو بھی اور کیڑے مکوڑے اور آسمان کے پرندوں تک۔ کیونکہ ان کے بنانے سے پچھتاؤ ہوں۔ مگر نوح پر خداوند نے مہربانی سے نظر کی۔ یہ حقائق کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔

○

قصہٴ آدم کی حکمت بالغہ

قصہٴ آدم کی قرآنی تفصیل آپ کے سامنے آگئیں۔ لیکن آگے بڑھنے سے پیشتر ایک مرتبہ اس پر نگہ باز گشت ڈالتے اور دیکھتے کہ یہ قصہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آدم کی جنت کی زندگی سے نوحِ انسانی کو یہ بتا دیا گیا ہے کہ تمہاری منزل مقصود جسے تمہیں رزمگاہِ حیات میں مسلسل سعی و عمل سے حاصل کرنا ہے۔

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۳﴾

اور یہ ہے وہ جنت جس کا تمہیں تمہارے اعمال کی بدولت وارث بنایا گیا ہے۔

اس منتہی کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر اگر ان کے سفرِ حیات کی ابتدا کرائی گئی۔ یہ نقطہ آغاز ہے۔ اس کے

بعد ہے مہبوطِ آدم یعنی سلسلہ ارتقار کی اس اولین کڑی (سب سے پہلی منزل) سے انسانیت نے اُبھرنا شروع کیا اور برابر اُبھرتی چلی جا رہی ہے۔ زمانہ کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ستیزہ گاہ جہان میں طاغوتی قوتوں سے مقابلہ سخت ہے۔ انسانی معاشرہ میں بالعموم ان ہی قوتوں کا اثر غالب نظر آتا ہے لیکن بایں ہمہ اگر آپ ہر گاہِ تعمق غور کریں گے تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی کہ انسانیت من حیث الکل وحی کی تعلیم کے قریب آتی چلی جا رہی ہے اور تمنا شاید کہ اس کا جو قدم آگے اٹھتا ہے آگ اور خون کے ان چھینٹوں سے ٹکراتا ہوا اٹھتا ہے جسے ملائکہ کی نگاہوں نے خمیرِ آدم میں بھانپا تھا۔ انسان کے خود قائم کردہ نظام کی سب سے مہیب لعنتیں کیا ہیں؛ ملوکیت، استعماریت، برہمنیت، غلامی، سرمایہ داری، قومیت پرستی (جس میں امتیازِ رنگ و نسل و خون کی سب خباثتیں شامل ہیں) اور مفاد پرستی (جس میں سرمایہ داری، زمین داری، اجارہ داری وغیرہ کی خون آشام جونکیں سب شامل ہیں)۔ دنیا کی تاریخ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ انسان کس طرح ٹھوکریں کھا کھا کر ان لعنتوں سے تنگ آ رہا ہے اور آہستہ آہستہ انہیں دُور کرتا چلا جا رہا ہے۔ اوروں بتدیج غیر شعوری طور پر (بلا اعتراف) قرآنی حقائق کے قریب آتا جا رہا ہے۔ ذرا انقلابِ فرانس کو دیکھئے کہ جب انسانیت خون کے اس سیلاب میں ڈوب کر اُبھری ہے، تو کس طرح شاہنشاہیت (شخصی حکومت کے بنیادی تصور) کے خلاف جذبہ بغادت لے کر آگے بڑھی ہے۔

انسانی ہیئتِ اجتماعی کے ارتقائی مراحل

وہ شاہنشاہیت جو انسانیت کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر چکی تھی کہ گویا ان کی زندگی کا جزو ہے۔ شاہنشاہ دنیا میں خدا کا سایہ (ظَلُّ اللہ) برہما کا اذکار، آسمانی برکات کا حامل، شہنشاہِ الہیہ کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ اس کی پرستش ہوتی تھی۔ بادشاہ کے بغیر کوئی نظامِ حکومت انسان کے تصور میں نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس ایک انقلاب کی بھرپوری ہوئی آگ نے ان تمام تصورات کو بھسم کر کے رکھ دیا اور اس کی جگہ اس نئے تصور نے لے لی کہ حکومت منشاء عام (GENERAL WILL OF THE PEOPLE)

کے مطابق قائم ہونی چاہیے۔ دنیا میں آج جمہوریت کے جس قدر چرچے ہیں اسی تصور کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دنیا ہنوز اس صحیح تصور تک نہیں پہنچ سکی جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ لیکن بایں ہمہ ملوکیت

لے آپ نے عام طور پر سطح میں لوگوں کو کہتے سنا ہو گا کہ "اسلام جمہوریت کا مذہب ہے"۔ اور اس سے ان کی مراد مغرب

کا خواب تو پریشان ہو چکا۔ اس کا مقدس بُت تو پاش پاش ہو گیا۔ تخریب کی منزل (داویٰ لاء) کچھ تو طے ہو گئی۔ انسانیت کا ایک قدم تو آگے بڑھا۔

پھر ذرا امریکہ کی اس جدوجہد کی داستان پر چھپلتی ہوئی نگاہ ڈالتے جو انسدادِ غلامی کے لئے معرضِ جو میں آئی۔ جب سے انسان نے آنکھ کھولی تھی غلامی انسانی حیاتِ اجتماعیہ کا جزوِ لاینفک نظر آتی تھی۔ دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہ تھا جس میں غلامی کا رواج نہ ہو اور یہ تصور کچھ جہالت و وحشت ہی سے متعلق نہ تھا بلکہ بڑے بڑے اربابِ علم و حکمت بھی اس کے جواز (بلکہ اہمیت) کے قائل تھے۔ حکمتِ یونان میں دیکھئے کس طرح فلاطون و ارسطو غلامی کے جواز و ضرورت میں دلیل پر دلیل لاتے نظر آرہے ہیں۔ اگرچہ امریکہ (اور اس کے ساتھ انگلستان) نے غلامی کی ایک محسوس شکل کو مٹایا ہے اور ابض و احمر میں جو تین امتیاز وہاں آج تک کارفرما ہے اس کی رُو سے وہ غلامی کی رُوح کو نہیں مٹا سکے۔ بایں ہمہ انسانوں کی بیع و شری کی لغت کا نیکہ تو انسانیت کے ماتھے سے دُھل گیا۔

اور پہلی عالمگیر جنگ کے بعد اس عظیم الشان انقلاب پر نگاہ ڈالتے جو نظامِ سرایہ پرستی کے خلاف

(گذشتہ صفحہ کا لقیہٹ نوٹ) کے نظامِ جمہوریت سے ہوتی ہے حالانکہ وہ نہیں سمجھتے کہ مغرب کے نظامِ جمہوریت اور قرآنی نظامِ حکومت میں اساسی اور بنیادی اختلاف ہے۔ مغربی نظام میں ملوکیت ہو یا آمریت، جمہوریت ہو یا عمویت، ہر ایک نظام اس اساس پر مبنی ہے کہ اقتدار و حاکمیت کا حق انسانوں کو حاصل ہے۔ ایک انسان کو یا انسانوں کی کسی جماعت کو اس کے برعکس قرآنی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ حاکمیت و اقتدار کا حق خدا کے سوا اور کسی کو نہیں۔ لہذا مغرب کا نظام جمہوریت بھی قرآنِ کریم کے نزدیک ایسا ہی مردود ہے جیسا کوئی اور نظام۔ قرآن ”طرزِ حکومت“ سے بحث نہیں کرتا بلکہ اس اصول سے بحث کرتا ہے کہ انسانوں پر حکومت کا حق کسے حاصل ہے؟ اور اس کا جواب صرف ایک ہے کہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے

حکمران ہے اک وہی باقی بستانِ آذری

اور یہ ”خدا کی حکمرانی“ سے مراد ہے اس کی کتاب کی حکمرانی۔ اسلامی مملکت قرآنی احکام و قوانین کے نفاذ کا ذریعہ ہوتی ہے اور بس۔

روس میں رونما ہوا۔ ہر چند روس اپنے تشدد (لا) کے طوفانوں میں انتہا تک جا پہنچا۔ اور ردِ عمل میں اعتدال کی راہ سے بہت دور نکل گیا۔ لیکن وہ سرمایہ داری جو شجرِ انسانیت سے اکاس بیل کی طرح لپٹ رہی تھی اور جس نے انسانوں کی ہڈیوں کے گودے تک سے زندگی کی رمت پھوڑ لی تھی۔ اس کے خلاف تو ایک فضا پیدا ہو گئی۔

ادھر ہندوستان میں دیکھنے والوں کی تقسیم کس طرح انسانوں کو پیدائشی امتیازات کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھی۔ یہ وہ تقسیم تھی جسے مذہبی تقدس کی سند حاصل تھی اور جو قرنہا قرن سے ہندو تمدن کی اساس و بنیاد قرار پائے چلی آرہی تھی۔ آپ نے دیکھا کہ جنگِ عظیم کے بعد انسانوں کی اس تقسیم کے خلاف یہاں کیسی فضا پیدا ہوئی۔ ہر چند صدیوں سے رگ و پلے میں سرایت شدہ جراثیم ایک ہی دھچکے سے نہیں نکل جایا کرتے۔ لیکن اس قصرِ ”مقدس“ کی بنیادیں تو متزلزل ہو گئیں جو اس تقسیم کے لئے قلعہ کی سی حفاظت کا کام دے رہا تھا۔ اسی طرح برہمنیت (PRIESTHOOD) کو لیجئے جس کے بغیر دنیا میں مذہب کا تصور ہی ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس لعنت کے خلاف لوگوں نے آواز اٹھائی اور آج دنیا کے قریب قریب ہر مذہب ملک سے یہ خباثت ختم ہو گئی ہے (یا ختم ہو رہی ہے) آپ نے دیکھا کہ اس باب میں بھی دنیا کس طرح قرآن کے قریب آتی جا رہی ہے۔ اس کے بعد دوسری جنگِ عظیم کو دیکھئے۔

قومیت پرستی کی وہ لعنت جس نے یورپ کو سچ مچ جہنم بنا رکھا ہے محسوس طور پر اقوامِ مغرب کے سامنے آچکی ہے اور جنگ کے بعد جس نظامِ جدید کے تصورات بدترین یورپ کی آنکھوں کے سامنے دھند سے نقوش کی صورت میں تشکل ہو رہے ہیں اس کی بنیاد اس اصول پر رکھی جا رہی ہے کہ ساری دنیا کو نوعِ انسانی کی برادری تصور کر کے ایک عالمگیر وفاق (WORLD FEDERATION) کا نظام قائم کیا جائے۔ (مزید تصریحات وحی کے عنوان **دنیا کس طرح قرآن کے قریب آرہی ہے** میں ملیں گی)۔ آپ نے غور فرمایا کہ دنیا کس طرح ٹھوکریں کھا کھا کر قرآنی نظام کے قریب آتی جا رہی ہے؟ اس لئے کہ قرآنی تعلیم کے اصول غیر محسوس طور پر فضائے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اور ذہنِ انسانی ان سے غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اگر

یورپ اپنی ضد کو چھوڑ کر براہ راست قرآن کی طرف آجاتا تو پھر دیکھتا کہ اس کا یہ جہنم کس طرح جنت ارضی میں تبدیل ہو جاتا ہے؟ لیکن اس کے برعکس ذرا "عالم اسلام" (یعنی مسلمانوں کے ممالک) پر غور کیجئے اور دیکھئے

لیکن خود مسلمان

کہ نظام اجتماعی کی وہ تمام لعنتیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور جنہیں مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا کس طرح ایک ایک کر کے ان کے نظام زندگی میں داخل اور ان کے اعصاب پر مسلط ہیں۔ کیا قیامت ہے کہ آج دنیا میں ملوکیت کی سب سے بڑی لعنت آپ کو ممالک "اسلامیہ" میں مسلط نظر آتی ہے! اور آگے بڑھتے آج اس صفحہ ارض پر اگر کہیں انسان حیوانوں کی طرح سخاس میں آکر بکتے ہیں تو وہ مکہ کی گلیاں ہیں (ہر چند اس حقیقت کے اظہار سے ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ لیکن حقیقت سے چشم پوشی بھی کس طرح کی جاسکتی ہے؟) سرمایہ داری کی لعنت مسلمانوں کے ہاں عام طور پر موجود ہے۔ ذات پات کی تقسیم ان کی معاشرت کا جزو اعظم ہے۔ قومیت پرستی

(NATIONALISM) ان کی سیاست کا عروہ الوثقی ہے حب الوطن کو من الایمان ان ہی کے یہاں قرار دیا جاتا ہے اور اس دیدہ دلیری کے ساتھ کہ اس دور جاہلیت کے تصور کو منسوب کیا جاتا ہے اس ذات اقدس و اعظم کی طرف جو وطن پرستی کے طاغوت کو پاش پاش کرنے کے لئے مبعوث ہوئی۔ برہنیت ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے اور زندگی کے کسی شعبہ میں یہ ان "مقدس زنجیروں" سے آزاد نہیں۔ سوچا آپ نے کہ وہ تمام لعنتیں جنہیں آج کفار اپنے ہاں سے یا تو دور کر چکے ہیں اور یا دور کرنے کی فکر میں ہیں کس طرح مسلمانوں کے اعماق قلب میں جاگزیں ہیں اور ان سے نفرت اور سرکشی کے آثار کہیں نہیں دکھائی دیتے یہ سب اس لئے کہ

در ایام او نہ مے دیدم نہ ورد	بندہ مومن ز قسراں برنخورد
خود سر تخت ملوکیت نشست	خو و طاسم قیصر و کسری شکست
وین او نقش ملوکیت گرفت	تا نہ بال سلطنت قوت گرفت

از ملوکیت نگہ گرد و دگر
عقل و ہوش و رسم و رہ گرد و دگر

لے سنا ہے کہ اب وہاں سے بھی یہ لعنت ختم ہو گئی ہے۔

قصہ آدم اور ملت اسلامیہ | ان حقائق کو سامنے رکھتے اور ایک بار پھر قصہ آدم پر نگاہ ڈالنے
 مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ مَعَهُ نَے اس خطہ ارض پر
 قرآنی حکومت کا نظام قائم کر کے اس جنت کا نمونہ دکھایا جو انسانیت کا منتہی ہے۔ اس کے بعد مہبوط آدم ہوا۔
 یعنی مسلمانوں نے قرآنی نظام کو الگ کر دیا اور اس جنت سے نکل کر جسے اس نظام نے قائم کیا تھا یہ بھی
 دوسرے انسانی کی طرح حیوانی زندگی کی سطح پر آ گئے اب یہ تیرہ سو برس سے ٹھوکریں کھا رہے ہیں (اور ان
 کے ساتھ ساری دنیا ان ہی ٹھوکروں میں مبتلا ہے) اور اس فردوسِ گم گشتہ کی بازیابی کے لئے ٹرپ رہے
 ہیں، جسے چشمِ فلک نے ایک بار دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کے لئے سرگرداں ہے۔ جب انسان چاروں طرف سے
 ہار خٹک کر قرآن کی طرف آجائے گا تو پھر اس مقام کو ہالے گا جس کی تلاش میں یہ مارا مارا پھیر رہا ہے۔ اس وقت
 آواز آئے گی کہ

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ ۝ وَ
 تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ اُورِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ (۷۰-۷۱/۴۳)
 تم اور تمہارے رفقاء جنت میں داخل ہو جاؤ خوش و خرم یہ (مستروں کے چھلکتے ہوئے)
 ساغرِ سبعیں و زریں کا دور ہو گا۔ جو کچھ نفس (انسانی ذات) کو مطلوب ہو گا سب کچھ ملے گا۔
 (دل کی آرزوئیں) اور آنکھوں کی ٹھنڈک اس جنت میں تم رہو گے۔ یہ ہے وہ جنت جس
 کے تم اپنے اعمال کی بدولت وارث بنائے گئے ہو۔



خلاصہٴ مبحث | خاک کے ذرات، ارتقائی منازل طے کر کے صورتِ انسانی میں متشکل ہوئے۔
 انسان اپنی نیم حیوانی اور نیم انسانی زندگی کے مراحل طے کر کے اس مقام تک پہنچا
 جہاں اسے آپس میں مل جل کر رہنا تھا۔ اس معاشرتی زندگی کا پہلا دور وہ تھا جس میں انسان نے ہنوز رزق کے
 سرچشموں پر انفرادی ملکیت کا سبق نہیں سیکھا تھا۔ ہر انسان جہاں سے جی چاہے با فراغت کھا پی سکتا
 تھا۔ اس کے بعد اس نے انفرادی ملکیت کا تصور پیدا کیا جس سے ان کے مفاد میں تصادم شروع ہو گیا۔ یہاں
 سے کش مکش حیات کی ابتدا ہوئی۔ قرآن کریم نے انسانی تمدن کے ان ماجریات و کیفیات کو نمیشلی انداز
 میں بیان کیا ہے جسے قصہٴ آدم کہتے ہیں۔ آدم آدمیت کا نمائندہ ہے۔ آدم کو اختیار و ارادہ کی خصوصیت

دی گئی ہے اسے علم الاشیاء عطا کیا گیا ہے۔ کائنات کی تمام ملکوتی قوتیں اس کے تابع فرمان کر دی گئی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کشمکش زندگی میں متصادم و متخالف المیسی قوتیں بھی ہیں۔ ان میں خود انسان کے بیباک جذبات بھی شامل ہیں اور معاشرہ کے مستبد طاغوتی ارباب اقتدار بھی۔ انسان کا فریضہ زندگی یہ ہے کہ کائنات کی تمام قوتوں کو تابع فرمان بنائے۔ پھر ان قوتوں کے حاصل کو وحی آسمانی کی روشنی میں صحیح مصرف میں لا کر ایسا نظام قائم کرے جس میں تمام نوع انسانی کی ضروریات زندگی بلا مشقت و تردد پوری ہوتی جائیں اور جملہ افراد انسانہ کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پا کر تکمیل تک پہنچتی جائیں اور اس طرح اپنے مہبوط کے بعد صعود و عروج کی تمام منازل طے کر کے پھر وہ مقام رفعت و بلندی حاصل کر لے جو اسے شروع میں بطور اس کے ملتی کے دکھایا گیا تھا۔

پھر ملت اسلامیہ کی تاریخ بھی قصہ آدم کی سی داستان ہے۔ حضور ختمی مرتبت نے دنیا میں حکومت قرآنی کے قیام سے دکھا دیا کہ اس دنیا میں انسان کا نصب العین حیات کس قسم کی جنت کی زندگی ہے۔ اس کے بعد مہبوط ہوا۔ اور سخت ترین قسم کا مہبوط ہوا۔ ابھی تک یہ اس مہبوط کے زخموں کی مرہم پٹی میں مصروف ہے۔ جب اس کے زخم مندمل ہوں گے تو پھر آگے بڑھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی اور اس طرح اس کے اعمال کی بدولت وہ جنت ارضی حاصل ہوگی جس کی جھلک چودہ سو سال پیشتر دکھائی گئی تھی۔ وہ جنت ارضی جس کی حدیں اُخروی جنت سے جا کر مل جاتی ہیں کیونکہ زندگی جوئے رواں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابتدائے آفرینش کے سوال کی طرح تخلیق انسانی کے آغاز کا مسئلہ بھی ارباب مذاہب اور اہل فکر کے لئے ہمیشہ جذبہ کاوش رہا ہے۔ (وحی کو چھوڑ کر) مذاہب عالم کے پاس چونکہ سرمایہ علم محض توہم پرستی ہے اس لئے ان میں انسانی تخلیق کے مسئلہ نے بھی عجیب و غریب شکلیں اختیار کر رکھی ہیں لیکن ان میں ”آدم“ کا تصور کسی نہ کسی انداز میں ضرور ملتا ہے۔ عیسائیت نے اس تصور کی بنیاد پر عقائد و فلسفہ کی ایک عجیب و غریب عمارت قائم کر رکھی ہے۔ اس نے انسانی فطرت کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک حصہ وہ جو ”مہبوط آدم“ سے پیشتر کا ہے اور دوسرا حصہ وہ جو اس تنزل کے بعد کا ہے۔ اس تصور کے مطابق مہبوط آدم سے پہلے انسان فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتا تھا۔ اس زندگی میں گناہ کا تصور کہیں نہیں تھا۔ انسان معصوم تھا اور اس کی فطرت پاکیزہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ باہمی معاملات میں کوئی خرابی اور کسی قسم کا فساد نہیں تھا۔ اس کے بعد زندگی کا دور دور شروع ہوا جو مہبوط (FALL) کے بعد کا دور ہے۔ اس میں ہر انسانی بچہ پیدائش ہی سے گنہگار پیدا ہوتا ہے

اور گناہ کے اثرات کا الگ کر دینا کسی کے بس میں نہیں۔ لہذا اب انسان کی زندگی غیر فطری خطوط پر بسر ہوتی ہے جس کا نتیجہ وہ جہنم خیز فتنہ و فساد ہے جس میں انسانیت مبتلا چلی آرہی ہے۔ یہ دور اسی طرح چلا جائے گا تا آنکہ انسانوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس میں انسان کی نجات کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ انسان حضرت مسیح کے صلیب دیئے جانے پر ایمان لائے اور ان کے خونِ ناحق کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھے۔ زمانہ کی اسی قسم کی تقسیم ہندوؤں کے ہاں ہے۔ ان کے تصور کی رُو سے ابتدا کا زمانہ ست جگ تھا جس میں راست بازی کا دور دورہ تھا۔ لیکن اس کے بعد اب کلجگ ہے جس میں باطل کو فروغ ہے۔ اب ست جگ پھر واپس نہیں آسکتا۔ لہذا جوں جوں انسانیت آگے بڑھتی ہے فتنہ و فساد کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

لیکن قرآن نے اس قسم کا کوئی تصور نہیں دیا۔ اس نے بتایا کہ انسان کے لئے مثیلی (آئیڈیل) معاشرہ وہ ہے جس میں افراد کو اپنی پرورش اور نشوونما کے لئے جگہ سوز مشقتوں سے نہ گزرنا پڑے اور ایک فرد دوسرے فرد کی صلاحیتوں کے نشوونما کے لئے تقار کا ذریعہ بنتا رہے اس کے بعد اس نے بتایا کہ یہ معاشرہ اس صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے قائم ہو سکے گا جو وحی کے ذریعے عطا کیا ہے۔ لہذا یہ معاشرہ انسانوں کی اپنی سعی و کوشش کا ثمرہ ہوگا۔ اسے جنتِ ارضی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایسے معاشرہ کا قیام ہر وقت ممکن ہے اور ہر دور کا انسان اسے سعی و عمل سے متشکل کر سکتا ہے۔ نہ آدم کی فطرت گناہوں سے آلودہ ہے اور نہ ہی کوئی ست جگ ایسا ہے جو دوبارہ نہ آسکے۔ ہر انسانی بچہ ایک سادہ لوح لے کر دنیا میں آتا ہے اس کے پاس انسانی ممکنات کی مضمّن قوتیں ہوتی ہیں جن کی مناسب نشوونما سے یہ خود اپنی ذات اور معاشرہ کے اندر حسن پیدا کر سکتا ہے۔ جب یہ قوتیں وحیِ الہی کے تابع سرگرم عمل ہوتی ہیں تو ان کا نتیجہ خوشگوار یوں کی جنت ہوتا ہے۔ مفاد پرست قوتیں اس معاشرہ کی تشکیل میں حائل ہوتی ہیں۔ انہی کو ابلیسی قوتیں کہا جاتا ہے جن کا ذکر آئندہ باب میں آئے گا۔ ان ابلیسی قوتوں کے مقابلہ سے انسانی قوتوں میں مزید چلا پیدا ہوتی ہے۔ یہی وہ کش مکش ہے جس میں زندگی کا راز اور ارتقاء کا سرخ پوشیدہ ہے۔ لہذا ”آدم“ انسانی زندگی کے اس نقطہ آغاز کا نام ہے جہاں سے اس کی مضمّن صلاحیتوں کے نشوونما کے مواقع شروع ہوتے ہیں۔ آدم کا مہبوط کسی بلند زندگی سے اسفل زندگی کی طرف تنزل نہیں۔ یہ انسانی نصب العین کے حصول کی داستان کا نقطہ آغاز ہے۔



(اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۳۴) ۲)

ابلیس

قِصَّةٓ اٰدَمَ كُوْرَنَیْیِیْنَ كَمَرُ گِیَا جِس كَالِهَوَا

ابلیس

قانونِ ارتقار کی رُو سے استحکام و عروج اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ متصادم و متخالف قوتوں سے نبرد آزما ہوا جائے۔ جن انواع کو نامساعد احوال و ظروف سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا وہ آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے لیکن اگر اس کی راہ میں پتھروں کی (FALLS) نہ آئیں تو اس کی پُر سکوت روانی آہستہ آہستہ مہڈل بہ سکون ہو جائے اور یہ جوئے رواں جمود و تعطل کا ایک جوہر یا تالاب بن کر رہ جائے۔ بربط کے تار و ٹل میں خوابیدہ منغمے بلا مضرب کبھی بیدار نہیں ہو سکتے۔ آئینہ شمشیر میں کبھی آب و تاب پیدا نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ اسے سنگِ فساں پر صیقل نہ کیا جائے۔ چھماق کی شعلہ فشاں پتھر کی رگڑ کے بغیر ممکن نہیں۔ شیشہ میں کبھی جوہر آئینہ پیدا نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ اس کے پیچھے رنگار کی کثافت نہ ہو۔ اسی طرح خودی بھی اپنی نمودِ استحکام اور عروج کے لئے اپنے سے غیر کو چاہتی ہے۔ اگر خودی اپنے غیر سے متقابل و متصادم نہ ہو تو ہنگامہ کائنات سرد پڑ جائے۔ بزمِ ہستی کی رنگینیاں بے کیف معجائیں۔ یہ جہاں رنگ و بو پھر سے مٹی کا گھر وندا بن کے رہ جائے۔ خونِ رگ کائنات کی تپش صرف خودی کے دلولہ نمود کی مظہر اور اس کی لذتِ کشمکش کی رہین منت ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ:

صد جہاں پوشیدہ اندر فات او غیر او پیدا است از اثبات او

سازد از خود پیکر اغیار را تافزاید لذتِ پیکار را

انسان پیدا ہوا تو عالمِ آفاق کی تمام اشیاء اس کے لئے مسخر کر دی گئیں۔ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي

السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ جَمِيعًا.

انسانی خودی کا استحکام | ان قوتوں سے کام لینے کے لئے اسے زیادہ سے زیادہ اپنی طبیعی اور دماغی قوتوں کو بروئے کار لانا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم

پہلے دیکھ چکے ہیں، انسان فقط ان طبیعی اور دماغی قوتوں ہی کا نام نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے اندر ایک اور شے بھی ہے جسے روح خداوندی کہا گیا ہے۔ یہی انسان کی انانیت ہے۔ یعنی جب انسان "میں" کہتا ہے تو اس سے مفہوم اس کا طبیعی پیکر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے مادہ اور کچھ اور ہوتا ہے۔ یہ انایا (EGO) اس کی خودی ہے اور اس خودی کا استحکام دارقہاء تکمیل بشریت انسانیت۔ خودی کے استحکام و عروج کا تقاضا تھا کہ اس کے مد مقابل بھی کوئی قوت ہوتی جس سے تصادم اور کش مکش اس کے جوہر میں جلا پیدا کرتا۔ اسی قوت کا نام ابلیس ہے، جس کے متعلق علامہ اقبالؒ کہتے ہیں،

ضمیرش سر دہلے ہنگام دیدند

جہاں تا از عدم بیرون کشیدند

ترا از آتشش ما آفسیدند

بغیر از جان ما سوزے کجا بود

خوئے ابلیسی | ملائکہ انسان کے سامنے جھک گئے ابلیس مقابلہ کے لئے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اطاعت، انقیاد، تعمیل ارشاد۔ یہ ملائکہ کی خصوصیات ہیں۔ بغاوت، سرکشی

معصیت، انکار۔ یہ خوئے ابلیسی ہے۔ قصہ آدم کی آیات پر غور کیجئے۔ یہ فرق نمایاں طور پر سامنے آجائیگا۔ تخلیق آدم کے وقت ملائکہ نے بھی ایک "اعتراض" پیش کیا تھا۔

أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ ۚ وَنَحْنُ

نُسَبِحُ بِحَمْدِكَ ۖ لَكَ ۝ (۲/۳۰)

ہاں الہا! کیا تو ایسا خلیفہ بنا رہا ہے جو زمین میں خونریزی اور فساد انگیزی سے ہنگامے

برپا کر دے گا اور ایک ہم ہیں کہ ہمیشہ تیری تسبیح و تقدیس میں منہمک رہتے ہیں۔ (سوا ایک

ایسی ہنگامہ خیز ہستی کو ہم پر فوقیت دینا ہماری ناقص سمجھ میں نہیں آتا)۔

اسی قسم کا "اعتراض" ابلیس نے بھی پیش کیا۔

أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ۝ (۷/۱۲)

میں اس پیکر خاکی سے کہیں بہتر ہوں۔ اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا۔ میری تخلیق آتشیں

ہے (میں اس کے سامنے کیوں جھکوں!)۔

ملائکہ کے سامنے جب حقیقت واضح کی گئی تو ان کی فطرتِ سلیم نے سر جھکا دیا۔ عرض کیا: اے اللہ العالمین! ہمارا شبہ ہماری کوتاہ علمی پر مبنی تھا۔

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ

(۲/۳۲)

تیری ذات (تمام نقائص و عیوب سے) بلند ہے۔ ہمیں تو فقط اتنا ہی علم تھا جو تو نے عطا کر رکھا ہے۔ علیم و حکیم تو فقط تیری ہی ذات ہے۔

لیکن جب ابلیس کے سامنے حقیقت بے نقاب ہوئی تو اُس نے کیا کیا؟ جھکا نہیں۔

أَبَى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ۝ (۲/۳۳)

اس نے سرکشی اور تکبر اختیار کیا اور وہ نہ ماننے والوں میں سے تھا۔

اس کے بعد:

قَالَ ارْجِعْ يَتْلُكَ هَذَا الَّذِي كَرَّمْتَ عَلَيَّ (۱۷/۶۲)

اس نے کہا: درجہ تو یہی وہ ہے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے؟

اگر یہی فیصلہ ہے تو میں اسے ماننے کے لئے تیار نہیں۔

قرآن کریم نے جہاں سجودِ ملائکہ کی داستانِ اطاعت و انقیاد کو متعدد مقامات میں دہرایا ہے وہاں استکبارِ ابلیسی کے قصہ سرکشی و عدد دان کو بھی کئی جگہ بیان کیا ہے۔ (مثلاً ۳۰-۳۳/۱۵، ۷۳-۷۶/۱۳۸۔ اس

حقیقت کو اسی مقام پر سمجھ لینا چاہیے کہ ابلیس، انسان سے الگ، خارج میں موجود ہستی نہیں۔ یہ خود انسان ہی کی ایک خصلت کا نام ہے۔ انسان میں تین عناصر

بنیادی ہیں۔ (۱) جذبات، (۲) عقل اور (۳) انسانی ذات یا خودی۔ عقل اس قوت کا نام ہے جو انسان کی خواہش ہر ارادے اور ہر فیصلے کو بروئے کار لانے کے لئے اسباب و ذرائع بہم پہنچاتی اور ان فیصلوں کو حق بجانب قرار دینے کے لئے دلائل تراشتی ہے۔ لہذا عقل فی ذاتہ نہ خیر ہوتی ہے نہ شر۔

انسانی جذبات وہ قوت محرکہ ہے جن سے انسانی خواہشات پیدا بھی ہوتی ہیں اور اس کے اندر اس قوت کو بھی ابھارتی ہے جس سے اس کے فیصلے بروئے کار آتے ہیں۔ لہذا جذبات بھی فی ذاتہ نہ خیر ہوتے

ہیں نہ شر۔

عقل اور جذبات کو کنٹرول کرنے والی قوت انسانی ذات کہلاتی ہے۔ اگر انسانی ذات کمزور ہے تو اس کے جذبات اس کی حیوانی سطح کی خواہشات پورا کرنے کا موجب بن جاتے ہیں اور اس کی عقل ان جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے۔ لیکن اگر انسانی ذات مستحکم ہو تو پھر جذبات اور عقل دونوں اس کے تابع رہنے لگتے ہیں۔

اور انسانی ذات 'وحی کی رو سے عطا کردہ مستقل اقدار کے اتباع سے مستحکم ہوتی ہے۔ لہذا بات یوں ہوئی کہ جب انسانی جذبات عقل کے تابع رہیں اور عقل وحی کے احکام کی اطاعت کرنے تو جذبات اور عقل دونوں کا نتیجہ خیر ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ وحی کی تعلیم سے سرکشی اختیار کر لیں تو اس کا نتیجہ شر ہوتا ہے۔ اس کے سرکش جذبات اور عقل بے باک کو شیطان یا ابلیس کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ابلیس خود انسان کے اندر ہوتا ہے۔ باہر کہیں نہیں ہوتا۔

چونکہ یہ نکتہ بڑا اہم اور بنیادی ہے اس لئے اسے ذرا اور تفصیل سے دہرایا جاتا ہے۔ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) انسانی زندگی کی ایک سطح وہ ہے جسے حیوانی زندگی (یا اس کی طبعی زندگی) کہتے ہیں، اس سطح پر اس کے تقاضے وہی ہوتے ہیں جو جبلتی طور پر (INSTINCTIVELY) حیوانات کے تقاضے ہوتے ہیں۔ یعنی تحفظ و خویش (PRESERVATION OF SELF) اور افزائش نسل کے تقاضے اور ان کے تعلقات۔ یہ تقاضے انسان کے اندر از خود کار فرما رہتے ہیں۔

انسان کے اندر دوسری چیز ہے عقل (INTELLECT) عقل کا ایک کام تو یہ ہے کہ جو اس (SENSES) جو اطلاعات اس تک پہنچائیں ان میں ربط پیدا کر کے نتائج مستنبط کرے اور اس طرح ہر معاملہ کی (OBJECTIVE STUDY) کرے لیکن اس کا دوسرا کام یہ ہے کہ انسانی جذبات جو کچھ طلب کریں یہ اس کے فراہم کرنے کا انتظام سوچے۔ اس اعتبار سے عقل جذبات کی خادم ہوتی ہے۔ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ جذبات اس سے کہیں وہ کچھ کرتی جائے اور اس کے جواز (بلکہ حق بجانب ہونے) کے لئے دلائل بھی فراہم پہنچاتی رہے۔

تیسری چیز انسان کے اندر وہ ہیں (1) جس سے درحقیقت انسانی زندگی عبارت ہے۔ اس "میں" کا کام یہ ہے کہ وہ صحیح صحیح فیصلے کرے اور عقل سے ان فیصلوں کے مطابق کام کرے۔ اگر

یہ "میں" کمزور ہے تو انسان کے سارے فیصلے جذبات کی رُو سے ہوں گے اور اس کی زندگی کی سطح حیوانی زندگی سے آگے نہیں بڑھے گی لیکن اگر اس کی "میں" کمزور نہیں تو اس کے فیصلے جذبات سے الگ ہٹ کر ہوں گے اور انہی فیصلوں کو انسانی فیصلے کہا جائے گا۔

یہ "میں" (I) ایک خاص نظام کے ماتحت (جو وحی کی روشنی میں متشکل ہوتا ہے) اس قدر استحکام حاصل کر لیتی ہے کہ ہر معاملے میں خود فیصلے کر سکتی ہے۔ یہ فیصلے ایسے ہوتے ہیں جن سے ایک طرف زندگی کے طبعی تقاضے بھی یکماحقہ پورے ہوتے جاتے ہیں اور دوسری طرف استحکام ذات بھی زیادہ سے زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

جب عقل انسانی جذبات کے تابع چلتی ہے تو اسے عقل سرکش یا علم بے باک کہا جاتا ہے۔ اس کا نام ابلیس ہے۔ جب یہی عقل وحی کے تابع چلتی ہے تو عین انسانیت بن جاتی ہے۔ عقل بے باک اور انسانیت کے تقاضوں میں جو کشمکش ہوتی ہے اسے ابلیسی کشمکش کہا جاتا ہے۔ یہی خیر و شر کی کشمکش ہے۔ اس کشمکش سے انسانی خودی مستحکم ہوتی چلی جاتی اور عقل بے باک پر غالب آتی چلی جاتی ہے۔ اپنی عقل بے باک کے بعد دوسرے افراد کی عقل بے باک سے بھی تصادم ہوتا ہے۔ یہ وہ موانعات ہیں جو انسانی خودی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں لیکن ان کی سختی اور سنگینی ہی سے خودی میں نچنگی پیدا ہوتی ہے۔ ہم کا فولادی خول (جو اس کے اندر کے بارود کے رستے میں سدِ سکندری بن کر حائل ہوتا ہے) جس قدر زیادہ مضبوط ہوگا اتنی ہی زیادہ اس کے بارود کی قوت ہوگی۔

جہاں تک عقل کے اس شعبے کا تعلق ہے جس میں یہ حواس کے ذریعے ہم پہنچائے ہوئے مواد (SENSE DATA) سے استنباط نتائج کرتی ہے اور کسی مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے دلائل و براہین فراہم کرتی ہے، قرآن نے اس علم اور عقل کو بڑا بلند مقام عطا کیا ہے۔

علم و عقل کی فضیلت | قصہ آدم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ علم ہی وہ جوہر تھا جس کی بنا پر آدم مسجود ملائکہ قرار پایا۔ قرآن کریم کے درخشندہ اوراق کو اُلٹتے جائیے شروع سے اخیر تک آپ دیکھیں گے کہ عقل و بصیرت، فہم و فراست، علم و دانش کو کس طرح وجہ افتخار اور باعث عزت و تحریم قرار دیا گیا ہے، قرآن حکیم درحقیقت مخاطب ہی عقل کو کرتا ہے۔ صاحبِ دانش و بینش، اولی الابصار و اولی الارباب اس کے نزدیک انسانیت کے بلند ترین مدارج کے اہل ہیں۔

اس کے برعکس عقل و فکر سے کام نہ لینے والے بدترین خلائق۔
 اِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ

(۸/۲۲)

یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے بدتر حیوان وہ (انسان) ہیں جو بہرے گونگے ہو گئے جو

عقل و فکر سے کام ہی نہیں لیتے۔

قرآن کریم میں اس قسم کی بے شمار آیات ہیں جن میں عقل و بصیرت کو وجہ شرف انسانیت قرار دیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ جب علم و عقل، انسانی جذبات کے تابع کام کریں تو اس کا نتیجہ تباہی بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ 'نبی اکرم' کی دعوت کی مخالفت کرنے والوں کا ذکر کرنے کے بعد ان کا مقابلہ اسی قسم کی اقوام سابقہ سے کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

وَلَقَدْ مَكَنَّا لَهُمْ فِيمَا اِنْ مَّكَنَّاكُمْ فِيْهِ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَبْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْئِدَةً نَّصِلُ فَمَا اَغْنٰ عَنْهُمْ سُبُوْعُهُمْ وَّ لَا اَبْصَارُهُمْ وَّ لَا اَفْئِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَمْجِدُوْنَ اٰيَاتِ اللّٰهِ وَّ حَاقَّ بِهِمْ مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (۲۶/۲۶)

ہم نے ان (اقوام سابقہ) کو تم سے بھی زیادہ تمکن (غلبہ و استحکام) عطا کیا تھا اور انہیں سماعت و بصارت اور قلب (سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں وافر) عطا کی تھیں۔ لیکن جب انہوں نے قوانین خداوندی کی اطاعت سے انکار کر دیا تو ان کا علم و عقل ان کے کسی کام نہ آیا اور جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں چاروں طرف سے

گھیر لیا۔

آپ خود کیجئے دنیا میں جس قدر فساد اور خونریزیاں اور ظلم و استبداد ہے سب کی رُم یہ ہے کہ انسان نے علم بیباک کی تباہ کاریاں اپنے علم و عقل کو سرکش و بے باک چھوڑ رکھا ہے۔ اور اسے اپنے سے بلند و بالا ہستی کے قوانین کے تابع نہیں رکھا۔

اسی کا نام ابلیسی نظام ہے جس میں ہر شخص، جماعت یا قوم جو دوسرے کو فریب دے سکے (یعنی وہ جو دوسرے کے علم و عقل سے زیادہ علم و عقل رکھے اور اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کئے جائے) نہایت کامیاب

قَالَ عَٰسَٰرُ سَجْدًا لِّمَنۢ خَلَقْتَ طِينًا ۝ (۱۴/۶۱)
کیا میں اسے سجدہ کروں جسے تُو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔

اس کے بعد:

قَالَ اَرَاۤءَيْتَٰكَ هٰذَا الَّذِیۡ كَرَّمْتَ عَلَیۡ نَزْلِیۡنِۨ اٰخَرَتِنِۨ اِلٰی یَّوۡمِ
الْقِیٰمَةِ لَوۡ حُتِّبَۡنَا ذُرِّیَّتَهُۥ اِلَّا قَلِیۡلًا ۝ (۱۴/۶۲)

کہا دیجئے تو یہی وہ ہے جس کو تُو نے مجھ پر فضیلت دی ہے ۱۹ اچھا اگر یہی فیصلہ ہے تو مجھے
قیامت کے لئے ہمت دے دے اور پھر دیکھ میں تیرے اس منتخب کردہ کی ذریت کی
ناک میں نکیل ڈال کر انہیں کس طرح تنگی کا ناچ بچاتا ہوں بجز محدودے چند کے۔

سورہ ص میں ہے کہ جب ابلیس کو ہمت دے دی گئی تو اس نے کہا،
قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَۤاُغْوِبَنَّ عَنْهُمۡ وَاجْمَعُیۡنَہٗ ۝ (۳۸/۸۲)
کہا! تیرے عزت و جلال کی قسم! میں ان سب کو ضرور (راہ
حق سے) گمراہ کر دوں گا۔

یہاں ابلیس کی قسم پر غور کیجئے۔ اے ارض و سموات کے مالک! تیری قوت و شوکت کی قسم! تیرے
جبروت و جلال کی قسم۔ تیرے غلبہ و تسلط کی قسم میں انہیں برباد کر کے چھوڑ دوں گا۔ گمراہ کر کے چھوڑ دوں
گا۔ ابلیس چونکہ قوتِ بیباک کا مظہر ہے اس لئے اُس نے قسم بھی اللہ کے جبروت و جلال اور قوت و
سطوت کی کھائی۔



ابلیسیت کا ایک اور پہلو | پھر اسے بھی دیکھئے کہ آدم کو جب اپنی لغزش کا احساس ہوا تو
اس نے فوراً اعتراف کیا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنۡفُسَنَا عَمَّا (۴/۲۳)

”اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے“ یعنی اس نے اپنی لغزش کا ذمہ دار اپنے آپ
کو ٹھہرایا ہے اور مذمت سے آنکھیں جھکا لیں۔ اس لئے کہا گیا کہ تمہاری اس ردش کا نتیجہ یہ ہے کہ تم اپنی
اصلاح کر سکو گے۔ اس لئے تم پر باز آفرینی کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں۔
لیکن اس کے برعکس جب ابلیس سے کہا گیا کہ تُو نے معصیت کیوں کی تو اس نے کہا کہ میں نے

لغزش کب کی ہے اَعْوَبْتَنِي (۱۵/۲۹) ”تُو نے مجھے گمراہ کیا ہے“ میں اپنی لغزش کا ذمہ دار نہیں۔ میں تو مجبور ہوں۔ سب کچھ تُو ہی کرتا ہے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ تیری اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہے کہ تو کبھی اپنی اصلاح نہیں کر سکے گا۔ جو شخص اپنی غلطی کے لئے اپنے آپ کو ذمہ دار ہی نہیں ٹھہراتا وہ اپنی اصلاح کیسے کر سکتا ہے! اس لئے تجھ پر باز آفرینی کے دروازے نہیں کھل سکتے۔ تیرے حصے میں ابدی طور پر ایووسی ہے۔ (ابلیس کے لفظی معنی ”ایووس“ کے ہیں)۔

آپ نے دیکھا کہ اس تقابل میں کتنی عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ اس میں ایک طرف تو ”تقدیر“ کے (بظاہر) لایمحل مسئلہ کو اس حسن و خوبی سے حل کر دیا۔ اور دوسری طرف ارتکابِ جرم کے بعد اصلاح کے امکان کی صورت بھی واضح کر دی۔ اصلاح کا امکان اس کے لئے ہے جو اپنی ذمہ داری قبول کرے اور پھر باز آفرینی کے لئے صحیح راستے پر چل نکلے۔ جو اپنی ذمہ داری ہی قبول نہ کرے اور اپنی ضد پر اڑا رہے، وہ اپنی اصلاح کس طرح کر سکتا ہے؟

غور کیجئے دنیا میں کس قدر تباہیاں اور بربادیاں ہیں جو محض اس بنا پر آتی ہیں کہ اپنی غلطی کا احساس ہو جانے کے بعد انسان اس کا اعتراف نہیں کرتا بلکہ ضد اور سرکشی اور نفس کی جھوٹی عزت کے خیال سے اس پر جہار ہوتا ہے اور اکثر بیشتر کوشش کرتا ہے کہ اپنی غلطی کا جواز پیش کر کے اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرے۔ یہ ضد اور سرکشی فطرتِ ابلیسی کی بنا پر ہے جس میں کہیں جھکنا نہیں لکھا۔ لغزش اور غلطی کے احساس کے بعد جھک جانا ہی انسانیت ہے۔ ضد پر اڑے رہنا ابلیسیت ہے۔ یہ ضد اور سرکشی یوں تو ہر شعبہ زندگی میں ہلاکت آفریں ہے۔ لیکن مذہب کی دنیا میں اس کے جراثیم بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔ یہ تمام تخریب و تشیع، یہ تمام فرقہ بازیوں اور گروہ سازیاں اور یہ تمام اختلافات، محض باہمی ضد اور سرکشی کی بنا پر ہیں ورنہ جب علم (شرآن) موجود ہو تو پھر اختلاف کی گنجائش کہاں

باہمی ضد! ہے؟ لیکن یہ فطرتِ ابلیسی ہے کہ بڑے بڑے مقدس نقاب اوڑھ کر فریب دیتی اور وحدتِ ملت کو پارہ پارہ کر دینے والی تخریبی کوششوں کو مزین بنا کر اس کا نام ”خدمتِ دین“ رکھتی ہے۔ سورۃ بقرہ میں فرمایا کہ وحیِ خداوندی کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کے اختلافات کو مٹائے لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ۔

وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ

یہ گروہ سازیاں | ذرا اپنے گرد و پیش نظر دوڑائیے اور دیکھئے کہ ملتِ اسلامیہ جیسی امتِ واحدہ میں جن کا خدا ایک، رسول ایک، ضابطہٴ حیات (قرآن) ایک، مرکزِ محسوس (قبلہ) ایک۔ اس قدر فرقے اور گروہ کس علت کی بنا پر ہیں۔ بادیٰ تعقیق یہ حقیقت آپ پر روشن ہو جائے گی کہ اس تفریق و انتشار کی تہ میں باہمی ضد اور تعصب کے سوا اور کچھ نہیں، اس لئے کہ خود قرآن شاہد ہے کہ علم (یعنی علمِ کتاب) آچکنے کے بعد اختلافات محض ضد کی بنا پر ہوتے ہیں۔ قرآن کے من جانب اللہ ہونے کی تو سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس میں اختلاف نہیں۔

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ إِخْتِلَافًا كَثِيرًا (۳/۸۲)

پھر کیا یہ لوگ قرآن (کے مطالب پر) غور و فکر نہیں کرتے؟ اور خدا کی دی ہوئی بصیرت سے کام نہیں لیتے؟ اگر یہ خدا کے سوا کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا تو ضروری تھا کہ یہ اس کی بہت سی باتوں میں اختلاف پاتے (حالانکہ وہ تو اپنی ساری باتوں میں اول سے آخر تک کامل طور پر ہم آہنگ اور یکساں ہے)۔

پھر کیا یہ حقیقت دل خراش اور یہ حدیث الم انگیز نہیں کہ اس کتاب کے ماننے والے جس کے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہو کہ اس میں اختلاف نہیں، اس قدر اختلافات میں آج

اور یہ فرقے بندیاں | ہوتے ہوں اور ان اختلافات کو قائم رکھنے کی ہر کوشش کو جہاد فی سبیل اللہ

اور خدمتِ دین قرار دے رہے ہوں؟ حالانکہ قرآن نے انہیں متنبہ کر دیا تھا کہ

وَأَوْ تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۚ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا ۚ كُلُّ يُحْزَبٍ لِّمَا لَدَيْهِمْ فِرْحُونٌ ۚ (۳۰/۳۲-۳۱)

(اور دیکھو!) کہیں (توحید پرست ہو جانے کے بعد) مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفریق پیدا کر ڈالی اور الگ الگ گروہ بن بیٹھے۔ (پھر اس وقت حالت یہ ہو جایا کرتی ہے کہ) ہر فریق اپنے اپنے خیالات پر خوش ہوتا ہے اور اپنے آپ کو برسرِ حق اور دوسروں کو باطل پر سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے۔

جو امت کی وحدت کو توڑ کر یوں فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہو جائے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَتَرُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شَيْعًا لَّسْتُ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ
إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝

(۶/۱۹۰)

(اے پیغمبر!) جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور الگ الگ گروہ بن گئے تمہیں ان سے کچھ سروکار نہیں ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ پھر وہی بتلائے گا کہ جو کچھ کرتے رہے ہیں اس کی حقیقت کیا تھی؟

سب اسی فطرتِ ابلیسی کے مظاہر ہیں | یہ اسی فطرتِ ابلیسی کے مظاہر ہیں جو مختلف پردوں میں مختلف ادوار میں گردش کرتی رہتی ہے۔

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر سے آدم جواں ہیں لات و منات



ابلیس سے حفاظت | اب سوال یہ ہے کہ ابلیس کی پوشش سے حفاظت کا سامان کیا ہو؟ اس سے چھٹکارا کس طرح حاصل کیا جائے؟ مشرق کی رہبانیت نے اس کا آسان علاج سوچ لیا کہ سر میں ورد ہو تو سر کٹا دیا جائے۔ یعنی ابلیسی کشمکش سے تنگ آ کر ترک دنیا اور ترک علاقہ پر اتر آئے۔ نہ رہے بالنس نہ بجے بالنسری۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ تو شکست خوردہ ذہنیت (DEFEATEST MENTALITY) کا ثبوت اور ضعفِ خودی کی دلیل ہے۔ یہ انتہائی یاس اور نا اُمیدی کا مظاہر ہے جو خود ابلیس کا مقصد و منشاء ہے۔ اگر منشاء خدا دندی یہی ہوتا کہ انسان غاروں میں جا بیٹھیں تو کشمکش حیات کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس صورت میں تو خلافتِ ارضی کے لئے آدم سے بڑھ کر فرشتے زیادہ موزوں تھے۔ تصوف کی رہبانیت کا مسلک اس امر کا اعتراف ہے کہ اس باب میں (معاذ اللہ) خدا کا فیصلہ صحیح نہیں تھا۔ یہ لوگ درحقیقت بہت سطح میں تھے۔ انہوں نے سوچا ہی نہیں کہ **رہبانیت میں نہیں** | انسانی خودی (نفسِ انسانی) کے عروج و ارتقاء کے لئے کشمکش زندگی

ابلیسی قوتوں سے مقابلہ کس قدر ضروری ہے۔ یہ تصادم و تزااحم عین تقاضائے فطرت ہے۔ لہذا رہبانیت کی زندگی غیر فطری اور سہل انگار ذہن انسانی کی ایجاد ہے۔ اسی لئے قرآن نے اعلان کر دیا کہ رہبانیت کی زندگی خدا کی طرف سے عائد کردہ فریضہ نہیں۔ یہ لوگوں کے اپنے ذہن کی ایجاد ہے۔ اور ایجاد بھی ایسی کہ اسے یہ لوگ نباہ بھی نہیں سکتے۔ (دیکھئے ۵۴/۲۴)۔ خلاف فطرت روش کو انسان نبھا کیسے سکتا ہے؟ یہ کشمکش حیات سے فرار (ESCAPISM) ہے جسے تقدس کے لباس میں چھپایا جاتا ہے۔ یہ فریب نفس ہے۔

نہ ہی مغرب کی مادیت میں | دوسری طرف مغرب کی مادہ پرستی ہے کہ اس نے نظام زندگی پر یکسر ابلیس کو مسلط کر رکھا ہے جس کا نتیجہ عدم سکون اور فقدان طمانیت کی وہ جہنم ہے جس میں آج یورپ ہی نہیں بلکہ ہر وہ سرزمین مبتلا ہے جس پر اس کے ابلیسی نظام کا کچھ بھی پر تو پڑ چکا ہے (اور آج دنیا کا کونسا گوشہ ایسا ہے جو اس نظام کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا ہے؟) مغرب کے نظام میں ہوا یہ کہ

عقل ناپید و خرد می گزوش صورت مار

عقل کو تابع فرمان نظر کرنے سکا

لہذا یہ مسلک زندگی کسی طور بھی انسانوں کے شایان شان نہیں۔ اس میں تو ابلیس کا چیلنج پوری قوتوں کے ساتھ فاتح و بالادست بن کر ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔ اس نے یہی کہا تھا کہ

قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ۝
ثُمَّ لَآتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ
أَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ ۖ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ۝

(۱۶-۱۷/۷۷)

اس پر ابلیس نے کہا ”چونکہ تو نے مجھے اس طرح گمراہ کر دیا ہے، تو اب میں بھی ضرور ایسا کروں گا کہ تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لئے بنی آدم کی ناک میں بیٹھوں، پھر سامنے سے پیچھے سے، دائیں سے بائیں سے (غرضیکہ ہر طرف سے) ان پر آؤں اور ان میں سے اکثروں کو شکر گزار نہ پائے گا۔

یہی وہ تبعین ابلیس ہیں جن کے متعلق اُسی وقت کہہ دیا گیا تھا۔

مَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِينَ ۝ (۱۸/۷۴)

(۲۸/۸۵ ذ ۱۵/۲۳)

بنی آدم میں سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا، تو (وہ تیرا ساتھی ہوگا اور) میں ایسا کروں گا کہ (پاداشِ عمل میں) تم سب سے جہنم بھر دوں۔

تیسرا گروہ | اب تیسرا گروہ باقی رہ گیا۔ یہ وہ گروہ ہے جس کے متعلق ابلیس کے چیلنج کے جواب میں کہہ دیا گیا تھا کہ جاؤ اپنی ساری قوتیں صرف کرو۔ اپنے سارے حربے آزما دیکھو۔ اپنا تمام شکر

دائیں بائیں سے پوش کر کے لے آؤ۔ لیکن:

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ

الْغَوِيَّةِ ۝ (۱۵/۲۲)

جو میرے (مخلص) بندے ہیں اُن پر تیرا کچھ زور نہیں چلے گا۔ صرف انہی پر چلے گا جو (صحیح) راہ سے بھٹک گئے۔

دوسری جگہ ہے۔

وَأَسْتَفِيزُ مَنْ اسْتَطَاعَتْ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبَ عَلَيْهِمْ بِخِيلِكَ وَرَجَلَكَ وَشَارَكَهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعَدَهُمْ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا ۚ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ ۚ وَكَفَى بِرَبِّكَ وَكِيلًا ۝ (۱۷/۶۲)

ان میں سے جس کسی کو تو اپنی صدا میں سنا کر بہکا سکتا ہے بہکانے کی کوشش کر لئے اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں سے حملہ کر، ان کے مال و اولاد میں شریک ہو جا، ان سے (طرح طرح کی باتوں کے) وعدے کر اور شیطان کے وعدے تو اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ مڑتا سر دھوکا ہیں۔ لیکن جو میرے (سچے) بندے ہیں اُن پر تو قابو پانے والا نہیں۔ تیرا پروردگار (اُن کی) کار سازی کے لئے بس کرتا ہے۔

یعنی جو لوگ قانونِ خداوندی کے مطابق نظامِ معاشرہ قائم کریں گے اُن پر ابلیس کا تسلط نہیں جم سکے گا۔ وہ ابلیس پر غالب رہیں گے۔ ابلیسی قوتیں سب ان کے زیرِ فرمان ہوں گی۔ علم، عقل، دولت، قوت افراد

کی کثرت۔ یہ تمام چیزیں سرکش و میاک نہیں رہیں گی۔ یہ سب ان حدود کے اندر کار فرما رہیں گی جو قوانینِ خداوندی ابلیس کو ”مسلمان“ کر لیا جائے۔ | اُسے تو قیامت کے لئے مُہلت مل چکی ہے، اسے

زیرِ تسخیر رکھا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر اُسے ”مسلمان“ کر لیا جائے گا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ۷

علمِ رابلے سوزِ دلِ خوانیِ شر است	نورِ اُوتارِ پکی بحسبِ بر است
کشتنِ ابلیس کا بے مشکل است	زانکہ اُوگم اندرِ اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانِ شس کنی	کشتہٗ فمشیرِ قرآنِ شس کنی
خویش را بر ابرہن باید زدن	تو ہمہ تیغِ آلِ ہمہ سنگِ فسن

اپنے اندر اتنی قوت پیدا کی جائے جو تمام ابلیسی قوتوں کا مقابلہ کر سکے اور پھر اس قوت کے اجتماعی اثر سے ایسا نظام قائم کیا جائے جو قوانینِ الہیہ پر مشتمل ہو۔ یوں ابلیس پر لگام دے کر تابع فرمان بنالیا جائے۔ غور فرمائیے کہ وہ قوت کس قدر عظیم الشان اور کوہِ شکن ہوگی جو ابلیس کے اہمیبِ حناں یہ کیسے؟ | گیسختہ کو زیرِ پالان لے آئے؛ یہ قوت سوائے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے اور کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتی اور قوانینِ خداوندی کی اطاعت اس معاشرہ کے اندر کی جاسکتی ہے جو وحی کی رُو سے تشکل ہوتا ہے۔ افراد کے اندر وہ قوت جو ابلیسی کششوں کا مقابلہ کر سکے اسی معاشرہ کے اندر پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے جب آدم کے ساتھ ابلیس کو دنیا میں بھیجا گیا ہے تو بنی آدم سے کہہ دیا گیا تھا کہ:

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هَذِي فَمَنْ قَبِعَ هَذَا لَا يَخُوفُ عَلَيْهِمْ

وَلَا هُمْ يَخُفُّونَ ۝ (۲/۲۸)

لیکن (یاد رکھو) جب کبھی ایسا ہوگا کہ ہمارا ضابطہ ہدایت تم تک پہنچے گا تو تم میں سے جو کوئی اس کی پیروی کرے گا اس کے لئے کسی طرح کا کھٹکا نہیں کسی طرح کی ٹکلی نہیں ہوگی۔

ابنِ آدم سے کہہ دیا گیا تھا کہ مت گھبراؤ اگرچہ ابلیسی لشکر کا ساز و سامان بڑا خوفناک اور ہراس انگیز ہے۔

لے ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ”میں نے اپنے شیطان کو مسلمان کر لیا ہے۔“

لیکن تمہیں ہم نے اکیلا نہیں چھوڑا، تمہیں ایک ایسی شمشیر سے مسلح کر دیا گیا ہے کہ طاغوتی قوتیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

اگرچہ عقل فسوں پیشہ لشکر سے انگشت
تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست

یہ ہے وہ قوت جس کی بنیاد پر ایک عبدِ مومن ابلیس سے بھی سجدہ کرا لیتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں پہنچ کر وہ علی وجہ البصیرت کہہ سکتا ہے کہ کس قدر صحیح ہے یہ فرمان کہ *وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا* ایسی تسخیرِ فطرت جس میں ابلیس انسان سے قدم قدم پر سجدے کرائے حکومت نہیں محکومیت ہے۔ اصل حکومت تو اس میں ہے کہ تمام ابلیسی قوتیں سر جھکائے منتظرِ فرامین کھڑی ہوں۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان *"اِنَّ عِبَادِيْ"* کے گردہ میں شامل ہو جائے۔ اللہ کا محکوم اور ساری کائنات کا حاکم یعنی جب انسان ایسا معاشرہ قائم کر لے جس میں قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر ہو۔

اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آگئی کہ شر کتنا ہی عالمگیر نہ ہو جائے، انسان کو ایسی صلاحیت عطا کر دی گئی ہے جس سے یہ اُس پر غالب آ سکے۔ لہذا وہ نظریات جن کی رُو سے کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کی رُو سے گنہگار ہوتا ہے اور اس گناہ کے دھبے کو وہ کسی صورت میں دھو ہی نہیں سکتا۔ یا یہ کہ انسانی سیرت اس کے موروثی اثرات یا ابتدائی تعلیم و تربیت سے مرتب ہوئی ہے اور جس قسم کی یہ سیرت بن جاتی ہے اسے تبدیل نہیں کیا جاسکتا، سب باطل ہیں۔ انسان کے اندر ایسی قوت موجود ہے جس سے یہ ان تمام اثرات کو زائل کر سکتا ہے۔ لیکن یہ قوت بیدار ہوتی ہے قوانینِ خداوندی کے اقتبا سے۔

قصۂ آدم کے علاوہ قرآن کریم میں دو جگہ اور بھی ابلیس کا ذکر آیا ہے۔ ایک سورۂ شعراء میں جہاں کہا:

وَجُنُودُ ابْلِیْسَ اَجْمَعُوْنَ ۝ (۲۶/۹۵)
اور ابلیس کے لشکر سب کے سب۔

دوسرے سورہ سبائیں۔ جہاں کہا اہل سبائے اپنے آپ پر ظلم کیا جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انہیں
مٹا کر ان کی فقط داستانوں کو باقی رکھا۔ اس طرح ابلیس کا خیال اُن کے متعلق پورا ہو کر رہا۔

وَلَقَدْ صَدَقَ عَلَيْهِمْ اِبْلَیْسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِیْقًا
مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (۳۴/۲۰)

اور واقعی ابلیس نے ان لوگوں کے بارہ میں اپنا گمان صحیح پایا کہ یہ سب اسی کی راہ پر
ہولے مگر ایمان والوں کا گروہ۔

ابلیس جنات میں سے | سورہ کہف میں ابلیس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ جنوں میں سے
تھا۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّا وَّابِلَیْسَ
كَانَ مِنَ الْخٰیۡنِ (۱۸/۵۰)

اور جب ہم نے ملائکہ کو حکم دیا "آدم کے سامنے ٹھک جاؤ" اور سب ٹھک گئے مگر ابلیس
نہیں جھکا۔ وہ جن میں سے تھا۔

"جنات" کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی۔ اس مقام پر صرف اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ
(۱) ہر وہ قوت جو انسانی نگاہوں سے اوچھل ہو (نظر نہ آسکتی ہو) جن کہلاتی ہے اور انسانی جذبات
چونکہ آنکھوں سے دیکھے نہیں جاسکتے اس لئے انہیں اس اعتبار سے جن کہا گیا ہے۔ اور
(۲) ابلیس نے اپنے متعلق جو کہا تھا کہ مجھے آگ سے پیدا کیا گیا ہے، تو یہ اس سے اس کی خوشی
(آتش مزاجی، اشتعال انگیزی) کی طرف اشارہ تھا۔

ہمارے ہاں ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ ابلیس، ملائکہ میں سے (بلکہ ان کا استاد، معلم الملوکوت) تھا۔
یہ بھی غلط ہے۔ ابلیس نہ ملائکہ میں سے تھا، نہ وہ ایسا ہو سکتا تھا۔ سورہ اعراف میں جہاں کہا گیا ہے:

ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّا وَّابِلَیْسَ
لَمْ یَكُنْ مِّنَ السَّٰجِدِیۡنَ ۝ (۷/۱۱)

پھر ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ ”آدم کے آگے جھک جاؤ“ اس پر سب جھک گئے۔ مگر ابلیس نہ جھکا اور وہ جھکنے والوں میں سے نہ تھا۔

تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ”ابلیس کے سوائے اور ملائکہ نے سجدہ کر دیا۔“ عربی زبان میں اس قسم کے (اَلْوَسُو) کو استثنائے منقطع کہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے، جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ (مثلاً) پھل تو سب آگئے ہیں لیکن مٹھائی (بھی) تک نہیں آئی۔ لہذا اس کے معنی ہیں کہ ملائکہ نے تو سب کے سب نے سجدہ کر دیا۔ لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ واضح رہے کہ ابلیس کو کبھی سجدہ کا حکم اسی طرح دیا گیا تھا جس طرح ملائکہ کو دیا تھا۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذَا اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ
خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَ خَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ ۝ (۷/۱۲)۔

خدا نے کہا ”کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟ اُس نے کہا۔ اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اسے مٹی سے۔“

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ملائکہ اور ابلیس درحقیقت ان قوتوں کے مظاہر ہیں جو عالمِ انفس و آفاق میں عمل پیرا ہیں۔ عالمِ آفاق کی تمام قوتیں انسان کے لئے مسخر کر دی گئیں۔ لیکن عالمِ انفس (انسان کی داخلی دنیا) میں ایسی قوت بھی ہے جو خود اس کے ارتقائے ذات کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ اسے ابلیسی قوت کہا جاتا ہے۔ اور چونکہ اس قوت کو مجبور نہیں پیدا کیا گیا (جس طرح خارجی کائنات کی قوتیں خاص قوانین کے مطابق کام کرنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں) اس لئے اس کے متعلق کہا گیا کہ اس نے انسان کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اب انسان کا کام یہ ہے کہ اس سرکش قوت کو اپنے سامنے جھکا لے۔ یہ ہے منصبِ انسانیت جس نے ایسا کر لیا اس کی خودی میں استحکام اور شرفِ انسانیت میں بالیدگی پیدا ہو گئی۔ جو اس قوت سے دب گیا۔ اس کے جوہرِ انسانیت فنا ہو گئے۔ [باقی رہا یہ کہ ابلیس جنوں میں سے کس طرح تھا؟ سو اس کے لئے جنات کی تفصیل دیکھئے جو ذرا آگے چل کر سامنے آجائے گی۔]

ابلیس مایوسی کا مظہر ہے | لفظ ابلیس کو پھر دیکھئے۔ اس کے مادہ (اَبْلَس) سے ظاہر ہے کہ یہ انتہائی مایوسی کا مظہر ہے۔ سب سے بڑی ابلیسیت

جس کا مقابلہ انسان کو کرنا ہے یا اس اور نا اُمیدی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی نام ہی اُمید و آرزو کا ہے۔ جب تک کسی سینہ میں آرزو کی کرن موجود ہے زندگی کی رقی باقی ہے۔ آرزوؤں کے فنا ہو جانے کا نام موت ہے۔ زندہ رہنے کی اُمید اور آگے بڑھنے کی آرزو ہی ہے جس سے انسان کی خودی میں ارتقاء اور اس کے جوہر خفہ میں بیداری پیدا ہوتی ہے۔

زندگانی رابقت از مدعا است کاروانش را در از مدعا است
زندگی در جستجو پوشیدہ است اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بو است فطرت ہر شے این آرزو است

زندگی یہ ہے کہ انسان کے سامنے ایک درخشاں نصب العین ہو اور اس نصب العین کے حصول کی تڑپ برقی تپاں کی صورت میں رگ و پے میں جاری و ساری کائنات کی تمام رنگینیاں نقطۂ آرزو کے اندر پوشیدہ ہیں، سفر حیات میں جہاں یاس و نا اُمیدی نے غلبہ پایا انسان پر عملاً موت طاری ہو گئی۔ ابلیس کا سب سے بڑا عریہ یہ ہے کہ انسان پر یاس و نا اُمیدی طاری کر دے۔ اس کے جنود و حسا کر (الذواع و اقسام کے شیاطین) ایسے اسباب پیدا کرتے رہتے ہیں جن سے اس پر خوف مسلط ہو جاتے۔ اس کے حوصلے پست اور ولولے سرد پڑ جاتے۔ اس پر خوف و حزن طاری ہو جاتے اور یہ جی چھوڑ کر کشمکش حیات سے کنارہ کش ہو جاتے۔ مایوسیوں کی ان ظلمت خیز گھاٹوں میں یا تو انسان چپ چاپ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کسی گوشہ تنگ و تاریک میں سر بزاؤ بیٹھ جاتا ہے اور یا (بعض اوقات) شدتِ یاس و غم سے مغلوب ہو کر تخریب بر آتا ہے اور اپنے مقاصد کی جو عمارت برسوں کے پسینہ اور خون سے ہزار مشقت تیار کی تھی اسے خود اپنے ہاتھوں سے توڑ پھوڑ کر خاک میں ملا دیتا ہے۔ کسی گوشہ تیرہ تار میں سر بزیری ہو یا اس قسم کی حرکت مذہب و جی، بہر حال دونوں شدتِ یاس اور فطرتِ نا اُمیدی کے مظاہر ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ابلیس اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر انسان پر ہنستا ہے۔ مایوسیوں کی اس تاریکی میں اگر کہیں سے شعاع اُمید نظر آسکتی ہے تو وہ ایمان کی شمع فروزاں ہے جو ان بھیاںک اور سیاہ بادلوں پر جھگگاتے، نقرئی حروف میں لکھ دیتی ہے کہ

وَاَوْ تَهِنُوا وَاَوْ تَحْزَنُوا وَاَنْتُمْ اَوَعَلٰوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

(۳/۱۳۹) اور دیکھو، نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو، تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو بشرطیکہ تم مؤمن ہو۔

ایمان کے معنی ہیں اپنے نصب العین کی صداقت پر یقین محکم اور مومن اسے کہتے ہیں جس کے اس یقین میں دنیا کی بڑی سے بڑی مشکل، ذرا سی لغزش نہ پیدا ہونے دے۔ ایمان کی روشنی میں ہی وہ شمع تابندہ تھی جس کا وعدہ آدم سے کیا گیا تھا۔ جب اس سے کہا گیا تھا کہ دنیا میں جاؤ اور پوری قوت سے ابلیس کے حربوں کا مقابلہ کرو۔ یاد رکھو تم تنہا نہیں ہو۔

فَإِذَا مَا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۳۸)

لیکن (یاد رکھو) جب ہماری طرف سے تمہارے پاس ضابطہ حیات آئے گا تو تم میں سے جو کوئی اس ضابطہ کی پیروی کرے گا اس کے لئے نہ کسی طرح کا کھٹکا ہو گا نہ کسی طرح کی غمگینی۔

اس کا علاج | ابلیس کے جنود و عساکر سے خوف اور اپنی اُمیدوں کی موت سے حزن دونوں ایمان کی کمزوری کی دلیل اور ضعف خودی کا مظاہرہ ہیں۔ ایمان کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ خوف اور حزن پاس نہ پھٹنے پائیں۔ یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق ابلیس سے کہہ دیا گیا تھا کہ جاؤ، اپنا سارا زور لگا کر دیکھ لو۔

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (۱۷/۶۵)

میرے بندوں پر تیرا قبضہ نہیں ہو سکے گا۔

شمع ایمانی کا ایک لمحہ | ذرا تصور میں لائیے وہ وقت کہ چاروں طرف سے مخالفتوں کے ہجوم نے گھیر رکھا ہے۔ گھر بار چھوڑ کر ایک ویرانے پہاڑ کے مہیب غار میں چھپے بیٹھے ہیں۔ تعاقب کرنے والے گھوڑوں کی ٹاپ کی آوازیں کانوں میں آرہی ہیں۔ دشمن اپنے پورے سامانِ ہلاکت کے ساتھ قریب سے قریب تر ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ بالکل بھلا دھماکا دشمن کی عین زد میں آچکے ہیں۔ بظاہر حفاظت کا کوئی سامان اور مدافعت کا کوئی ذریعہ موجود نہیں۔ گویا ابلیس کا پورا لشکر اپنی ساری قوتوں کے ساتھ طوفانِ بلا کی طرح اُمٹے چلا آ رہا ہے۔ ایک دوست دوسرے کی پیشانی پر کچھ تردد کے آثار محسوس کرتا ہے اس کا یہ تردد اپنی خاطر نہیں بلکہ اس ذاتِ اقدس و اعظم کی خاطر ہے جو دنیا کی ہر شے سے محبوب ہے کہ ایسے میں ایمان کی پوری پوری قوتوں کے ساتھ

زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ایک دنیا جلو میں لئے اس رفیقِ مشفق کے قلبِ مطمئن سے یہ جان بخش آواز آتی ہے کہ

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ﴿۹/۴۰﴾

غمگین نہ ہو یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

یہ ہے وہ ”مقامِ عبدیت“ جس کا ذکر اوپر کی آیت میں کیا گیا ہے اور جہاں انسان ابلیس سے مغلوب نہیں ہو سکتا۔

دوسری طرف ابلیس کی سرکشی پر غور کیجئے جس انداز سے قرآن کریم میں اس کا قصہ مذکور ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسے اپنے غلبہ و استیلاء پر کس قدر ناز ہے۔ اس کے بعد سوچئے کہ انسان (جس کا منصب حیات یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں کشمکشِ حیات کے ہر معرکہ میں ابلیس کی ہر قوت کو اس طرح شکست دے کہ اس کی ہڈیاں چٹخنے لگ جائیں) کتنی بڑی قوتوں کا مالک بنایا گیا ہے لیکن یہ قوتیں صرف ایمان اور اعمالِ صالحہ سے بیدار ہوتی ہیں۔ وہ اعمال جو اس میں یہ صلاحیت پیدا کر دیں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی ابلیسی قوت اس کے سامنے آئے لیکن جب یہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کی طرف ہاتھ بڑھائے تو اس پر لرزہ طاری ہو جائے، اس کا کلیجہ کانپ اٹھے، آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہو، وہ میدان چھوڑ کر پہاڑوں کے غاروں میں مُنہ چھپاتا پھرے۔ یہ ہے ابلیس کے مقابلہ میں ایک مردِ مومن کا مقام، لیکن کیا آج کا مسلمان بھی اس مقام کا وعیدار ہو سکتا ہے۔ وہ ابلیس اور ہم! مسلمان جس کی حالت یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی طاغوتی قوتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ ابلیس کی قوت کے تصور سے اس کی روح کانپ

اٹھتی ہے۔ ابلیسی نظام اپنے پورے دبدبہ و جلال سے دنیا پر چھا رہا ہے اور یہ اس کے ماتحت تہمتِ اطمینان سے زندگی بسر کرتے جا رہا ہے۔ قرآن نے کہا تھا کہ جب ابلیس کا مقابلہ ہو تو فوراً اپنے آپ کو تائید و نصرتِ خداوندی کی پناہ میں لے آیا کر دو اس کے قوانین کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن پناہ آج (أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ) کے الفاظ دہرانے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ نتیجہ یہ کہ آج ابلیس کو کسی تردد کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم خود لپک کر اس کے دام میں گرفتار ہونے کے لئے چلے جاتے ہیں۔

صید خود صیتا در اگوید بگیر

الاماں از بندہ فرماں پذیر

ہم تو ابلیس کی کشش و جاذبیت کے ذرا سے فریب اور اس کی تحریف و ترہیب کی چھوٹی سی دھمکی کے بھی حریف نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ اس کی قہر مانی قوتوں کو استحقار کی مہنسی سے ٹھکر کر رکھ دیں۔ ابلیس کی فرعون قوتوں کا تو تقاضا ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی فولادی پنجے والا مرد مومن آئے جس سے دو ہاتھ کرنے میں اسے بھی لذت پیکار ملے۔ ان مٹی کے پتلوں سے زور آزمائی میں اسے کیا لذت مل سکتی ہے؟ اسی لئے اُس نے (بالفاظ علامہ اقبالؒ) بحضور رب العزت ”فریاد“ کی ہے کہ ے

آں چنال تنگ از فتوحات آدم پیش تو بہر مکافات آدم

متکبر خود از تومی خواہم بدہ سوئے آں مرد خدا را ہم بدہ

بتدہ باید کہ پیچد گردنم لرزہ اندازد نگاہش در تنم

اے خدا! ایک زندہ مرد حق پرست لذتے شاید کہ یا ہم در شکست

لیکن آج ایسا بندہ حق پرست کہاں سے ملے؟ اس قسم کے مردان خود آگاہ و خدا مست صرف اُس معاشرے میں پیدا ہو سکتے ہیں جو قوانین خداوندی کی رُو سے مشکل کیا جائے اور ایسا معاشرہ آج اس وسیع و عریض زمین کے کسی چپہ بھر گوشے میں بھی موجود نہیں ہے۔ اس لئے آج ساری دنیا پر ابلیسی نظام ہی مسلط ہے۔ یعنی وہ نظام جس میں عقل انسانی اس کے جذبات کی لونڈی بن کر رہ گئی ہے اور زندگی کا مقصد رہ گیا ہے ان حیوانی جذبات کی تسکین۔ انسانیت اور اس کے شرف کا دنیا میں کہیں نام نہیں اسی لئے دنیا میں کہیں احترام آدمیت نہیں۔

لیکن اس کے باوجود ہمارے لئے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لئے کہ ابلیس پر غالب آنے کا طریق بتایا گیا تھا ”وحی خداوندی کا اتباع“ اور وحی خداوندی ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ ہمارا جب بھی جی چاہے ایسا معاشرہ مشکل کر سکتے ہیں جس میں یہ قوانین خداوندی عملاً نافذ ہوں۔ یہی معاشرہ ابلیس کے چیلنج کا جواب اور ہماری ناامیدیوں کا علاج ہوگا۔



”ابلیس اور شیطان“ میں کیا ربط باہمی ہے؟ اسے ”شیطان“ کے عنوان میں واضح کیا

جن

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، ابلیس کے متعلق کہا ہے کہ
وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدْوا لِآدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبٰلٰیۤسَ
كَانَ مِنَ الْجٰنِ (۱۸/۵۰)

اور جب ہم نے ملائکہ کو حکم دیا آدم کے آگے جھک جاؤ تو وہ سب جھک گئے تھے۔ مگر
ابلیس نہیں جھکا۔ وہ جن میں سے تھا۔

اور یہ بھی کہ اس کی پیدائش آگ سے ہوئی تھی۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ
خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَ خَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ ۝ (۷/۱۲)

خدا نے فرمایا ”کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟“ کہا اس
بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا۔ اسے مٹی سے۔

دوسرے مقام پر ہے کہ اللہ نے جان (جن) کو آگ سے پیدا کیا۔

وَ خَلَقَ الْجٰنَ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۵۵/۱۵)
اور جنات کو آگ سے شعلے سے پیدا کیا۔

اور انسان کو ان کے بعد پیدا کیا۔

وَ الْجٰنَ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (۱۵/۲۴)

اور ہم نے جان کو اس سے پہلے تیز آگ سے پیدا کیا۔

جن ایک آتشیں مخلوق | ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ جن ایک آتشیں مخلوق تھی جسے اللہ نے انسان سے پہلے پیدا کیا تھا۔ یعنی ایسی

مخلوق جس میں انسان کی نسبت حرارت زیادہ تھی۔ اسی اعتبار سے اس مخلوق کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوئی تھی جس طرح انسان کے متعلق کہلے کہ وہ مٹی سے پیدا ہوا ہے۔ ابلیس کے متعلق اس کی خونے سرکشی کی وجہ ہی سے کہا گیا ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا۔ (مزید تفصیل شیطان کے عنوان میں ملیگی)

لفظ جن کے معنی ہیں پوشیدہ، مستور، نگاہوں سے اوجھل، غیر مرئی جب یہ کثرۃ ارض سورج سے الگ ہوا ہے تو ایک بگھلا ہوا آتشیں مادہ تھا۔ قرنہا قرن کے بعد فضا کی برودت سے اس کا اوپر کا حصہ سخت ہونا شروع ہوا جیسے دودھ پر بالائی جم جاتی ہے لیکن نامعلوم اس کثرۃ نار کو کس قدر طویل المیعاد مراحل سے گزرنا پڑا کہ بالآخر یہ ذی حیات آبادی کے قابل ہوا۔ تبدل و تحوّل کے ان ابتدائی ادوار میں یہاں کس قسم کی مخلوق تھی جسے اس کی آتشیں فضا سازگار تھی، اس کا ہمیں علم نہیں لیکن وہ مخلوق اب قصۃ پاریزہ ہو چکی ہے۔ اس کی جگہ انسانی آبادی نے لے لی۔ علم الانسان کے ماہرین اس سلسلہ ارتقاء کی گم گشتہ کڑی (MISSING LINK) سے تعبیر کرتے ہیں جس کا اب تک حتمی

طور پر سراغ نہیں لگ سکا۔ اس مخلوق سے آج ہمارا تعلق اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے جس پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن ذہن انسانی جب اپنے عہد طفولیت میں تھا تو اس کی حالت عجیب تھی۔ وہ ہر اُس قوت کو جو نگاہوں سے اوجھل ہوا اور ہر اُس مافوق الفطرت واقعہ کو جس کا سبب بظاہر معلوم نہ ہو سکے، خارق عادت سمجھ کر اس سے خوف کھانے لگتا اور اُس کے مضر اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے اس کی خوشامدیں کرتا۔ جس کا اظہار پرستش کی صورت میں کیا جاتا۔ بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، بارش، زلزلے اور اسی قسم کے دیگر حوادث و واقعات جن کی علت و حقیقت اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اس کی عقل و ہوش کو چکر میں ڈالنے کے لئے کافی تھے وہ ان غیر مرئی حوادث کو مافوق الفطرت قرار دیتا۔ انہیں دیوتا (دیو) سمجھتا اور ان کی پرستش کرتا۔ اسی طرح ایسے اعصابی امراض (مثلاً مرگی، ہسٹیریا وغیرہ) جن میں مریض بے ہوش ہو کر طرح طرح کی حرکتیں یا باتیں کرنے لگتا اس کے لئے سامان خوف و ہراس پیدا کر دیتے۔ وہ سمجھ نہیں سکتا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ (وہ تو خیر پھر بھی ذہن انسانی کا بچپن کا زمانہ تھا۔ آج بھی ہسٹیریا کا دورہ دیکھنے والوں کے

لئے خوف اور حیرت کے عجیب و غریب سامان پیدا کر دیتا ہے) لامحالہ وہ یہی سمجھتا کہ یہ بھی کسی دیوی دیوتا (جیسی ہوتی قوت) کا کارنامہ ہے۔ یہ تھی اس توہم پرستی کی ابتدا۔ رفتہ رفتہ ذہن انسانی کے توہم پرستانہ کارخانے میں ان پوشیدہ قوتوں کے محسوس ہونے شروع ہوئے اور آہستہ آہستہ ان کے جداگانہ نام تجویز ہوئے اور الگ الگ کام ان کی طرف منسوب کئے گئے۔ جن، بھوت، دیوتا، چڑیل، پرتی، ارواح خبیثہ اور نہ معلوم کیا کیا خرافات۔ چونکہ (جیسا کہ اوپر کہا چکا ہے) ان کی طرف مافوق الفطرت قوتیں منسوب کی گئیں، اس لئے ان کی پرستش بھی شروع ہو گئی۔ اس کی ابتدا تو انسان کے ابتدائی مراحل زندگی میں ہوئی۔ لیکن، جیسا کہ ہر مسلک کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے، چونکہ یہ سلسلہ بھی مختلف اقوام میں نسلاً بعد نسل متواتر چلا آیا اس لئے جہالت آمیز ملکوں اور قوموں میں یہ باتیں آج تک اسی طرح چلی آرہی ہیں۔ نزول قرآن کریم کے وقت عربوں کے ہاں بھی یہی حالت تھی۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں اس کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ النعام میں ہے:

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّۃَ... (۶/۱۰۰) (نیز ۳۲/۴)

اور (دیکھو) ان لوگوں نے خدا کے ساتھ جنوں کو (طاقت و

تصرف میں) شریک ٹھہرایا ہے۔

یہ تو دور جاہلیت کی باتیں تھیں۔ لیکن خود مسلمانوں نے ان خرافات سے کس قدر اثر قبول کیا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا ہو تو ایک نظر جھانکئے کسی خانقاہ کے گوشے کسی اونچی قبر کے سر پرانے، کسی ”صاحبِ مجاز“ کے تعویذ خانے یا کسی ”عالمِ قرآن“ کے معمل میں۔ اور پھر دیکھئے کہ یہ قوم جسے اللہ تعالیٰ نے ایسی عالمتاب روشنی عطا فرمائی تھی توہم پرستیوں کے کن کن ظلمت گدول میں ٹھوکریں کھا رہی

ہے۔ یہیں تک ہی نہیں بلکہ قیامت تو یہ ہے کہ بڑے بڑے اربابِ علم بھی اسی ادھام پرستی کے چکر میں مبتلا ہیں۔ فلاں مکتب میں ایک جن پڑھتا تھا۔ ایک دن وہ بچوں کے ساتھ کھیلتا کھیلتا مسجد کی بدھنی میں جا چھپا۔ جب اس کا راز یوں ناش ہو گیا تو حضرت صاحب نے فرمایا کہ اب تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیئے۔ یہ اور اسی قسم کے واقعات بڑے بڑے اربابِ علم و فضل کی طرف منسوب ہیں اور ان سے ان کی بزرگی اور عظمت کی دلیل لائی جاتی ہے۔ (باقی اگلے صفحے پر دیکھئے)

ہے۔ یورپ نے تنہا عقل کے جگنو کی روشنی سے ان اہام و باطیل سے نجات حاصل کر لی لیکن جن کے صحن خانہ میں آفتاب صوفشاں ہے وہ چمکا ڈر کی طرح اپنی آنکھیں بند کئے اندھوں کی دنیا میں بس رہے ہیں۔



چونکہ جن کے معنی تھے پوشیدہ اور اس کا تصور ذہن کو بڑی قد آور، دیو میکل، شعلہ صفت مخلوق کی طرف منتقل کرتا تھا۔ اس لئے عربی زبان میں ایسے وحشی قبائل پر جو آباویوں سے دور صحراؤں اور جنگلوں میں رہتے تھے اور شہری لوگوں سے زیادہ طاقتور اور ڈیل ڈول میں زیادہ قوی اور مضبوط تھے **انسانی جنات** الفظ جن کا اطلاق کیا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے ہنڈب اور غیر ہنڈب احضری اور بدوی (شہری اور جنگلی) کی تمیز کے لئے انس (باہمی موانست سے رہنے والے) اور جن کے الفاظ استعمال ہونے لگے۔ آج جبکہ ذرائع رسل و رسائل کی عام فراوانی کی وجہ سے شہری تمدن کے اثرات دور دراز دیہات حتیٰ کہ خانہ بدوش قبائل (NOMADIC TRIBES) تک جا پہنچے ہیں شہری اور بدوی آباویوں کے طرز تمدن نفسیاتی کیفیات، سیاسی احوال و ظروف، رجحانات قلبی و ذہنی وغیرہ میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہا۔ لیکن اُس زمانہ میں یہ فرق ایسا گہرا اور دونوں کی درمیانی خلیج اتنی وسیع تھی کہ یہ امتیازی خط ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ قرآن کریم میں جن و انس کے الفاظ ان ہی معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ قصہ حضرت سلیمان کے ضمن میں فرمایا:

وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ وَالْأَطْيَرِ
فَإِذَا يُؤْذَعُونَ ۝ (۲۴/۱۷)

اور سلیمان کے لئے اس کے لشکر جنوں، انسانوں اور قوم طیر سے اکٹھے کئے گئے اور انہیں (احضری کے لئے) ایک جاکھڑا کیا جاتا تھا۔

جیسا کہ حضرت سلیمان کے تذکرہ میں تفصیلی طور پر لکھا جائے گا۔ یہ جنات پہاڑی اور جنگلی علاقوں کے دیو ہیکل

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) ۛ ناطقہ سرگرمیاں ہے اسے کیا کہیے
قرآن کریم سے جنات کے متعلق ایسی باتوں کی کوئی سند نہیں ملتی۔

مضبوط اور توانا سرکش قبائل تھے۔ جنہیں حضرت سلیمانؑ نے اپنے محلات (اور بالخصوص میکہ) کی تعمیر کے کاموں پر لگا رکھا تھا۔ بنی اسرائیل، حاکم قوم کے افراد تھے، اس لئے انہیں اس قسم کے مزدورانہ کاموں پر نہیں لگایا جاتا تھا۔ ان کاموں کے لئے غیر اسرائیلی اجنبی لوگ منگائے جاتے تھے۔ یہ قوی، سرکش، اجنبی لوگ جن کے نام سے پکارے گئے ہیں۔ (دیکھئے ۲۴/۳۹ ذ ۱۲ - ۳۲/۱۳ ذ ۲۱/۸۲)۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ان تمام امور کی تشریح حضرت "سلیمان" کے عنوان میں ملے گی۔

جن و انس | سورۃ النعام میں ہے کہ جن و انس (شہری اور بدوی آبادیوں) کے سرکش و شریر انسان حضرات انبیائے کرامؑ کی دعوت الی الحق کے دشمن ہو کر تھے۔ (دیکھئے ۹/۱۱۳)۔ اس سے ذرا آگے (۹/۱۳۱ میں) "جن و انس" کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ خدا نے تمہاری طرف تم میں سے رسول بھیجے تھے، موعومہ "جنوں" کی طرف بھیجے گئے کسی رسول کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے۔ تمام رسول انسانوں کی طرف ہی آتے تھے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ "جن و انس" دونوں انسانوں ہی کی دو جماعتیں ہیں۔ انس، شہروں کی مہذب آبادی اور جن صحراؤں کے بادیہ نشین، جو شہری آبادی کی نگاہوں سے اوجھل اور بیابانوں میں رہتے تھے۔ لہذا، قرآن کریم میں جہاں جہاں "جن و انس" کا ذکر ہوگا، اس سے مراد انسانوں کی یہی دو جماعتیں ہوں گی۔

جنات کا قرآن سننا | جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے نزول قرآن کے زمانے میں عرب کی آبادی کے دو مخصوص طبقے تھے ایک طبقہ حضرت کی (شہری) زندگی بسر کرتا تھا اور دوسرا طبقہ صحرا نشین بدوؤں کا تھا جو آبادیوں سے دور نگاہوں سے اوجھل رہا کرتے تھے جس طرح ہمارے ہاں خانہ بدوش قبائل رہتے ہیں ان دونوں کی نفسیاتی کیفیات تمدنی ضروریات اور طبعی خصائص و عادات میں بڑا فرق تھا۔ قرآن کی دعوت ان دونوں گروہوں کے لئے تھی لیکن ظاہر ہے کہ ان دونوں سے اندازِ مخاطب اور طریقِ تبلیغ یکساں نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے ان صحرا نشین قبائل کا ذکر الگ بھی کیا ہے۔ ان تہیدی اشارات کی روشنی میں قرآن کریم کی ان آیات کا مفہوم باسانی سمجھ میں آ سکتا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ "جنات" (حضورؐ سے) قرآن سننے کے لئے آئے تھے۔ (دیکھئے ۲۹ - ۳۲/۳۶)۔ وہ حضرت موسیٰؑ کا ذکر کرتے تھے جس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ یہودیوں کے سے عقائد رکھتے تھے یا خود یہودی ہی تھے۔ ان کی مزید تفصیل (آیات ۱ - ۴/۷۶) میں بھی دی گئی ہے۔

سلسلہ رشد و ہدایت صرف انسانوں کیلئے ہے | جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، دنیا میں

کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ قصہ آدم پر ایک بار پھر نگاہ ڈالئے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ رسولوں کی بعثت، ہدایت خداوندی کا نزول، سب بنی آدم کے لئے تھی۔ یہ سلسلہ ہدایت، بنی آدم کے علاوہ کسی اور مخلوق کے لئے نہیں ہے۔ (دیکھتے ۹۴-۱۴/۹۵)۔ ان آیات میں کہا گیا ہے کہ چونکہ زمین پر انسان بستے ہیں اس لئے ایک انسان ہی کا رسول بنا کر بھیجا جانا ضروری تھا۔ اگر فرشتے بنے تو فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجا جاتا۔ اور علیٰ ہذا القیاس، اگر یہاں آتشیں مخلوق کے جنات آباد ہوتے تو ان ہی میں سے رسول بھیجا جاتا یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم کی رسالت نوع انسانی ہی کے لئے ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا (۱۵۸/۷)

نیز ۳۲/۲۸: (۱۰/۵۷)۔

دائے پیغمبر اتم لوگوں سے (کہو) اے افرادِ نسلِ انسانی! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔

ان حقائق کو سامنے رکھتے اور پھر سوچئے کہ انسانوں کو چھٹ جانے والے جنات، بھوت، پریت، سایہ، چڑیل، ارواحِ خبیثہ وغیرہ، قسم کے خرافات و باطل کا ایک مسلمان کے دماغ میں کبھی گزر بھی ہو سکتا ہے؟ وہ جس کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارض و سموات کی ہر چیز کو تابع فرمان بنا دیا۔ اس قسم کی توہم پرستی کسی طرح اس کے قریب بھی پھٹک سکتی ہے؟ جنہیں جنات اور بھوتوں کا سایہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کی حقیقت اعصابی امراض کے سوا اور کچھ نہیں۔ جب تک دنیا و دیر جہالت سے گزر رہی تھی ان امراض کو جن کے اسباب و

بھوت اور جنات دراصل کیا ہوتے ہیں؟ | عللِ سمجھ میں نہیں آتے تھے، مافوق الفطرت قوتوں کے اثرات پر محمول کیا جاتا تھا۔ ابھی کل تک یورپ کی بھی یہی حالت تھی۔ لیکن انہوں نے ان چیزوں کی تحقیق کی اور رفتہ رفتہ علم و عقل کی روشنی سے توہم پرستی کی ان سیاہ چادروں کو ایک ایک کر کے الگ کر دیا۔ لیکن جہاں ابھی جہالت کا تسلط ہے وہاں اس قسم کی توہم پرستی اچھے بھلے لوگوں کے سر پر سوار ہے۔ دنیا کی اور تو میں اس قسم کے خرافات میں الجھ کر رہ گئی تھیں تو یہ

امر کچھ ایسا تعجب خیز نہ تھا اس لئے کہ ان کے ہاں علم و بصیرت تھا کہاں؟ لیکن سب سے بڑی بد قسمتی تو مسلمانوں کی ہے کہ قرآن جیسی روشنی رکھتے ہوئے اس قسم کے خرافات کے طلسم ہوش ربا میں جکڑے چلے آ رہے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ اس قسم کے امراض کا علاج عملیات سے ہو جاتا ہے سو اس کی تشریح سحر کے عنوان میں ملے گی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ اعصابی امراض کا گہرا تعلق انسانی اعصاب سے ہوتا ہے (انہیں اس لئے اعصابی امراض کہا جاتا ہے) اور انسانی اعصاب پر قوت خیال کا اثر نفیست کار و زمرہ کا مشاہدہ ہے۔ عملیات و شعبہات سب قوت ارادی کے کرشمے ہیں۔ علم تجزیہ نفس کا مشہور امام (ڈاکٹر فرانڈ) اسی حقیقت مستور کی تحقیق میں نکلا اور ایک ایسے عامل کے ہاں پہنچا جو مسمریزم (قوت ارادی) سے اس قسم کے اعصابی امراض کا علاج کیا کرتا تھا، فرانڈ نے مسمریزم سیکھا، اس پر عمل بھی کیا۔ لیکن اس کے بعد اور آگے بڑھائے اس پر یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ ان امراض کا تعلق یکسر اعصاب سے ہے اور ان کا علاج نفسیاتی اثرات سے کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ تو ہم پرستی کے اس طوار کی سائنٹفک توجیہات سامنے آتی گئیں۔ یورپ اور امریکہ میں آج اس فن کے ”عامل“ ہر جگہ موجود ہیں۔ لیکن وہ ڈاکٹر ہی کہلاتے اور سمجھے جاتے ہیں، اس سے زیادہ اور کچھ قرار نہیں دیئے جاتے۔ اس لئے اُن کی پرستش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس قسم کے توہمات کی پرستش تو ”مسلمان“ ہی کے حصہ میں آئی ہے جو دنیا کے ہر پتھر اور ہر بڑی دہلیز پر جھک جاتا ہے اور اسے قرب الہی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اسی قسم کی توہم پرستی میں ایسے واقعات بھی شامل ہیں جو آئے دن کہیں نہ کہیں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کہیں کسی مکان میں پتھر آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ کہیں خود بخود کپڑے جل اٹھتے ہیں۔ کہیں چیزیں غائب ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر محنت اور کاوش سے تحقیق کی جائے تو ان تمام حوادث کے اسباب کا سراغ لگایا جاسکتا ہے لیکن اگر کسی وجہ سے سراغ نہ بھی لگے تو کوئی بھی قرینہ نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی غیر مرئی، آتشیں مخلوق ہے جو اس طرح انسانی معاشرے میں فساد انگیزیاں کرتی رہتی ہے۔ یاد رکھئے! قرآن کی رو سے اس قسم کے عقیدے یا تصور کی کوئی گنجائش نہیں، قرآن کی رو سے انسانوں کی پیدائش سے پہلے یہاں کوئی مخلوق آباد تھی جس کا اب انسانوں سے کوئی واسطہ نہیں، اسے آتشیں مخلوق کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن میں ”جن و انس“ کے ضمن میں جن جنات کا ذکر ہے ان سے مراد عرب کے صحرائین خانہ بدوش قبائل ہیں۔ اور بس!

جان بمعنی سانپ | عربی زبان میں جان بمعنی سانپ بھی مستعمل ہوا ہے۔ غالباً اس کی شعلہ نفسی اور آتش مزاحی کے اعتبار سے۔ قصہ حضرت موسیٰ کے ضمن میں یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے۔ (دیکھئے ۲۴/۱۰ و ۲۸/۳۱)۔



خلاصہ بحث | نفس انسانی اپنی مستور قوتوں اور خواہیدہ جوہروں کی نمود کے لئے متضاد عناصر سے مزاحمت و کشمکش کا محتاج ہے۔ دنیا کے میدان سعی و عمل میں ان متخاصم قوتوں کا نام ابلیس ہے۔ ابلیس کی فطرت میں سرکشی و طغیان ہے۔ یہ عقل بیباک اور علم سرکش کا منظر ہے۔ یاہوں سمجھئے کہ انسان کے ان جذبات کا نام جو وحی کے تابع نہیں رہتے، اس کی تخلیق شعور آدم کے ساتھ ہوئی اور جب تک اس دنیا میں بنی آدم کا وجود ہے یہ اس کے ساتھ موجود رہے گا۔ لہذا یہ ابلیسی قوتیں فنا نہیں ہو سکتیں۔ مومن کا شیوہ یہ ہے کہ انہیں مستحضر کرے اور قوانین الہیہ کے تابع لے آئے۔ واضح رہے کہ یہ عقیدہ مجوسیوں کے عقیدہ ثنویت سے اساسی طور پر مختلف ہے جس کی رو سے نیکی کا خدا الگ اور برائی کا خدا الگ مانا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس بنیادی مسئلہ نے ذہن انسانی کو آج تک طلسم پیچ و تاب بنائے رکھا ہے وہ خیر و شر کا مسئلہ ہے۔ یہ ایک ایسی الجھی ہوئی ڈور ہے کہ ذہن انسانی نے اُسے جس قدر سلجھانے کی کوشش کی ہے یہ اور زیادہ الجھتی گئی ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں نیکی کا تصور ہے اس کے مقابلے میں بدی کا تصور موجود ہے۔ جہاں خدا کا تصور ہے اس کے مقابل میں ابلیس یا شیطان کا تصور ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے حریف کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں ہر رام کے ساتھ ”راون“ مصروف پیکار دکھائی دیتا ہے۔ ہر یزداں کے مقابلہ میں ”اہرمین“ ستیزہ کار نظر آتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دونوں متضاد قوتیں ”شروع سے آج تک ایک دوسرے کے مد مقابل صف آرا نظر آتی چلی آرہی ہیں لیکن قرآن نے ابلیس کا جو تصور پیش کیا ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ اس نے ابلیس کو ایک ایسی قوت کی حیثیت سے پیش نہیں کیا جو خدا کی حریف اور اس کے ساتھ پہنچ لگن ہو۔ کائنات میں کونسی قوت ایسی ہو سکتی ہے جسے خدا کی شریک سمجھا جائے اور شریک بھی ایسی کہ وہ خدا کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑی ہو جائے؟ قرآن نے بتایا ہے کہ اختیار و ارادہ صرف خدا کو حاصل ہے۔ کائنات کی چیز کو یہ قوت حاصل نہیں۔ خدا نے

اپنی اس قوت کا ایک شمعہ انسان کو عطا کیا ہے۔ جس کی رُو سے یہ اپنے محدود دائرے کے اندر صاحب اختیار ارادہ ہو گیا ہے۔ اس قوت کے ماتحت وہ اپنے لئے آپ فیصلے کرتا ہے۔ کائنات میں خدا کا قانون جاری و ساری ہے۔ انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ایسی روش اختیار کرے جو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو اور چاہے تو اس کے خلاف راستہ اختیار کر لے۔ یعنی وہ چاہے تو اپنی قوتوں کو ایک طرف لے جا اور چاہے تو ان کا رخ دوسری طرف موڑ دے۔ جب انسان اپنی قوتوں کو قانونِ خداوندی کی مطابقت میں صرف کرے تو اسے وحی کی اطاعت کہتے ہیں اس لئے کہ انسانی معاشرہ کے لئے خدائی قوانین صرف وحی کی رُو سے ملتے ہیں۔ اور جب وہ اپنی قوتوں کو اس راستے کے خلاف استعمال کرے تو اس کا نام قانونِ خداوندی سے سرکشی ہے۔ اس کو قرآنی اصطلاح میں ابلیس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ ابلیس کسی خارجی قوت کا نام نہیں جو خدا کے برعکس ہے۔ یہ محض انسانی قوتوں کے استعمال اور صرف کی ایک شکل کا نام ہے۔ یعنی وہ شکل جس میں انسانی قوتیں وحی کے مقرر کردہ قاعدے کے خلاف صرف ہوتی ہیں۔ جب انسان اپنی قوتوں کو وحی کے مطابق صرف کرنے لگ جاتا ہے تو اس کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس پر ابلیس کا غلبہ و تسلط نہیں رہا۔ درحقیقت اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ انسان نے اپنے اختیار و ارادہ کو صحیح طور پر استعمال کیا ہے اور اپنے لئے وہ راستہ چنا ہے جو وحی لے اس کے لئے مقرر کیا تھا اور جس سے وہ منزلِ انسانیت تک باسانی پہنچ جائے گا۔ ان تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ ابلیس کسی ایسی قوت کا نام نہیں جو خدا کے برعکس ہے۔ بلکہ ایسی قوت کا دنیا میں وجود ہی نہیں۔ لہذا اہلِ ہر مذہب و دین کو دو مستقل قوتیں تسلیم کرنا مجوسیّت کی ثنویت ہے جس نے انسانی فکر کو بُری طرح سے متاثر کیا ہے۔ یہی ثنویت مختلف زمانوں میں مختلف لباس پہن کر سامنے آتی رہی ہے۔ روح اور مادہ کی ثنویت (اس کو ہندی فلسفہ میں آتما و پراکرتی کا بے کہتے ہیں) لیکن ابلیس کے قرآنی تصور میں یہ ثنویت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ ابلیس نام ہے اس فیصلہ کا جو انسان کو وحی کے خلاف چلنے پر آمادہ کر دے۔ اسی کو عقلِ بیباک اور علمِ سرکش کہتے ہیں۔ اگرچہ اس فیصلہ کے نتائج شروع میں بڑے دیدہ زیب اور خوش آئند دکھائی دیتے ہیں لیکن مستقبل میں ان کا اثر ہمیشہ تلخ ہوتا ہے جس سے انسان پر سخت ناامیدی طاری ہو جاتی ہے۔ ناامیدی کو عربی زبان میں بلس کہتے ہیں اور یہیں سے ابلیس کا لفظ نکلا ہے۔



إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ

شیطان

(ابلیس کا پیکر آتشیں)

بدل کے بھیس زمانہ میں پھسکے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدمِ جوان ہیں لاکھ منات

شیطان

قصہ آدم میں ایک چیز بڑی نمایاں طور پر سامنے آتی ہے۔ سجدہ سے انکار، قیامت تک کے لئے مہلت۔ ذریت آدم کو بہکانے کا چیلنج۔ سب ابلیس کی طرف سے ہے۔ لیکن جب اس کے بعد آدم کی لغزش کا ذکر ہے تو وہاں اُسے شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ عنوان آدم کے تحت اس ضمن میں مختلف آیات کو ایک مرتبہ پھر دیکھئے۔ سورہ بقرہ میں انکار سجدہ اور آدم کو شجرہ ممنوعہ سے احتراز کے حکم کے بعد فرمایا:

فَاَزَلَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا (۲/۳۶)

پھر شیطان کی وسوسہ اندازی نے ان دونوں کے قدم ڈگمگادیئے۔

سورہ اعراف میں فرمایا:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ (۷/۲۰)

لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان کی طرف وسوسہ ڈالا۔

سورہ طہ میں ہے:

فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ (۲۰/۱۲۰)

لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے اس کی طرف وسوسہ ڈالا۔

ان مقامات سے ایسا مترشح ہوتا ہے گویا ابلیس اور شیطان دو الگ الگ ہستیاں ہیں

ابلیس اور شیطان | لیکن انہی آیات میں ایسی چیزیں بھی ہیں جن میں ایک ہی فعل کو بھی ابلیس کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور کبھی شیطان کی طرف مثلاً ایک مقام پر ابلیس کے متعلق کہا ہے کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے (۱۸/۵۰)۔

تو دوسری جگہ شیطان کے متعلق بھی یہی کہا گیا ہے (۷/۲۲)۔ سب سے بڑا واقعہ آدم کو جنت سے نکلوانے کا ہے۔ سورۃ طہ میں کہا گیا ہے کہ اس کا موجب ابلیس ہے (۱۱۶ — ۲۰/۱۱۷)۔ لیکن سورۃ بقرہ میں اسے شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے (۲/۳۶)۔

ایک ہی سکہ کے دو رخ | ان مقامات سے ظاہر ہے کہ ابلیس اور شیطان ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں یہ حقیقت سورۃ بنی اسرائیل میں اور بھی اُبھر کر سامنے آگئی ہے جہاں پہلے ذکر ابلیس کا چلا آ رہا ہے لیکن آخر میں کہا گیا ہے کہ

وَمَا يَعْزُبُ عَنْهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا عُرُودًا ۝ (۱۷/۶۳)

شیطان ان سے جو وعدے بھی کرتا ہے سب فریب پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس سے اگلی آیت میں ہے إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ ۖ (۱۷/۶۵) ”میرے بندوں پر تجھے غلبہ حاصل نہیں ہو سکے گا“ اور سورۃ حجر میں یہی الفاظ ابلیس کے متعلق کہے گئے ہیں (۱۵/۳۲)۔

لفظ شیطان یا شَاطْن سے مشتق ہے جس کے معنی دُوری کے ہیں۔ یعنی سعادت و رحمت سے محرومی۔ یا شَاطِشِيط سے جس کے معنی شعلوں کا بھڑکنا یا آگ میں جلنا ہیں، یعنی شعلہ مزاجی کا مظاہرہ۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ عبرانی لفظ ہے اور اصل کے اعتبار سے اس کے معنی (HINDERER) کے ہیں یعنی انسانیت کی ارتقا کے راستے میں مزاحمت کرنے والا۔

ابلیس کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس کا مادہ (ب۔ ل۔ م) ہے جس کے معنی مایوسی کے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جب انسانی جذبات اسے قانون شکنی پر اُبھارتے ہیں تو اس میں سرکشی کی نوڈ ہوتی ہے۔ یہ شیطانیت ہے (جس میں اشتعال کا پہلو نمایاں ہے)۔ لیکن جب اس قانون شکنی کے نتائج سامنے آتے ہیں تو اس سے انسان پر افسردگی اور مایوسی چھا جاتی ہے۔ یہ ابلیسیّت ہے۔ لہذا انسان کا سرکشی کا عمل اپنے آغاز کے اعتبار سے شیطنت ہے اور انجام کی رُو سے ابلیسیّت۔ اس

لئے شیطان اور ابلیس دو الگ الگ عناصر نہیں۔ یہ ایک ہی عمل کی دو جداگانہ خاصیتیں ہیں۔ اور شیاطین وہ مستبد قوتیں ہیں جو دوسروں کو قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے پر اکساتی ہیں۔

اب یہ دیکھئے کہ شیطان کون کون سے بھیس بدل کر سامنے آتا ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ

شیطان نے آدم کے دل میں دوسوہ ڈالا تھا۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ (۲۰/۱۲-۱۳)

لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں

دوسوہ ڈالا۔

یعنی دوسوہ اندازِ عملِ شیطان ہے۔ دل کے یقین کو غیر محسوس انداز سے متزلزل کر دینا۔ کسی کے عزمِ راسخ میں پھونک مار دینا (نَفَثْتُ فِي الْعُقَدِ) چپکے ہی چپکے سرگوشیوں سے قوانین خداوندی سے انحراف پر مائل کر دینا یہ سب شیطانی حربے ہیں۔ سورۃ الناس میں ہے۔

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ إِلَهِ النَّاسِ ۝ مِنْ

شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ

النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝ (۱-۴/۱۱۳)

(اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو کہ میں نوعِ انسانی کے پروردگار، مالک اور ان کے الہ کی

پناہ میں آتا ہوں۔ دوسوہ انداز (دبے پاؤں پیچھے ہٹ جانے والے شیطان) کے

شر سے جو لوگوں کے دلوں میں دوسوے ڈالا کرتا ہے (خواہ وہ) جن میں سے ہو اور

(خواہ) انس میں سے۔

خَنَّاس کے معنی ہیں چپکے ہی چپکے سمٹ کر سکر کر، دبے پاؤں پیچھے ہٹ جانے والا۔ کسی کے کان میں

سرگوشی کی، دل میں دوسوہ ڈالا، اور چپکے سے پیچھے ہٹ کر چھپ گئے۔ گویا انہیں علم ہی نہیں کہ تخریب

کے اس فعلِ شیطانی کا ذمہ دار کون ہے؟ اور یہ خَنَّاس کون ہیں؟ ”مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ“

جن کی شرح سابقہ عنوان میں گزر چکی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ شیاطین، وہ انسان ہی ہیں جو

دوسروں کے عزمِ راسخ میں دوسوہ انداز یوں سے لغزش پیدا کرتے ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے کہ

خود انسان کا نفس بھی وسوسہ اندازیاں کرتا رہتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَ
نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۝ (۵۰/۱۶)

اور بلاشبہ انسان کو ہم نے پیدا کیا ہے۔ اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کا نفس
اس کے (دل) میں کیا کچھ وسوسے ڈالتا ہے اور ہم اس کی شہ رگ (رگ جان) سے
بھی زیادہ قریب ہیں۔

یہ نفس (جو اس طرح وسوسہ اندازی کرتا ہے) انسان کے مفاد پرستی کے جذبات ہیں جو اسے حق و
صداقت کی راہ میں قدم اٹھانے سے روکتے رہتے ہیں۔ یہی وہ شیاطین (یعنی انسان کے مختلف خیالات)
ہیں جو ان مقامات سے حملہ کرتے ہیں جو ان کو نظر تک نہیں آتے۔ شیطان کے اس لشکر کے متعلق
کہا ہے کہ

إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْهُمْ ۖ وَإِنَّا جَعَلْنَا
الشَّيَاطِينَ أَزْوَاجًا لِلَّذِينَ كَفَرُوا مُتَوَاتِرِينَ ۝ (۷۲/۷)

وہ اور اس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم اسے نہیں دیکھتے۔ یاد رکھو ہم نے یہ
بات کٹھنرادی ہے کہ جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے رفیق و مددگار شیاطین
ہوتے ہیں۔

نگاہ فریب آرزوئیں | پھر اگر ایک طرف شیطان صحیح راہِ عمل سے بہکانے کے لئے دلوں

میں وسوسے ڈالتا ہے تو دوسری طرف دلوں میں نگاہ فریب اور
سراب آسا غلط آرزوئیں پیدا کر کے انسان کو باطل کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہی ہے کہ
وَلَوْ ضَلَّٰهُمْ لَأُوْمِتْنَاهُمْ (۴/۱۱۹) ”میں انہیں گمراہ کروں گا اور ان کے دل میں جھوٹی آرزوئیں
بیدار کرتا رہوں گا۔“ وہ باطل آرزوئیں پیدا کرتا ہے اور ان آرزوؤں کے حصول کے لئے جتنی کوششیں
کی جاتی ہیں انہیں نہایت خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے تاکہ کسی قدم پر بھی اس کا احساس نہ ہو سکے کہ جس
راستے پر چل رہے ہیں وہ کامیابی اور کامرانی کے بجائے تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لئے
جا رہے ہیں۔ اعمال کو مزین بنا کر دکھانا، یہ سب سے بڑا فریب ہے جو شیطان کی طرف سے دیا جاتا

زینت اعمال | ہے۔ وہ باطل کی مورتیوں کو ایسے حسین و جمیل، مرضع اور منقش پردوں میں چھپاتا ہے کہ نگاہیں ان کے نقش نگار میں الجھ کر رہ جاتی ہیں اور جاذبِ توجہ فریب کاریوں کے سچے چھپی ہوئی حقیقت تک پہنچنے نہیں پاتیں۔ اسی کا نام ہے زینتِ اعمال وَ زَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۶/۴۳) شیطان ان کی نگاہوں میں ان کے غلط اعمال کو مزین (حسین) بنا کر دکھاتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کے بُرے اعمال اس کی نگاہوں میں اچھے بن کر نظر آئیں تو یہ وہ فریب ہے جس سے اس کا نکلنا ناممکن نہیں تو محال ضرور ہو جاتا ہے۔ انسان کی عقل حیلہ جو کرتی ہی یہ ہے کہ اس کے غلط کاموں کے حق میں ایسے دلائل تراشتی ہے کہ وہ اسے غلط نظر ہی نہیں آتے۔ اس طرح وہ دیدہ و دانستہ سب کچھ دیکھتے بھالتے اس فریب رنگ و بو میں کھو جاتا ہے۔

وَ عَادًا وَ ثَمُوْدًا وَ قَدْ ثَبَيْنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسْكِنِهِمْ دَفَنًا
وَ زَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ
وَ كَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ ۝ (۲۹/۳۸)

اور ہم نے (قوم) عاد و ثمود کو ہلاک کیا۔ اور (یہ) ان کے مکانات (اور آبادیوں) سے نہیں صاف نظر آ رہا ہے (وہ کس طرح ہلاک کئے گئے) شیطان نے ان کے لئے ان کے اعمال کو مزین بنا رکھا تھا چنانچہ اس نے انہیں (حق کی) راہ (کی پیروی) سے روک دیا۔ اور وہ لوگ سب کچھ دیکھتے بھالتے تھے۔

قومِ سبا کے متعلق فرمایا۔

وَ زَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ
لَا يَهْتَدُوْنَ ۝ (۲۷/۲۴)

شیطان نے ان کے اعمال (سیتہ) کو ان کے لئے مزین بنا رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے انہیں (حق کی) راہ (کی پیروی) سے روک دیا۔ سو وہ سیدھی راہ پر نہیں چلتے تھے۔

تمام اُممِ بائعہ کے متعلق ارشاد ہے۔

ثَا لِهٖ لَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ

أَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمْ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (۱۶/۶۳)
 (اے پیغمبر!) اس بات کی سچائی پر ہم شاید ہیں کہ ہم نے تجھ سے پہلے کتنی ہی امتوں کی طرف
 رسول بھیجے۔ پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے لوگوں کو ان کی بد عملیاں اچھی بنا کر دکھائیں (اور وہ
 سچائی کی دعوت پر کار بند نہ ہوئے) سو وہی حال آج بھی ہو رہا ہے۔ وہی شیطان ان لوگوں کا
 رفیق ہے اور (بالآخر) ان کے لئے الم انگیز تباہی ہے۔

زینت اعمال کے مظاہر | اپنے گرد و پیش نگاہ ڈالتے اور دیکھتے کہ "زینت اعمال" کے
 یہ مظاہرے کن کن نظر فریب پیکروں میں سامنے آتے ہیں۔
 کسی بڑے سے بڑے ہلاک و اور جنگیز یا دورِ حاضرہ کے الہیسی نظام کے اربابِ حل و عقد سے پوچھتے اور پھر
 دیکھتے کہ وہ کس طرح اپنے ہر فعل کو حق بجانب اور نوعِ انسانی کے لئے آیہ رحمت قرار دیتے ہیں، دل ہے
 کہ اس میں خود غرضی، حق ناشناسی، جلبِ منفعت اور ہوسِ زر کے چور چھپے بیٹھے ہیں۔ لیکن عقلِ حیلہ جو
 ہے کہ ان بنیادوں پر اُٹھی ہوئی عمارت کو کمزور و اور ضعیفوں، مظلوموں اور گس مہر سوں کے لئے اس
 حفاظت کا قلعہ بنا کر دکھاتی ہے لیکن باطل کی طمع کاری زیادہ دیر تک نہیں ٹھیر سکتی۔ بقوڑی دور چلنے کے
 بعد دنیا دیکھ لیتی ہے کہ شیطان کا فریب کس قدر بودا تھا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۚ الَّذِينَ صَلَّ سَعْيُهُمْ
 فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا أُولَٰئِكَ
 الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ
 لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزَنًا ۚ ذَٰلِكَ جَزَاءُ هُمُ جَهَنَّمَ بِمَا كَفَرُوا
 وَ اتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا ۝ (۱۸/۱۰۶-۱۰۳)

(اے پیغمبر!) تو کہہ دے کہ آدم تمہیں بتائیں کہ وہ کون لوگ ہیں جو اپنے کاموں میں سب
 سے زیادہ نامراد ہیں؟ وہ جن کی ساری کوششیں (قانونِ مکافات سے بے نیاز ہو کر)
 مفادِ عاجلہ کے حصول میں کھوئی گئیں۔ اور وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ بڑا اچھا
 کارخانہ بنا رہے ہیں۔ ابھی لوگ ہیں کہ اپنے پروردگار کے قوانین اور ان کے نتائج کا سنا
 کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ پس اُن کے سارے کام اکارت گئے اور اس لئے مکافات

کے وقت ہم (اُن کے اعمال) کا کوئی وزن تسلیم نہیں کریں گے۔ انہوں نے جیسی کچھ کفر کی راہ اختیار کی تھی اور ہمارے قوانین اور رسولوں کی ہنسی اڑائی تھی، تو عذابِ دوزخ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔

مذہبی دنیا میں زینتِ اعمال | یوں تو شیطان کی طرف سے پیش کردہ زینتِ اعمال انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں تخریب انگیز ہے۔ لیکن دنیاۓ مذہب میں اس کی سمیت بڑی ہلاکت آفریں ہو جاتی ہے۔ غور کیجئے۔ بعض معتقدات و رسومات آبا و اجداد سے متوارث چلی آرہی ہیں۔ انسان انہیں اس قدر مقدس و متبرک خیال کرتا ہے کہ انہیں دل کی انتہائی گہرائیوں میں جگہ دیئے پھرتا ہے۔ ان کے خلاف خدا کی طرف سے کھلے کھلے احکام موجود ہوتے ہیں۔ لیکن شیطان ان غلط معتقدات و رسوم کو اس درجہ خوشامبنا کر پیش کرتا ہے کہ انسان انہیں تنقید کی حد سے بالاتر خیال کرتا ہوا کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ ذرا احکامِ خداوندی کی روشنی میں انہیں پرکھ کر تو دیکھ لے۔ سورۃ اعراف میں شیطان کے فتنہ عظیمہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ جن لوگوں پر شیطان کا جادو چل جاتا ہے اُن کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ:

وَإِذَا قَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۖ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ اتَّقُوا اللَّهَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۷/۲۸)

یہ لوگ جب بے حیائی کی باتیں کرتے ہیں تو کہتے ہیں ”ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور چونکہ وہ ایسا کرتے رہے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ خدا نے ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہو گا۔“ (اے پیغمبر!) تم کہہ دو کہ خدا کبھی بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دے گا۔ کیا تم خدا کے نام پر ایسی بات کہنے کی جرات کرتے ہو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں؟ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق ایک ہی آیت کے بعد تصریح فرمادی کہ

فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ ۚ إِنَّهُمْ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنََّّهُمْ مُّهْتَدُونَ ۝ (۷/۳۰)

ضابطہ خداوندی سے باہر نکلا تو (فَاَتَّبَعَهُ الشَّيْطَانُ) شیطان نے اسے جھٹ سے آدھوچا اور اسے قانون خداوندی کی جگہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب دے دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ (فَكَانَ مِنَ الْغَوِيّينَ ۝۴/۱۷۵) منزل کی صحیح راہ اس سے بالکل گم ہو گئی۔ اس کے بعد فرمایا:

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلَ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثُ ذَلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝ (۷/۱۷۹)

اگر وہ ہمارے قانون کے مطابق عمل کرتا تو اس کا مرتبہ بلند ہو جاتا۔ مگر وہ پستی کی طرف جھکا اور اپنے جذبات کی پیروی کرنے لگ گیا تو اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اسے دھتکار و جب بھی ہانپے اور زبان لٹکائے اور نہ دھتکار و جب بھی ایسا ہی کرے۔ ایسی ہی مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہمارے قانون کو جھٹلایا۔ تو (اسے پیغمبر) یہ بات لوگوں کو سناؤ۔ تاکہ وہ اس میں غور و فکر کریں۔

جماعتی زندگی اور شیطان | یہ تو بھئی قلوب میں دوسوہ اندازی باطل تمناؤں کی تخلیق اور تزیین اعمالِ سبّہ۔ اب اس سے آگے ہیئت

اجتماعیہ کی تعمیری زندگی کی طرف آئیے۔ قرآن کا منشاء یہ ہے کہ انسانی معاشرہ میں نظامِ ربوبیت رائج ہو۔ نظامِ ربوبیت کے معنی ہیں ایسا انتظام جس کی رُو سے تمام افرادِ انسانیہ کی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ پر ہو اور وہ ان سب کی صلاحیتوں کی کامل نشوونما کا پورا پورا سامان مہیا کر دے۔ اس کے لئے قرآن کا پروگرام یہ ہے کہ پیداوار (رزق) کے وسائل معاشرہ کی تحویل میں رہیں۔ اور افرادِ معاشرہ اپنی اپنی محنت کے حاصل میں سے بقدر اپنی ضروریات خود رکھ کر باقی اُس نظام کے سپرد کر دیں تاکہ وہ اس طرح مجملہ افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنا اور ان کے لئے سامانِ نشوونما فراہم کرنا رہے لیکن شیطان (انسان کے مفاد پرستی کے جذبات) اسے یہ کہہ کر ڈراتا رہتا ہے کہ اس طرح تم غریب اور مفلس ہو جاؤ گے۔ تم اپنی اور اپنی اولاد کی فکر کرو۔ تمہیں دوسروں کی نشوونما سے کیا۔ یہ ہے اصل بنیادِ ابلیس اور وحی کی کشمکش کی۔ قرآن کہتا ہے کہ

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ ۗ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦٨﴾

یاد رکھو کہ شیطان تمہیں قدم قدم پر یہ کہہ کر ڈرائے گا کہ (تم نے سب کچھ نظام خداوندی کے حوالے کر دیا تو) محتاج ہو جاؤ گے اس لئے وہ تمہیں کہے گا کہ سب کچھ اپنے پاس رکھو لیکن اس کے برعکس اللہ کا قانون تمہارے لئے سامانِ حفاظت کا ضامن بنتا ہے اور معاشی خوشگوار یوں کا کفیل۔ اس کا قانون بڑی کشادگی اور علم رکھتا ہے۔

انفاق حق و باطل کا معرکہ درپیش ہے۔ اجتماعی موت و حیات کا معاملہ سامنے ہے۔ نظامِ ربوبیت کے قیام کا سوال ہے۔ لیکن شیطان کا فریب ہے کہ دل میں خوف پیدا کئے جا رہا ہے کہ اگر ”اپنا“ سرمایہ یوں ”دوسروں“ کی خاطر لٹا دیا تو خود بھوکے مر جاؤ گے۔ انفسِ انسانی کی یہی تنگ نگہی اور کوتاہ دامنہ ہے جس سے بچنے میں فلاح و سعادت مضمر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی ذات کی پرورش کا راز اس میں ہے کہ انسان اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دے۔ چنانچہ اس نے نظامِ ربوبیت قائم کرنے والی جماعت کے افراد کی یہی خصوصیت عظمیٰ بتائی ہے۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقِ شَعْنَ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥٩/٩﴾

یہ لوگ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ خود تنگی کی حالت میں ہی کیوں نہ ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو شخص بھی (عقلِ خود میں) تنگ نگہی سے بچ گیا تو انہی کی کھیتیاں سرسبز ہوں گی۔

بخل اور اسراف بخل کرنے والے بھی شیطان کے تبعین ہیں اور دوسری طرف بجا صرف کرنے والے بھی۔

إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ﴿١٤/٢٤﴾

بے محل خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی بند ہیں۔ اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کی ناشکری کرنے والا ہے۔

فتنہ پردازی | نیز جماعت کے اتحاد و اتفاق میں خلل اندازی کے لئے جھوٹی خبریں اڑا دینا اور ان کی تحقیق کئے بغیر انہیں فضا میں منتشر کر دینا یہ بھی شیطنیت ہے۔ فرمایا۔

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوْ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَى أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ وَلَوْ أَنَّهُ فَضَّلَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ رَحْمَتَهُ لَوَلَّيْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ (۳/۸۳)

اور جب ان لوگوں کے پاس امن کی یا خوف کی کوئی خبر پہنچ جاتی ہے تو یہ (فوراً) اسے لوگوں میں پھیلا دیتے ہیں۔ اگر یہ اسے (لوگوں میں پھیلانے کی جگہ) اللہ کے رسول (یعنی مرکزِ ملت) کے سامنے اور ان لوگوں کے سامنے جو ان میں صاحبِ حکم و اختیار ہیں (یعنی مقامی حکام) پیش کرتے تو جو اصحابِ علم و نظرات کی تہ تک پہنچنے والے ہیں، وہ اس کی حقیقت معلوم کر لیتے (اور عوام میں تشویش نہ پھیلاتے) اور (دیکھو) اگر اللہ کا تم پر فضل نہ نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی، تو (تمہاری کمزوریوں کا یہ حال تھا کہ) معدودے چند آدمیوں کے سوا سب کے سب شیطان کے پیچھے لگ گئے ہوتے۔

تفراندازی | اس قسم کی افواہیں پھیلاتے رہنا اور اس قسم کی باتیں کرنا جس سے وحدتِ ملت پارہ پارہ ہو جائے اور باہمی مودت و محبت کی جگہ بغض و

عداوت پیدا ہو جائے۔

وَقُلْ لِّلْعِبَادِ يُقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنزِعُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا ۝ (۱۷/۵۳)
اور (اے پیغمبر!) میرے بندوں سے کہہ دو کہ مخالفوں سے یا آپس میں گفتگو کرتے ہوئے جو بات کہو ایسی کہو جو نہایت حسین ہو۔ یاد رکھو۔ شیطان لوگوں کے درمیان فساد و التا ہے یقیناً شیطان انسان کا صریح دشمن ہے۔

فواحش | یا سوسائٹی میں عام برائی اور فواحش کے میلانات یا ان کے اسباب و ذرائع پیدا اور عام کر دینا۔

إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَ أَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۲/۱۷۹)

وہ (شیطان) تو تمہیں برائی اور بے حیائی اور سخیل کی باتوں ہی کے لئے حکم دے گا۔ نیز اس (گمراہی) کے لئے اگسائے گا کہ اللہ کے نام سے جھوٹی باتیں کہو جن کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں۔

دوسری جگہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ۝ (۵/۹۰-۹۱)

اے جماعتِ مومنین! بلاشبہ، خمر اور میسرہ، استھان اور پالنے، شیطانی کاموں کی خباثت ہے تو ان سے اجتناب کرو۔ تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ خمر اور میسرہ کے ذریعہ تمہارے درمیان عداوت اور کینہ دلوادے اور تمہیں خدا کی یاد اور صلوٰۃ سے باز رکھے (پھر بتلاؤ!) ایسی برائیوں سے بھی) تم باز رہنے والے ہو یا نہیں۔

نیز بر قسم کی مشرکانہ رسوم بھی شیطان کی ایجاد ہیں (۱۲/۱۱۹)۔
بحث وجدل بلا علم ودلیل | اللہ تعالیٰ (اور اس کے احکام و قوانین) کے بارے میں بلا علم و براہین مجادلہ کرنا (کہ قوانینِ الہیہ کے خلاف علم و

دیں ہو کس کے پاس سکتی ہے؟) وہ روش ہے جو کھلی ہوئی گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَ يَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطَانٍ مَّرِيدٍ ۝ كُتِبَ عَلَيْهِ أَنَّهُ مَن تَوَلَّاهُ فَأَنَّهُ يُضِلُّهُ وَ يَهْدِيهِ إِلَى عَذَابٍ شَعِيرٍ ۝ (۲۲/۳-۴)

اور (دیکھو) کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اور ان کے پاس کوئی علم نہیں۔ وہ ہر سرکش شیطان کے پیچھے بولینے میں۔ حالانکہ شیطان کے متعلق یہ حتمی بات ہے کہ جو کوئی اس کا رفیق ہوا، وہ ضرور اسے گمراہی میں ڈالے گا اور عذابِ جہنم تک پہنچا کر رہے گا۔ اور یہ گمراہی آباد اجداد کے مسلک کی اندھی تقلید سے پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی کتاب منیر کے خلاف (بلا علم و براہین) مجادلہ کرتا ہی وہ ہے جو مسلکِ اجداد پر اندھا دھند جما ہو اور ان کے مسلک کو کتاب اللہ کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت نہ سمجھے۔

وَ إِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا
وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءُنَا أَوْ لَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَى
عَذَابِ السَّعِيرِ ۝ (۲۱/۲۱)

جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اس (ہدایت اور روشنی) کی پیروی کرو جو خدا نے آری
ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے۔
(یہ لوگ آنکھیں بند کئے اسی گمراہی کے راستے پر چلتے رہیں گے) اگرچہ اس طرح، شیطان
انہیں جہنم کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا ہو۔

جس قدر آیات آپ کے سامنے آچکی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی
کہ ان میں "شیطان" سے مراد کوئی خارجی ہستی نہیں ہے بلکہ یہ وہی لوگ ہیں جو معاشرے میں فتنہ و فساد
سہو و نسیان پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یادہ اربابِ مذہب جو لوگوں کو کتاب اللہ (قرآن) کی
طرف نہیں آنے دینا چاہتے اور انہیں تلقین کرتے رہتے ہیں کہ تم آنکھ بند
کئے اپنی اس روش پر چلتے جاؤ جو تمہارے پاس متواتر چلی آرہی ہے۔ قرآن نے ان سب کو شیاطین
کہہ کر پکارا ہے۔ یا خود انسان کی اپنی عقلِ جیلہ جو انسانیت کے عالمگیر مفاد کے مقابلے میں انفرادی مفاد
کو ترجیح دیتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں یہ سب کچھ درحقیقت انسان کے جذبات کرنے ہیں عقل
تو جذبات کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہی جذبات ہیں جو حقیقت کو انسان کی
نگاہوں سے اوجھل کر دیتے ہیں اور صحیح باتوں کی یاد بھلا دیتے ہیں۔ اس لئے نسیان کو بھی شیطان کا کام
کہا گیا ہے (۹۸/۴ : ۱۲/۲۲)۔

اس طرح رفتہ رفتہ شیطان ان کے دل سے خود خدا کے قوانین کی یاد ہی فراموش کر دیتا ہے۔
 اسْتَحْوِذْ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنْسَهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ
 أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝ (۵۸/۱۹)

شیطان نے ان پر قابو پالیا اور قوانین خداوندی کی یاد اُن سے بھلا دی۔ یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں۔ دیکھو! شیطان کا گروہ ہی خسارہ میں رہنے والا ہے۔
 اور جو اللہ کی یاد بھلا دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات اور زندگی کے قاعدہ ہی کو بھلا دیتے ہیں۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَهُمْ أَنْفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ (۵۹/۱۹)

تم ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو اللہ کو بھول گئے، تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خود فراموش ہو گئے۔ اور یوں صحیح راستے سے ایک طرف کو نکل گئے۔
 اور ابلیس کی جنگ میں یہی سب سے بڑی شکست ہے کہ انسان اپنے آپ ہی کو بھول گئے۔

قصہ آدم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ سب سے بڑی قوت جو شیطان کے مقابلہ میں انسان کو
 عطا کی گئی ہے، وحی آسمانی ہے۔ جس کے اتباع کا نتیجہ خوف و
 حزن سے مامون ہو جانا ہے۔ لہذا شیطان کا بڑا حربہ یہ ہے کہ خوف و

خوف و حزن

حزن پیدا کر کے پائے استقلال میں لغزش اور عزم راسخ میں تزلزل پیدا کر دے۔ سورۃ آل عمران میں مومنین کے متعلق فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن سے بعض آدمی کہتے تھے تم سے جنگ کرنے کے لئے دشمنوں نے بہت بڑا گروہ جمع کر لیا ہے پس چاہیے کہ ان سے ڈرتے رہو اور مقابلہ کے لئے باہر نہ نکلو لیکن بجائے اس کے کہ یہ بات سُن کر وہ خوف زدہ ہو جاتے ان کا ایمان اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ وہ بے خوف و خطر بول اُٹھے کہ ہمارے لئے اللہ کا سہارا بس کرتا ہے۔ اور جس کا کارساز اللہ ہو تو کیا ہی اچھا کارساز ہے۔

اس کے بعد ہے:-

إِنَّمَا ذَلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَآءَهُ ۚ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَ
خَافُوا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ (۳/۱۷۴)

یہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ شیطان تھا جو تمہیں اپنے ساتھیوں سے ڈرانا چاہتا تھا۔ اگر تم ایمان رکھنے والے ہو تو شیطان اور اس کے ساتھیوں سے نہ ڈرو! مجھ ہی سے ڈرو۔ (اگر تم اللہ کے قانون سے ڈرتے رہے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی تمہیں خوف زدہ نہیں کر سکے گی)۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ شیطان خوف پیدا کرنے کے لئے کیا ذرائع و اسباب اختیار کرتا ہے یعنی وہ اسلام کے مقابلہ میں مخالفین کے پیکروں میں نمودار ہوتا ہے جو اپنی قوت و سطوت سے مسلمانوں کو ڈراتے ہیں، یہاں جس خاص شیطان کا ذکر ہے تاریخ بتاتی ہے کہ یہ وہ جاسوس تھا جسے قریش مکہ نے مسلمانوں کے دلوں میں خوف اور ان کی قوت کا رعب ڈالنے کے لئے بھیجا تھا یہی وہ اَوْلِیَاءُ الشَّيْطَانِ ہیں جن سے مقابلہ کا حکم دیا گیا ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ
فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَآءَ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ
كَانَ ضَعِيفًا ۝ (۲/۷۶ ز ۲/۷۸ ز ۲/۸۳)

جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کا لڑنا اللہ کی راہ میں ہوتا ہے (کیونکہ وہ نفسانی خواہشوں کے لئے نہیں لڑتے۔ عدل و انصاف کی حمایت اور قوانین الہیہ کی ترویج و تنفیذ کے لئے لڑتے ہیں) اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں (یعنی شر و فساد کی شیطانی طاقتوں کی راہ اور ان کے غیر خدائی نظام کے تحفظ کے لئے لڑتے ہیں) سو (اگر تم ایمان رکھتے ہو تو چاہیے کہ) شیطان کے حملاتیوں سے لڑو (اور ان کی طاقت و کثرت کی کچھ پرواہ نہ کرو) شیطان کی چالیں (دیکھنے میں کتنی ہی مضبوط کیوں نہ دکھائی دیں حق کے مقابلہ میں) کبھی جینے والی نہیں ہوتیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ جو لوگ یہ کہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اپنے دعوے پر ثابت قدمی سے جھے رہیں تو ان پر بلا لگے گا نزول ہوتا ہے (۲۱/۲۱)۔ اس کی تشریح آگے چل کر ملے گی۔ اس کے برعکس جو لوگ خود ساختہ باطل کی روش اختیار کر لیتے ہیں ان پر ”شیاطین“ کا نزول ہوتا ہے (۲۶/۲۲)۔ یہ

شیاطین انسان پر کہیں باہر سے نازل نہیں ہوتے۔ یہ خود انسان کے قلب کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں اور جب وہ غلط روی کا فیصلہ کرتا ہے تو ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ اس کے سرکش جذبات ہیں جن کا مظاہرہ محسوس اعمال کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہی وہ ”شیاطین“ ہیں جن کے اتباع سے روکا گیا ہے (۲/۱۶۸؛ ۲/۲۰۸)۔

شیطان کی عبودیت | بعض آیات میں کہا گیا ہے کہ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ (۳۶/۶۰)۔ اس کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے ”تم شیطان کی پرستش مت کرو“ لیکن یہ معنی درست نہیں۔ شیطان کی پرستش تو کوئی بھی نہیں کرتا بلکہ ”عبودیت“ کے معنی اطاعت گزاری یا محکومیت اختیار کرنا ہیں۔ دوسری جگہ ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ج (۱۶/۳۶)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے (دنیا کی) ہر امت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا (تاکہ اس پیام حق کا اعلان کر دے) کہ اللہ کی عبودیت (اطاعت اور پیروی) اختیار کرو اور سرکش قوتوں سے بچو۔

طاغوت کے معنی | چونکہ یہاں شیطان کے بجائے طاغوت کا لفظ استعمال ہوا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پیشتر اس کا مفہوم متعین کر لیا

لے دنیا میں کوئی شخص (یا فرقہ) شیطان کی پرستش نہیں کرتا عراق میں موصل کے قریب ایک باطنی قسم کے فرقہ (یزیدی) کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شیطان کی پرستش کرتے ہیں۔ لیکن تحقیقات نے بتا دیا ہے کہ وہ بھی درحقیقت شیطان کی پرستش نہیں کرتے بلکہ اس کے ڈر کی وجہ سے اس کے خلاف کچھ نہیں کہتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خدا تو رحیم و کریم ہے۔ اس لئے اس کے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن شیطان سے ضرور خوف کھانا چاہیے کہ وہ بہت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ اسی لئے شیطان کو شیطان نہیں کہتے (کہ اس سے سوا ادبی کا احتمال ہے) بلکہ اس کا نام ملک طاووس رکھ چھوڑا ہے۔ بہر حال مطلب یہ ہے کہ شیطان کی عبادت سے مراد شیطان کی پرستش نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس سے مفہوم سرکش انسانوں کے احکام یعنی غیر خدائی نظام کی اتباع و اطاعت اختیار کرنا ہے۔ جیسا کہ متن میں آئندہ سطور سے واضح ہے۔

جائے۔ طغیان کے معنی ہیں حد سے تجاوز کر جانا۔ چنانچہ طوفانِ نوح کے وقت جب پانی کی موجیں پہاڑوں کی سی بلندیاں اختیار کر گئی تھیں وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ (۱۱/۲۲) اور (دیکھو) ایسی موجوں میں کہ پہاڑ کی طرح اٹھتی ہیں کشتی انہیں لئے جا رہی ہے۔ تو اس کیفیت کو پانی کی طغیانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

إِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ (۱۱/۲۹)

(اور دیکھو) جب (ایسا ہوا تھا کہ) پانی حد سے بڑھنے لگا تو ہم نے تمہیں

کشتی میں سوار کر دیا۔

یعنی کسی چیز کا اپنے اندازہ کے مطابق چلنا اعتدال ہے اور اس سے آگے بڑھ جانا سرکشی و طغیان۔ سورہ جن میں اس مفہوم کی وضاحت اور بھی کھلے الفاظ میں فرمادی گئی ہے۔

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝ د

أَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝ (۵۵/۹-۷)

آسمان کو اس نے بلند کیا اور میزان (عدل) کو قائم کیا تاکہ تم وزن کرنے میں حد سے تجاوز

نہ کرو۔ اور وزن کو (صحیح طور پر) قائم رکھو اور (معاملاتِ زندگی میں) تولنے جھوکنے میں کسی

قسم کی کمی نہ کرو۔

ترازوئے عدل کا سیدھا رکھنا اس کی صحیح حالت کا مظاہرہ ہے اس اندازہ سے ہٹ جانا 'جادہ' مستقیم سے انحراف و سرکشی ہے۔ اب انسانی زندگی کی طرف آئیے۔ کائنات کی برشتے انسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہے اس لئے ان پر حکمرانی انسان کے حیطة اقتدار کے اندر ہے۔ ان حدود کے اندر حکومت سرکشی و طغیان نہیں۔ لیکن خود انسان کسی دوسرے انسان کے تابع نہیں اس لئے کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کا حق حاصل نہیں۔ لہذا اگر کوئی انسان (یا گروہ) قوت فراہم کر کے دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنا لیتا ہے تو یہ اس کا جائز حدود سے تجاوز ہے اور طغیان و سرکشی۔ ایسی سرکشی جس میں یہ خدا کی ہمسری کا مدعی بن بیٹھتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم کی رو سے نظامِ قرآنی کے علاوہ ہر قسم کا نظام اطاعت

ہر غیر خدائی نظام | طاغوتی نظام ہے اور اس کی فرماں پذیری شرفِ انسانیت کی تذلیل۔ اس نظام کا نتیجہ فساد ہے جو اصلاح کی ضد ہے۔ وہ اُمم سابقہ جنہوں

نے قوانین الہیہ سے سرتابی اختیار کر کے خود ساختہ قوانین کی حکومت قائم کر رکھی تھی طاغوتی نظام کی علمبردار تھیں جس کا نتیجہ فساد تھا۔ یعنی معاشرہ میں ناہمواریاں۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۖ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۚ
الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۚ فَاكْثُرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ۖ (۶-۱۲/۸۹)
(اے پیغمبر!) کیا تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے پروردگار نے قوم عاد یعنی اونچی اونچی عمارتوں والی قوم ارم کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا۔ ان جیسی مخلوق آج تک شہروں میں پیدا نہیں ہوئی اور اسی طرح کیا تمہیں معلوم نہیں کہ قوم ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراش تراش کر عمارت بنائی تھیں۔ اور بڑے بڑے شکروں والے فرعون (اور اس کے رفقاء) کے ساتھ جنہوں نے شہروں میں سرکشی اختیار کر رکھی تھی (کیا برتاؤ کیا گیا تھا؟) ان تمام قوموں نے ان ہستیوں میں بہت زیادہ فساد مچایا تھا۔

بالخصوص فرعون جس کا جرم یہ تھا کہ اس نے طغیانی اختیار کر رکھی تھی۔

إِذْ هَبَّ رِيحٌ شَرْيْقَةٌ ۖ (۲۷/۲۴)
(اے موسیٰ!) فرعون کی طرف جاؤ۔ بلاشبہ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔

یہی طاغوتیت ان اقوام کی ہلاکت کا باعث تھی۔

فَأَمَّا ثَمُودُ فَاتَّخَذُوا لِلظَّالِمِينَ ۖ (۵/۶۹)

چنانچہ قوم ثمود محض سرکشی کی وجہ سے ہلاک کی گئی۔

انسان سرتابی اس وقت اختیار کرتا ہے جب سمجھ لیتا ہے کہ مجھے کسی کی احتیاج نہیں۔ اسی زعم باطل کے ماتحت وہ کسی آئین و قانون کی پابندی کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِكَيْغُفَىٰ ۖ أَنْ رَأَاهُ اسْتَعْصَمَ ۖ (۶-۴/۹۶)

ہرگز نہیں! یقیناً انسان سرکش ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے

آپ کو مستغنی سمجھنے لگتا ہے۔

یہ اس لئے کہ انسان سمجھتا ہے کہ زندگی صرف طبعی جسم کے جینے کا نام ہے اور اس کے لئے میں نے اس قدر سامان اکٹھا کر لیا ہے کہ مجھے کسی کی احتیاج باقی نہیں۔

فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ ۖ وَ أَشْرَ الْحَيَوٰةَ الدُّنْيَا ۖ (۳۷-۳۸/۹)

سو جو کوئی حد سے گزر جائے اور زندگی کے مفاد عاجلہ کو مستقبل پر ترجیح دینے لگے۔

لیکن اگر وہ سمجھتا ہے کہ زندگی صرف جسم کی پرورش کا نام نہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے اور اصل حیات اس کی تربیت و استحکام ہے تو وہ اپنے آپ کو کبھی دوسروں سے بے نیاز نہ کرتا۔ اس لئے کہ انسانی ذات کی تربیت و استحکام دوسرے انسانوں کی رلوبیت کا سامان فراہم کرنے سے ہوتی ہے لہذا ایک فرد کبھی دیگر افراد انسانہ سے بے نیاز ہو نہیں سکتا۔ یہ اپنی تکمیل ذات کے لئے ایک ایسے معاشرے کا محتاج ہے جو قانون خداوندی کے مطابق متشکل ہو۔ بنابرین یہ دوسرے انسانوں کا بھی محتاج ہے اور قوانین خداوندی کا بھی لیکن جو لوگ اس حقیقت پر نگاہ نہیں رکھتے اور زندگی کو صرف جسم کی پرورش تک محدود خیال کر لیتے ہیں وہ قوانین خداوندی کی ضرورت نہیں سمجھتے اور اپنے خود ساختہ آئین و ضوابط کے مطابق معاشرہ متشکل کر لیتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو طاغوتی نظام قائم کرتے ہیں جس میں خدائی قوانین کے بجائے ان کے خود ساختہ قوانین نافذ ہوتے ہیں، اس نظام کی طرف رجوع کرنے سے جماعت مومنین کو روکا گیا ہے۔ اس لئے کہ جن کا مقصد حیات آئین خداوندی کا نفاذ ہو ان کے لئے طاغوتی نظام کی طرف رجوع کرنا کیسے جائز قرار پا سکتا ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ
وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا إِلَى الظَّالِمِينَ
دَعْوًا أَمْؤًا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ ۖ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ
ضَلَالًا بَعِيدًا ۝ (۴/۶۰)

(اے پیغمبر! کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جن کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا ہے وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں؟ لیکن (عمل کا یہ حال ہے کہ) چاہتے ہیں اپنے جھگڑے فیضے طاغوت کے پاس لے جائیں۔ حالانکہ انہیں حکم دیا جا چکا ہے کہ اُس (کے نظام) سے انکار کریں اور صرف اللہ کے نظام کی پیروی کریں۔) اصل یہ ہے کہ شیطان چاہتا ہے انہیں اس طرح گمراہ کر دے کہ وہ راہِ راست سے بہت دُور جا پڑیں۔

تَحَاكُمُ إِلَى الطَّاعُوتِ | تحاکم الی الطاعوت (یعنی زندگی کے معاملات کا فیصلہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے مطابق کرنا) سے یہ حقیقت بالکل واضح طور پر

سامنے آ جاتی ہے کہ طاعوت سے مراد غیر خدائی نظام اطاعت ہے۔ جو لوگ اس نظام سے اجتناب کرتے ہیں ان کے لئے اس زندگی اور اس سے اگلی منزل دونوں میں سعادت و کامرانی کی بشارتیں ہیں۔

وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاعُوتَ أَنْ يَتَعَبَّدُوا لَهَا وَانَابُوا إِلَى اللَّهِ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ (۳۹/۱۷)

جو لوگ طاعوت کی محکومیت سے بچے اور قوانین الہیہ کی طرف جھکے ان کے لئے (سعادت و کامرانی کی) بشارت ہے تو اے پیغمبر اسلام! تو میرے بندوں کو (نظام خداوندی کی اطاعت کے نتائجِ حسنہ کی) خوشخبری دے دے۔

برعکس ان کے عبادِ الطاعوت کا ٹھکانا بہت بُرا ہے۔ (وَأَصْلُ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ ۝ ۵/۶۰)۔ یعنی جہنم۔ اس دنیا میں بھی جہنم (جس پر آج شعلہ زار یورپ کا ایک ایک ذرہ شاہد ہے) اور آخرت میں بھی جہنم۔



ایک اور طاعوتی نظام | یہ تو بے وہ طاعوتی نظام جو حکومت و سلطنت کی شکل میں مَرَبَّ ہو تا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور طاعوتی نظام بھی ہے جو

تقدس کا نقاب اوڑھ کر قائم کیا جاتا ہے۔ اس نظام میں انسانوں کی ایک جماعت دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم و مطیع بناتی ہے لیکن بزورِ شمشیر نہیں بلکہ ان کے دل کی گہرائیوں میں اپنی عقیدت و عظمت کا بُت اُتار کر جب ان کی عقیدت یوں ان کے دلوں میں گھر کر لیتی ہے تو پھر تقدسین کا یہ طائفہ اپنا ہر حکم ان سے منواتا ہے اور یوں اس قسم کی حکومت قائم کرتا ہے جس کی حفاظت کے لئے فوج اور سپاہ کی بھی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ یہ وہ محکومیت ہے جس کی زنجیریں انسان خود نہایت تذلل و تعبد اور عجز و انکسار سے اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں میں ڈالتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔

أُخْشِرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَارْجَوْهُمْ وَ مَا كَانُوا يَعْبُدُونَ ۝ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَاهْدُوهُمْ إِلَى صِرَاطِ الْجَحِيمِ ۝ (۲۲-۲۳/۳۷)

ان لوگوں کو جو (غیر اللہ کی محکومیت اختیار کر کے اپنے آپ پر) ظلم کیا کرتے تھے اور ان کے ساتھیوں کو منع نہ کیا لوگوں کے جن کی وہ خدا کو چھوڑ کر عبودیت (اطاعت اور پیروی) اختیار کیا کرتے تھے جمع کر لیا اور پھر سب کو دوزخ کے راستہ کی طرف لے جاؤ۔

اس کے بعد ہے۔

وَ أَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۚ قَالُوا إِنَّا كُنْتُمْ نَأْتُونَنَا
عَنِ الْيَمِينِ ۚ قَالُوا بَلَىٰ لَمْ تَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۚ وَمَا كَانَ لَنَا
عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ۝ (۲۴/۳۰ - ۲۴)

اس وقت وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر سوال و جواب کرنے لگیں گے۔ (چنانچہ پیروی کرنے والے) کہیں گے کہ تم تو ہمارے پاس (خیر و برکت کا مقدس نقاب اڈھ کر) بہت زور و شور سے آیا کرتے تھے۔ (اب خدائی عذاب سے تو ہمیں بچاؤ) وہ لوگ (جواب میں) کہیں گے کہ (ہم تمہارے پاس کب آتے تھے؟) تم خود ہی (دل سے) مومن نہیں تھے۔ (اس لئے غیر خدائی احکامات کی تلاش میں رہا کرتے تھے) ہماری تم پر کوئی زبردستی بھی نہیں تھی بلکہ تم خود ہی سرکش جماعت کے افراد تھے۔

غور فرمائیے۔ اس حقیقت کو کیسے واضح انداز میں بے نقاب کیا گیا ہے کہ ان متبوعین کی سیادت و قیادت اپنی قوت پر قائم نہیں ہوتی بلکہ متبعین کے جذبہ عقیدت و ارادت پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر یہ انہیں ماننا چھوڑ دیں تو ان کی حکومت خود بخود ختم ہو جائے۔ بقول علامہ اقبالؒ،

ایں صنم تا سجدہ اٹھ کر دی خداست

چوں یکے اندر قیام آئی فناست

حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا میں کسی قسم کا استیلاء و تغلب کیوں نہ ہو اس کی بنیاد خود محکوم کی اپنی ہی کمزوری پر ہوتی ہے۔ وہ تو صرف ایک احکم الحاکمین کی ذات ایسی ہے جس کی حکومت و سروری محکوم کے جذبہ اطاعت کی رہن منت نہیں بلکہ اپنی قوت پر قائم ہے۔ اس کے سوا یہ قوت کسی اور کو حاصل نہیں۔ اس لئے حکومت کا حق بھی کسی اور کو نہیں۔

بہر حال یہی وہ شیطاں ہیں جن کے متعلق فرمایا،

وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ
..... إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ (۱۴/۲۲)

جب فیصلہ ہو چکا تو شیطان بولا۔ بلاشبہ اللہ نے تم سے وعدہ کیا تھا۔ سچا وعدہ (اور وہ پورا ہو کر رہا) اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا مگر اسے پورا نہ کیا۔ مجھے تم پر کسی طرح کا تسلط نہ تھا (کہ تم میری پیروی پر مجبور ہو گئے ہو) جو کچھ پیش آیا وہ صرف یہ ہے کہ میں نے تمہیں بلایا اور تم نے میرا بلاوا قبول کر لیا۔ پس اب مجھے ملامت نہ کرو۔ خود اپنے آپ کو ملامت کرو۔ آج کے دن نہ تو میں تمہاری فریاد کو پہنچ سکتا ہوں نہ تم میری فریاد کو پہنچ سکتے ہو۔ تم نے اب سے پہلے مجھے (اللہ کا) شریک ٹھہرا لیا تھا (کہ اس کے احکام کی طرح میرے حکموں کی بھی اطاعت کرنے لگے تھے) تو میں اس سے بیزاری ظاہر کرتا ہوں۔ بلاشبہ ظلم کرنے والوں کے لئے بڑا ہی دردناک عذاب ہے۔



یہ ہے وہ طاغوتی نظام جس کے متعلق فرمایا کہ یہ ایمان باللہ کی ضد ہے۔
دو متمیز راستے لَا إِلَهَ إِلَّا فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ

..... أُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (۲۵۶-۲۵۷/۱)

دین میں کسی قسم کا اکراہ نہیں۔ بلاشبہ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہو گئی ہے۔ (اور اب دونوں راہیں لوگوں کے سامنے ہیں جسے چاہیں اختیار کریں) پھر جو کوئی طاغوت سے انکار کرے (یعنی ہر اس نظام کی اطاعت سے انکار کرے جو غیر خدائی قوانین پر مشتمل ہو) اور اللہ پر ایمان لائے (یعنی صرف اس نظام کی اطاعت کرے جو قواعد و قوانین خداوندی کی ترویج کے لئے قائم ہوا) تو بلاشبہ اُس نے (فلاح و سعادت کی مضبوط شاخ پکڑ لی۔ یہ شاخ ٹوٹنے والی نہیں جس کے ہاتھ آگئی وہ گرنے سے محفوظ ہو گیا) اور یاد رکھو اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ اللہ ان لوگوں کا ساتھی اور مددگار ہے جو ایمان کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ انہیں ہر طرح کی تاریکیوں سے نکالتا اور روشنی میں لاتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے، تو ان کے مددگار مکرش اور

مفسد (طاغوت) ہیں۔ وہ انہیں روشنی سے نکالتے اور تاریکیوں میں لے جاتے ہیں۔ سو

یہی لوگ ہیں جن کا گروہ دوزخی گروہ ہے۔ ہمیشہ عذابِ جہنم میں رہنے والا ہے۔

آپ ﷺ کے قائل نہیں ہو سکتے جب تک پہلے لا الہ کے عملی معترف نہ ہوں۔ آپ نظامِ خداوندی کا اتباع نہیں کر سکتے جب تک ہر غیر خدائی نظام سے روگردانی نہ کر لیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بیک وقت آپ کا منہ مشرق اور مغرب دونوں کی طرف ہو جائے۔ ایک کی طرف منہ کرنے کے لئے دوسرے سے منہ موڑنا پڑے گا۔ یہی ہر رسول کی تعلیم تھی۔ یہی اسلام کا عروۃ الوثقی ہے۔

وَلَقَدْ بَعَلْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا
الطَّاغُوتَ ۖ فَجَاهِلُوا مَن هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُمْ مَّن حَقَّتْ عَلَيْهِ
الضَّلَالَةُ ۖ فَيَسْأَلُونَ فِي الْأَرْضِ فَاَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكذِبِينَ ۝

(۱۶-۲)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے (دنیا کی) ہر امت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا (تاکہ اس

لے یہاں یہ فرمایا کہ اللہ تو ظلمات سے نور کی طرف لے جاتا ہے اور طاغوتی نظام نور سے ظلمات کی طرف۔ نور اور ظلمات کی تشریح تو اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں سورۃ ابراہیم کی ایک آیت پر غور کیجئے۔ جہاں فرمایا:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ
وَذَكِّرْهُمْ بِآيَاتِ اللَّهِ ۚ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۝ (۱۳/۵)

اور دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ ہم نے موسیٰ کو اپنے قوانین کے ساتھ بھیجا تھا کہ وہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکالے اور روشنی میں لائے اور انہیں اللہ کے (فیصلہ کن) واقعات کی یاد دلائے۔ کیونکہ ہر اس انسان کے لئے جو حق کی راہ میں مستقل مزاج رہے اور چاہے کہ اس کی کوششیں بھڑوڑ بن جائیں۔

ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کا مشن یہ تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی و محکومیت سے نکال کر قوانینِ الہیہ کے اتباع میں لے آئے۔ لہذا جس فضا میں قوانینِ الہیہ کا نفاذ ہو وہ نورانی فضا ہے اور جس میں طاغوتی نظامِ اطاعت قائم ہو وہ ظلمت ہے۔ طاغوت کا مقصد زندگی یہ ہوتا ہے کہ انسان کو انسانی نظامِ اطاعت کا محکوم رکھے اور جماعتِ مومنین کی سعی و عمل کا مرکز یہ کہ ایسے نظام کو توڑ کر نظامِ خداوندی قائم کیا جاوے۔

پیام حق کا اعلان کر دے) کہ اللہ کی محکومیت اختیار کرو اور سرکش قوتوں کے طاغوتی نظام سے بچو۔ پھر ان اُمتوں سے بعض ایسی تھیں جن پر گمراہی ثابت ہو گئی پس زمین میں چلو پھرو اور دیکھو جو قومیں (سچائی کی) جھٹلانے والی تھیں انہیں بالآخر کیسا انجام پیش آیا۔

غور کیجئے! جو رسول بھی آیا اس دعوت انقلاب کو لے کر آیا کہ اطاعت و محکومیت صرف ایک خدا کے واحد القہار کی ہے اس کے علاوہ کوئی نظام اطاعت ایسا نہیں جس کی اتباع کی جائے۔ اور خدا کی اطاعت ہو نہیں سکتی جب تک ہر غیر خدائی نظام سے عملاً انکار نہ کیا جائے۔ کیسی عظیم الشان ہے یہ دعوت اور کتنا بڑا حیر العقول ہے یہ انقلاب! ایسا انقلاب جو انسانوں کو دوسرے انسانوں کی ہر قسم کی غلامی سے نجات دلا کر اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ اپنا سر اوجھار کر کے پئے۔



لغزش کے اسباب | یہ حقیقت شروع ہی میں سامنے لانی چاہی ہے کہ انسان کے اپنے سرکش جذبات کا نام ”شیطان“ ہے۔ یعنی جب انسان احکام خداوندی کے خلاف اپنے سرکش جذبات کا اتباع کرتا ہے، تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے شیطان کا اتباع کیا۔ یہ وجہ ہے کہ اس قسم کے فیصلوں اور ان فیصلوں پر عمل کرنے کو ”عمل الشیطان“ (شیطان کا کام) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ مثلاً جب حضرت موسیٰ لے (زمانہ قبل از نبوت میں) غصہ میں آکر ایک قبیلے کو مار ڈالا تو اس پر متأسف ہوتے ہوئے کہا۔ هَذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُضِلٌّ مُبِينٌ (۲۸/۱۵) [یہ شیطان کے عمل کی وجہ سے ہوا۔ بلاشبہ وہ ایک گمراہ کرنے والا کھلا دشمن ہے۔]

شیطان کی طرف سے لغزش کے سامان خود انسانی اعمال فراہم کرتے ہیں۔ جنگ اُحد میں جب مجاہدین کی ایک جماعت سے ذرا سی لغزش ہو گئی تو اس کے متعلق فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ (۳/۱۵۳)

تم میں سے جن لوگوں نے اس دن لڑائی سے منہ موڑ لیا تھا جس دن دونوں لشکر ایک دوسرے

سے مقابل ہوئے تھے تو ان کی اس لغزش کا باعث صرف یہ تھا کہ بعض کمزوریوں کی وجہ سے جو انہوں نے پیدا کر لی تھیں، شیطان نے ان کے قدم ڈلگے گا دیتے۔ (یہ بات نہ کتنی کہ ان کے ایمان میں فتور آگیا ہو۔ بہر حال) یہ واقعہ ہے کہ خدا نے ان کی یہ لغزش معاف کر دی۔ اس کا قانون ایسا ہے کہ ایک بڑے نظام میں ایسی کوتاہیوں کی طرف سے سامان حفاظت مل جاتا ہے اور نظام یونہی اپنی جگہ سے ہل نہیں جاتا۔

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے ایک خاص اسکیم کے ماتحت آپ کو حضرت یعقوبؑ سے الگ کیا تھا۔ لیکن حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کی اس عداوت کو شیطان کی طرف منسوب کیا۔ (دیکھئے ۱۱۲/۱۰۰)۔

سورۃ زخرف میں ہے کہ جو شخص خدا کے رحمن کے قانون سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اللہ اس پر شیطان مسلط کر دیتا ہے۔ پھر ایسے لوگوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ غلط راہ پر چلے جا رہے ہیں لیکن بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہم راہ راست پر ہیں۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ۝ وَإِنَّهُمْ لَيَصُدُّوهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُّقْتَدُونَ ۝ (۳۶ - ۳۷/۳۷)

اور (یاد رکھو) جو کوئی رحمن کے قانون سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو ہم ایک شیطان کو اس پر مسلط کر دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ وہی اس کا ساتھی ہوتا ہے۔ اور یقیناً یہ (شیاطین) ان لوگوں کو (نظام خداوندی کی) راہ سے روکتے ہیں، مگر شیطان کی اثرات کے ماتحت یہ لوگ اس قدر بے حس ہو جاتے ہیں کہ اپنی گمراہی کا انہیں پتہ نہیں چلتا بلکہ وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ صحیح راستہ پر چل رہے ہیں۔



قرین آیات بالا سے واضح ہے کہ جسے شیطان کی طرف سے لغزش کہا جاتا ہے وہ درحقیقت انسانی اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اکثر و بیشتر ان غلط اعمال کے محرکات اس سوسائٹی کے اثرات ہوتے ہیں جسے وہ اپنے لئے اختیار کرتا ہے کیونکہ ہم نشینی کا اثر سب سے گہرا ہوتا ہے۔

اسی کو قرآن کریم نے قرین (ہمنشین) کہا ہے۔ سورۃ نسا میں ہے۔

وَالَّذِينَ يَنْفَقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ
وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَنْ يَكُنِ الشَّيْطَانُ لَهُ قَرِينًا فَسَاءَ قَرِينًا ۝

(۲۵/۳۰ - ۲۸) ذ (۲۸/۳۰)

اور (ان لوگوں کو بھی خدا دوست نہیں رکھتا) جو محض لوگوں کے دکھانے کو (نام و نمود کے لئے) مال خرچ کرتے ہیں اور فی الحقیقت اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے (کیونکہ اگر اللہ پر سچا ایمان رکھتے تو کبھی ایسا نہ کرتے کہ اسے چھوڑ کر انسانوں کے سامنے نمائش کرنی چاہتے) اور (دیکھو) جس کسی کا ساتھی شیطان ہوا تو کیا ہی بُرا یہ ساتھی ہے!

حاشیہ نشین! یہ ہم نوالہ و ہم پیالہ مصاحب جھوٹی خوشامدوں اور فریب کارانہ قصیدہ خوانیوں سے اصل حقیقت کبھی سامنے آنے نہیں دیتے اور اپنے اغراض و مقاصد کی

خاطر اس کی لغویات و خرافات کو مزین بنا بنا کر دکھاتے رہتے ہیں۔

وَقَتَضْنَا لَهُمْ قُرْآنًا فَزَيَّنُوا لَهُمْ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا
خَلْفَهُمْ ۝ (۲۵/۴۱)

اور (دیکھو) ان کے لئے ہم نے کچھ ایسے ہم نشین (ساتھی) مسلط کر دیئے ہیں جو ان کے اگلے اور پچھلے کاموں کو (خواہ وہ کتنے ہی بُرے کیوں نہ ہوں) مزین کر کے دکھاتے رہتے ہیں۔

چنانچہ یہ اور اس کے ساتھی سب جہنم کی ہلاکت میں جا پہنچتے ہیں۔

وَقَالَ قَرِينُهُ هَذَا مَا لَدَائِي عَتِيدٌ ۝ مَا يُبَدِّلُ الْقَوْلُ
لَدَائِي وَمَا أَنَا بِظَالِمٍ لِلْعَبِيدِ ۝ (۲۳ - ۲۹/۵۰)

اور (یاد کرو جب ایسا ہو گا کہ قیامت کے دن بد عمل انسان کا ہر ساتھی (ہمنشین) بجائے ساتھ دینے کے (مخالفت) میں کہے گا "یہ ہے وہ سب کچھ جو میرے پاس (جہنم کے لئے) تیار تھا، ہر ناشکر گزار و دشمن (حق) کو جہنم میں ڈال دو! (خصوصیت کے ساتھ ہر اس شخص کو جو خیر سے روکنے والا، حد سے بڑھنے والا اور شک کرنے والا تھا جس نے اللہ کے ساتھ

ایک دوسرا الہ بنالیا۔ (ایسے شخص کو) سخت عذاب میں ڈال دو۔ (پھر بارگاہ الہی میں اپنی برأت کرتے ہوئے) اُس کا ساتھی (ہمنشین) کہے گا کہ ”اے ہمارے پروردگار! میں نے تو اسے سرکش نہیں بنایا تھا وہ تو خود ہی بڑی دُور کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا“ تو خدا اُن سے فرمائے گا۔ ”میرے سامنے مت جھکڑو میں تو عذاب کا وعدہ تمہاری طرف پہلے ہی بھیج چکا ہوں۔ میرے یہاں بات بدلی نہیں جایا کرتی۔ اور نہ میں بندوں پر ظلم کرنے والا ہوں (کہ بلاوجہ بندوں کو عذاب میں مبتلا کر دوں)۔

وہ قرین صاف مکر جائے گا کہ اُس نے اسے نہیں بہکایا۔ یہ تو خود ہی بہک جانے پر ٹکلا بیٹھا تھا۔
حَتَّىٰ إِذَا جَاءَنَا قَالَ يَلَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ
فَبُئْسَ الْقَرِينُ ۝ (۴۳/۳۸)

حتیٰ کہ جب وہ ہمارے سامنے آئے گا تو (اس شخص سے جسے دنیا میں بہکایا تھا) کہے گا اے کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کی دوری ہوتی (کہ تیری بد عملی کی پاداش میں تو نہ پکڑا جاتا۔ ذرا خیال تو کرو) کہ یہ کتنا بُرا ساتھی ہے۔

لیکن جو لوگ خدا کے قانون کا اتباع کرتے ہیں اُن پر اس قسم کے قرین کا کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ وہ ہر وقت خدا کو سامنے رکھتے ہیں۔ اہل جنت کے باہمی مکالمہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ إِنِّي كَانَ لِي قَرِينٌ ۝ وَ لَوْ لَا نَعَصْتَ رَبِّي
لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِينَ ۝ (۵۰ - ۳۴/۵۷)

(اور) ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا (دنیا میں) ایک ساتھی تھا جو کہا کرتا تھا کیا (تو) ان رسولوں کی باتوں کی تصدیق کرنے والوں میں سے ہے؟ کیا جب مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیوں (کا ڈھیر) رہ جائیں گے۔ تو (پھر بھی) ہم اپنے اعمال کا بدلہ دیئے جائیں گے؟ اور وہ اپنے ساتھیوں سے کہے گا کیا تم (جہنم کی طرف) جھانک کر دیکھو گے؟ (بالآخر) وہ خود ہی جھانکے گا اور (اپنے) اس (ساتھی) کو جہنم میں دیکھے گا۔ اور کہے گا۔ خدا کی قسم قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک ہی کر ڈالتا۔ اگر میرے پروردگار کا (مجھ پر احسان و انعام نہ ہوتا تو) (آج) یقیناً میں بھی ان لوگوں میں سے ہی ہوتا جو (عذاب الہی میں) حاضر کئے گئے ہیں۔

اور ان شیاطین سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو قوانینِ الہیہ کی حفاظت میں لے لے۔
چنانچہ فرمایا:

وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّهُ
هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (۳۶/۳۱)

اگر شیطان کی طرف سے تمہارے دل میں کوئی غلش و سوسہ کی پیدا ہو تو فوراً
قوانینِ الہیہ کی پناہ میں آجایا کرو۔ یقیناً وہ قانون اس خدا کا ہے جو سب کچھ سننے والا
جانتے والا ہے۔



شیطان سے پناہ کا طریقہ | یہ ہیں وہ شیاطین جو پہلے دن سے ذریتِ آدم کے
پیچھے لگے ہوئے ہیں اور قیامت تک سایہ کی طرح ساتھ
رہیں گے۔ ان داخلی اور خارجی تباہ کاریوں سے بچنے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ جوں ہی اُن کے شعلہ کی
پیک دکھائی دے فوراً اپنے آپ کو حدودِ اللہ کے اندر لے آؤ جہاں خدا کا قانون تمہاری حفاظت
کرے گا۔

وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّهُ سَمِيعٌ
عَلِيمٌ ۝ إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طُغْيٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ
تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ ۝ (۲۰۰ - ۲۰۱/۴)

اور اگر ایسا ہو کہ شیطان کی طرف سے سوسہ کی کوئی غلش محسوس ہو تو قوانینِ الہیہ
کی حفاظت میں آجاؤ۔ بلاشبہ وہ سننے والا جاننے والا ہے جو لوگ قوانینِ خداوندی کی حفاظت
میں رہتے ہیں اگر انہیں شیطان کی دوسوہ اندازی سے کوئی خیال چھو بھی جاتا ہے تو
فوراً چونک اٹھتے ہیں اور پھر پردہ غفلت اس طرح ہٹ جاتا ہے گویا اچانک اُن کی
آنکھیں کھل گئیں، مگر جو لوگ شیطانوں کے بھائی بند ہیں، تو انہیں گمراہی میں کھینچے لے
جاتے ہیں اور پھر اس میں ذرا بھی کمی نہیں کرتے۔

شیاطین کی دوسوہ اندازیوں اور فریب کاریوں سے بچنے کے لئے یہ آرزو کر دو کہ

وَقُلْ رَبِّ اَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيْطَانِ ۝ وَاَعُوذُ بِكَ
رَبِّ اَنْ يَحْضُرُونِ ۝ (۹۷-۲۳/۹۸)

خدایا! میں شیطانی وسوسوں سے تیرے قانون کے دامن میں پناہ لیتا ہوں۔ میں اس
سے بھی تیری حفاظت چاہتا ہوں کہ وہ میرے قریب بھی پھٹکیں۔
حضرت مریمؑ کی والدہ نے ان ہی دعاؤں اور آرزوؤں کے ساتھ اپنی بچی کو اللہ کے حفظِ امن میں سونپا
تھا۔ جب کہا تھا کہ

وَ اِنِّي اُعِيذُهَا بِكَ وَ ذُرِّيَّتَهَا مِنَ
الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝ (۳/۳۵)

[میں اسے اور اس کی نسل کو تیری پناہ میں دیتی ہوں کہ شیطانِ رجیم (کی وسوسہ اندازیوں) سے
محفوظ رہے۔] اس لئے کہ جو ایسا کھلا دشمن، لیکن ایسا دامِ ہمرنگِ زمین بچھا کر دار کرنے والا ہو اس کے
خبروں سے قوانینِ خداوندی کے علاوہ اور کہاں پناہ مل سکتی ہے؟ اسی حقیقت کو زیادہ گہرائی سے دلنشین
کرنے کے لئے بار بار اس طرف توجہ دلائی گئی کہ یاد رکھو!

اِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ (۱۶۸/۲ نیز ۲۰۸/۵، ۱۲/۵، ۴۰/۴، ۳۴/۴، ۴۳/۴)

بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

طاغوتی نظام کے سرغنہ شیاطین | چونکہ شیطان سرکشی و بغاوت کا مظہر ہے اس لئے

قرآن نے خدا فراموش جماعتوں کے سرغنوں اور سرکردہ
لیڈروں کے لئے بھی شیاطین کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور حق بھی یہ ہے کہ یہ لوگ جو اس کی کوشش کرتے
رہتے ہیں کہ دنیا میں خدا کا قانون رائج نہ ہونے پائے، اگر شیاطین نہیں تو اور کیا ہیں؟ سورہ بقرہ کے شروع
ہی میں منافقین کے متعلق فرمایا:

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْا اٰمَنَّا بِهٖ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى
شَيْطٰنِهِمْ قَالُوْا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝ (۲/۱۴)

جب یہ لوگ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو (دعوتِ حق پر) ایمان لائے ہیں تو اپنے آپ کو

مومن ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن جب اپنے شیطانوں کے ساتھ اکیلے میں بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو ان کے ساتھ مسخر کرتے تھے۔ ورنہ (ویسے دل سے تو) ہم تمہارے ہی ساتھ ہیں۔

سورۃ انفال میں اس شیطان کا ذکر ہے جس نے کفار مکہ کو مسلمانوں کے خلاف ابھارا تھا۔ اور پھر میدانِ کارزار سے خود بھاگ نکلا تھا۔ تاریخ اس کا نام سراقہ ابن مالک ابن حشم بتاتی ہے۔ (دیکھتے ۸/۴۸)۔

سورۃ بقرہ کے بارہویں رکوع میں حضرت سلیمانؑ کا ذکر ہے جس کے ضمن میں فرمایا کہ یہود بجائے اس کے کہ قانونِ خداوندی کا اتباع کرتے، ان افترا پردازوں اور افسانہ پردازوں کے پیچھے لگ جاتے تھے جو شیطان نے مملکتِ حضرت سلیمانؑ کے خلاف پھیلا رکھی تھیں۔

وَ اتَّبِعُوا مَا تَشَاءُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمَنَ ۖ وَ مَا كَفَرُوا
سُلَيْمَنَ ۚ وَ لَكِنَّ الشَّيْطَانُ كَفَرُوا (۲/۱۰۲)

یہ لوگ ان افسانہ پردازوں کے پیچھے لگ گئے جو مفسدہ پرداز لوگوں نے مملکتِ سلیمانؑ کے خلاف پھیلا رکھی تھیں (جن کی رؤسے وہ کہتے تھے کہ سلیمان کا فرانہ عقائد و اعمال کا مرتکب ہو چکا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ) سلیمان نے کبھی کفر کی روش اختیار نہیں کی (نہ ہی وہ ایسا کر سکتا تھا) بلکہ ان ہی مفسدہ پردازوں نے ایسی روش اختیار کر رکھی تھی۔

یہاں بھی شیاطین سے مفہوم فتنہ جو اور فساد انگیز لوگوں کے سرغنوں سے ہے (تفصیل اس کی اپنے مقام پر آئے گی)۔ سورۃ النعام میں فرمایا۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيْطٰنِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوحِيْ
بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۚ وَ لَوْ شَاءَ رَبُّكَ
مَا فَعَلُوْهُ ۚ فَذَرْهُمْ ۚ وَ مَا يَفْعَلُوْنَ ۝ (۶/۱۱۳)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے (جب اس کی دعوت کا ظہور ہوا تو) شہری اور بدوی لوگوں کے سرغنوں کو ان کا دشمن ٹھہرا دیا جو ایک دوسرے کو ملمع سازیاں سکھاتے تاکہ لوگوں کو فریب دیں۔ اور اگر تمہارا پروردگار (چاہتا تو یقیناً ایسا کر سکتا تھا کہ) وہ دشمنی نہ کرتے۔ (لیکن اس کا قانون ہے کہ انسان کے اختیار کو سلب نہ کیا جائے) پس ان کی فتنے سے دل گرفتہ نہ ہوا اور) انہیں ان کی افترا پردازوں میں چھوڑ دو۔

یہاں سے یہ واضح ہے کہ حضرات انبیاء کرام کے پیغمبر دشمن کے مخالفین کو شیاطین کہا گیا ہے۔ یہ درحقیقت وہ مذہبی پیشوا ہیں جو (رسول کے چلے جانے کے بعد) اپنی پُر فریب، ملمع ساز لیکن نہایت دلچسپ باتوں کو اس کی تعلیم میں ملا دیتے تھے (یا اُس کی جگہ ان باتوں کو دین بنا کر عام کر دیتے تھے) اور اس طرح قوم خدا کے صحیح دین کو چھوڑ کر ان کے خود ساختہ مذہب کا اتباع کرنے لگ جاتی تھی۔

اسی طرح غیر بہذب اور وحشی قبائل کے وہ قومی ہیکل، دیوپیکر سرکش قبائل جنہیں حضرت سلیمان نے ہیکل کی تعمیر کے سلسلہ میں مختلف کاموں پر لگا رکھا تھا، شیاطین کے نام سے مذکور ہیں۔

وَمِنَ الشَّيْطَانِ مَنْ يَغْوِي صُورًا لَهُ وَيَعْمَلُونَ عَمَلًا دُونَ ذَلِكَ
وَكُنَّا لَهُمْ حَفِظِينَ ۝ (۲۱/۸۲ نیز ۳۷/۳۸ - ۳۸/۳۸)

اور سرکش قبائل کے وحشی انسان جو اس کے لئے دیاؤں میں غوطے لگاتے اور اس کے علاوہ بھی طرح طرح کے کام کرتے۔ اور ہم انہیں اپنی پاسبانی میں لئے ہوئے تھے۔

کاہن اور نجومی | انسان کے عہد جہانت میں یہ عقیدہ تھا کہ انسانوں کی قسمت ستاروں سے وابستہ ہوتی ہے اور کاہن اور نجومی آسمان پر جا کر ستاروں کی باتیں معلوم کر لیتے ہیں اور پھر انسانوں کی قسمت کے متعلق پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ آپ تاریخ مذاہب پر غور کیجئے۔ آپ کو ہر معبد میں کاہنوں اور نجومیوں کے ”مفد سین“ ملیں گے جن کی پرستش ہوتی تھی۔ قرآن کریم نے ان لوگوں کو بھی شیاطین کہہ کر پکارا ہے اور کہا ہے کہ عہد جہانت میں تو ان کا کاروبار چل سکتا تھا لیکن اب جو قرآن کی روشنی سے فضا معمور ہو گئی ہے اب اگر یہ ”آسمان پر جا کر حالات معلوم کرنے“ کی کوشش کریں گے تو علم و بصیرت کا آتشیں کوڑا ان کا تعاقب کرے گا اور یہ وہاں سے خاسر و ناکام بھاگ کھڑے ہوں گے۔ اب اس قسم کی توہم پرستیوں کا دور گزر چکا ہے۔ اب اگر ان کی کوئی بات ٹھیک نکل آتی ہے تو وہ محض قیاس آرائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ نہ علم و بصیرت کا نتیجہ۔ اور نہ ہی ان کی ”روحانی قوتوں“ کا کرشمہ! (قرآن کریم کی آیات ۱۶-۱۸/۱۵، ۶-۱۰/۲۷، ۵/۶۷)۔ سورہ طور کے دو سکے رکوع میں مذکور ہے۔

أَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ هُمُ السَّيْطَرُونَ ۝ (۵۲/۲۷)

(اے پیغمبر! کیا ان کے پاس تیرے پروردگار کے خزانے ہیں یا وہ (یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خود)

ہی (دنیا جہان کے) داروغہ بن گئے ہیں۔
 سلسلہ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کا ہنوں یا بخومیوں کا ذکر ہے جن کی اُس زمانہ میں پریش ہوتی تھی۔
 اس کے بعد ہے۔

أَمْرَ لَهُمْ سَلَامٌ يَسْتَمِعُونَ فِيهِ ۚ فَلْيَاثِ مُسْتَمِعُهُمْ سُلْطٰنٍ
 مُّبِينٍ ۝ (۵۲/۳۸)

یا اُن کے پاس کوئی سیڑھی ہے (جس پر چڑھ کر وہ آسمانوں سے راز کی باتیں سُن
 آتے ہیں۔ تو اُسے پیغمبرِ تو اُن سے کہہ کیوں نہیں دیتا کہ) جو اُن میں سے سننے والا ہے اسے
 کوئی واضح دلیل لانی چاہیئے ؟

یہاں اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ سب ان لوگوں کی حیلہ کاری اور فسوں سازی ہے جو یہ دعویٰ کرتے
 ہیں کہ انہیں آسمانی باتوں کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ وحی آسمانی تک ان لوگوں کی رسائی نہیں۔ یہ حقائق تو
 کتاب اللہ میں ہی مل سکتے ہیں جس کا نزول ملا را علی سے ہوتا ہے۔ کتاب اللہ کسی شیطان کا کلام نہیں ہے۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ الرَّحِيْمِ ۝ (۸۱/۲۵)

اور وہ (شُرآن) کسی مردود شیطان کا کلام نہیں ہے۔

قرآن اُن کے اثرات سے منزہ ہے | بلکہ شیاطین تو اس کے سننے تک سے باز
 رہ گئے ہیں۔

وَمَا تَنْزَلَتْ بِهِ الشَّيْطٰنُ ۝ وَمَا يَلْبَغِي لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيعُوْنَ ۚ

إِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعَزُوْنُوْنَ ۝ (۲۱۰ - ۲۱۲/۲۶)

اور (دیکھ اے پیغمبرِ اسلام!) اس قرآن کو شیاطین لے کر نہیں آتے نہ انہیں لے کر
 اُترنا چاہیئے اور نہ ہی وہ اُتر سکتے ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ سننے سے بھی باز رکھے
 گئے ہیں۔ (کیونکہ قرآن ایک مکمل صداقت اور حقانیت ہے اور صداقت و حقانیت سے
 شیاطین کو کیا سروکار؟)

قرآن آسمان کی نورانی فضاؤں سے براہِ راست قلبِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مقدس قندیل میں اُترا
 ہے اور راستہ کی کٹافتوں سے یکسر پاکیزہ اور منزہ رہا ہے اس کی تو کیفیت یہ ہے کہ

از تاک بادہ گیرم دور ساغر افکنم
شیاطین کی کیا مجال کہ اس کے بلند بالا سرچشمہ کو جھانک سکیں یا کوثر و سلبیل کی اس جوئے نضاف میں
کسی قسم کا تکبر پیدا کر سکیں۔ اِنَّهُ نَزَّلَ عَلٰی قَلْبِكَ۔

سحر و کہانت کی شعبہ بازیاں عہد جاہلیت و ظلمت میں اپنا سکہ جما سکتی تھیں۔ لیکن قرآن کریم کے
نزول کے بعد جو سرتاپا علم و بصیرت اور نور و حکمت ہے ان افسانہ طرازیوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ اب
بارگاہ علم و دانش سے اُن پر آگ کے کوڑے برسائے جاتے تھے۔ آپ تاریخ کے اوراق اُلٹ کر دیکھئے کہ
سحر و کہانت کا ذہن انسانی پر کس قدر گہرا اثر تھا۔ لیکن آج وہ اثرات صرف جہالت اور تاریکی کی وادیوں
میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ قرآن کریم کے آفتاب نے ان ظلمتوں کو چاک کر دیا۔ نورِ سحر سے رات کی تاریکیاں
کا فور ہو گئیں۔ ان ساحر و لکھنوں یا بخومیوں پر گویا وہ دروازے بند ہو گئے جن کی راہوں سے وہ عوام
کو فریب دیا کرتے تھے یہی وہ کامن اور بخومی تھے جن کا ذکر سورہ جن کی ذیل کی آیات میں بھی آیا ہے۔

وَ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَا مُلَاسًا حَرَسًا شَدِيدًا وَ شُهُبًا
وَ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۖ فَمَنْ يَسْمَعِ الْاُنَّ يَحِجُّ
لَهُ شُهُبًا رَّصَدًا ۝ (۸-۹/۴۲)

اور یہ کہ ہم نے تمام آسمان کو ٹٹول کر دیکھ لیا (آجکل) ہم نے اسے سخت سنگین پہرہ دار
شعلوں سے بھر پور پایا۔ اور (آپ لوگ خوب جانتے ہیں) کہ ہم (کچھ راز کی) باتیں سننے کے
لئے آسمان کے (خاص خاص) ٹھکانوں پر بیٹھ جایا کرتے تھے (مگر اب وہ ناممکن ہو گیا ہے)
جو کوئی اب سنتا ہے وہ اپنے تعاقب میں ایک شعلہ کو پاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے انسانی دنیا میں ایک محیر العقول انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے کہہ دیا کہ
اب ذہن انسانی اپنے سینے شعور میں داخل ہو رہا ہے۔ اس لئے اب دنیائے انسانیت میں کسی قسم
کی توہم پرستی کی گنجائش نہیں رہے گی۔ قرآن کی دعوت سرتاپا علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی
دعوت ہے۔ وہ انسانی عقل و دانش سے اپیل کرتا ہے اور فکر و تدبیر سے کام نہ لینے والوں کا ٹھکانہ جہنم

قرار دیتا ہے۔ لہذا نزول قرآن کے بعد اس توہم پرستی کا دور ختم ہو گیا جس میں پیشوائیت
(PRIEST HOOD) کا مقدس طائفہ لوگوں کو اس فریب میں مبتلا رکھا کرتا تھا کہ وہ غیب کی خبریں جانتے

ہیں اور انہیں آسمانی راز معلوم ہیں۔ یہی وہ ”شیاطین“ ہیں جنہیں قرآن کی بارگاہِ علم و دانش سے آتشیں کوڑے پڑتے ہیں۔

شُدّان نے تو یہ کہا تھا۔ لیکن اس کے بعد خود شُدّان کی حامل قوم کی یہ کیفیت ہو گئی کہ اب ان کے ہاں قدم قدم پر وہ حضرات تشریف فرما ملتے ہیں جنہیں دعویٰ ہے کہ وہ غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ وہ پیش گوئیاں کرتے ہیں اور لوگوں کو ان کی قسمت بتاتے ہیں۔ بلکہ قسمت بدل دینے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

سوچئے کہ قرآن کا پیغام کیا تھا اور اس کی وارث قوم کیا کر رہی۔ ہے؟



تخریف کتب سماوی عمل شیطانی تھا | قرآن سے پیشتر تمام کتب سماوی کے ساتھ یہ ہوتا رہا کہ رسول کی تشریف برآری کے بعد شیطانی

رسول کی تلاوت فرمودہ وحی میں اپنی طرف سے بہت کچھ ملا دیتے تھے اور یوں اس خالص آسمانی تعلیم کو محرف بنا دیتے تھے۔ جب یہ صورت پیدا ہو جاتی تو اس کے بعد اللہ کی طرف سے ایک دوسرا رسول آجاتا جو ذہن انسانی کے داخل کردہ رطب و یابس کو الگ کر کے خدائی تعلیم کو پھر سے منترہ و مطہر کر دیتا۔ سورۃ حج میں فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَخَّى

أَلْفَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ ۖ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ (۲۲/۵۲)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پیشتر جتنے رسول اور نبی بھیجے سب کے ساتھ یہ معاملہ پیش

آیا کہ جو کچھ انہوں نے تلاوت کیا اس میں شیطان نے (کچھ اپنی طرف سے) ملا دیا۔ اور پھر

اللہ نے اس کی آمیزش کا اثر مٹا دیا اور اپنی آیات کو اور زیادہ مضبوط کر دیا۔ وہ (سب کچھ)

جاننے والا (اپنے سارے کاموں میں) حکمت والا ہے۔

وضع روایات | اس کے علاوہ ان ہی شیاطین کی ایک اور اسی قسم کی حرکت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ لوگ وحی آسمانی میں تخریف نہیں کرتے بلکہ ایسی ایسی

دلچسپ باتیں وضع کر کے انہیں دین کا نگاہ فریب نقاب اڑھا دیتے ہیں کہ رفتہ رفتہ ہی بائیں عین دین

بن جاتی ہیں اور اس طرح دین خداوندی ان مزین پردوں کے پیچھے چھپ کر یوں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ اگر اسے کبھی بے نقاب کر کے سامنے لانے کی کوشش بھی کی جائے تو لوگ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ سورۃ انعام کی اس آیت کو ایک بار پھر سامنے لائیے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَاطِئِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ۚ وَكَوْشَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ ۚ فَلَا تَرَاهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ۝ (۶/۱۱۳)

اور (اے پیغمبر!) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے شہری اور بدوی لوگوں کے سرغنوں کو دشمن ٹھہرا دیا، جو ایک دوسرے کو خوشنما باتیں سکھاتے تاکہ لوگوں کو فریب دیں۔ اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو یقیناً ایسا کر سکتا تھا کہ وہ دشمنی نہ کرتے (مگر اس کی حکمت کا فیصلہ ہی ہو گا کہ انسانوں کے اختیار و ارادہ کو سلب نہ کیا جائے) پس تو ان کی مخالفت سے دل گرفتہ نہ ہو) اور انہیں ان کی افترا پر دازیوں میں چھوڑ دو۔

لوگ اس کذب و افتراء کے دام ہمرنگ زمین میں پھنس جاتے ہیں اور یوں حقیقت سے دُور جا پڑتے ہیں۔

وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَلِيَرَوْهُ وَلَا يَقْتَرِفُوا مَا هُمْ مُقْتَرِفُونَ ۝ (۶/۱۱۴)

اور (خدا کے نبیوں کے یہ دشمن اس طرح کی باتیں اس لئے سکھاتے ہیں) تاکہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے دل پُر فریب باتیں سُن کر ان کی طرف جھک پڑیں اور ان کی باتیں پسند کریں۔ اور جیسی بدکرداریاں وہ خود کرتے رہتے ہیں، ویسی ہی یہ بھی کرنے لگیں۔

حالانکہ اطاعت ان نظر فریب اور دلچسپ باتوں کی نہیں بلکہ کتاب خداوندی کی کرنی چاہیے (۶/۱۱۵)۔



میں بھی آتا ہے۔

عربی زبان میں شیطان سانپ کے معنوں

شیطان بمعنی سانپ

قرآن کریم میں بھی دو تین مقامات پر یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال

ہوا ہے۔ مثلاً ناگ پھن تھوہر کے متعلق ہے۔

طَلْعَهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ ۝ (۳۷/۶۵)

اس (درخت زقوم) کے پھول (ایسے ہوتے ہیں) گویا کہ سانپوں کے پھنے ہوں۔

سورخوار کی نفیاتی کیفیت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقْوَمُونَ إِلَّا كَمَا يَقْوَمُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ط (۲/۲۷۵)

جو لوگ (ماجتمندوں کی مدد کرنے کی جگہ اٹھائے) سود لیتے اور اس سے اپنا پیٹ پالتے ہیں وہ (یاد رکھیں) ان کے ظلم و ستم کا نتیجہ ان کے آگے آنے والا ہے۔ وہ اکھڑے نہیں ہو سکیں گے مگر اس آدمی کا سا کھڑا ہونا جسے سانپ نے ڈس کر خبطی (پاگل) بے شعور کر دیا ہو۔ (ہو) زرا انسان کو اس طرح مغبوط الحواس بنادیتی ہے۔

اسی طرح حضرت ایوبؑ کے قصہ میں مذکور ہے کہ انہیں سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اس کے لئے بھی ”شیطان“ کا لفظ آیا ہے (۳۸/۴۱)۔



خلاصہ مبحث | ابلیس یا شیطان، انسان کے ان جذبات کا نام ہے جو قوانین خداوندی سے سرکشی برت کر انسان کو غلط راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔ ان جذبات کی سرکشی کی بنا پر انہیں ”شیطان“ کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ ہر سرکشی کا آخری نتیجہ مایوسی ہوتا ہے اس جہت سے انہیں ”ابلیس“ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ابلیس اور شیطان ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں جس کا مسکن خود انسان کا سینہ ہے۔ شیطان کے کارنامے یہ ہیں کہ انسانوں کے دل میں وسوسے پیدا کئے جائیں تاکہ ان کے عزم و ایقان میں تزلزل واقع ہو جائے۔ ان کے راستے میں باطل تمناؤں اور حسین آرزوؤں کے ایسے نظر فریب مناظر بچھا کر رکھ دیئے جائیں جن میں ان کا دامن نگاہ الجھ کر رہ جائے اور وہ یوں سفر زندگی میں سوئے منزل رواں دواں جانے کے بجائے اسی تماشائے رنگ و بو میں کھو کر رہ جائیں۔ پھر ان کی سعی و کوشش کو ایسا خوشامبنا کر دکھایا جائے کہ انہیں احساس تک بھی نہ ہو کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ غلط اور بے نتیجہ ہے۔ اس قسم کے نگہ فریب مناظر اور زینت اعمال کے لئے مذہب کی دنیا بہت راس آتی ہے۔

شیطان کا کام یہ بھی ہے کہ جوں ہی انسان کے سامنے اجتماعی مفاد انسانیت کا گوشہ آئے اس کے ذاتی منافع کو ابھار کر سامنے رکھ دیا جائے تاکہ وہ ایثار و قربانی کی راہوں سے کتراتا ہوا نکل جائے۔ اس کے علاوہ مختلف انداز کی فتنہ پرداز یوں اور مفسدہ انگیزیوں سے ایسی صورتِ حالات پیدا کرنا ہے جس سے حیاتِ اجتماعیہ کا شیرازہ بکھر جائے۔ اور سب سے بڑی چیز یہ کہ وہ قلبِ انسانی کو خوف و حزن کا کاشانہ بنا کر اس کی غیرت و حمیت اور حرأت و بصالت کی دنیا کو برباد کر دیتا ہے۔ اس لئے حق پرستوں کی جماعت کو ہمیشہ شیطانی رجحانات و عواطف کی اطاعت سے روکا گیا ہے۔

شیطان کے علاوہ قرآن کریم نے اسی مقصد کے لئے طاغوت کا لفظ بھی استعمال کیا ہے جس کے معنی ہر وہ غیرِ خدائی نظام ہے جو انسانوں کو خدا کی حکومت سے ورغلا کر انسانوں کی اتباع و اطاعت سکھاتا ہے۔ یہ نظام حکومت و سلطنت کے علاوہ دنیائے مذہب میں بھی عجیب کشش و جاذبیت سے کار فرما رہتا ہے۔ لیکن کسی غیرِ خدا کی اطاعت، خواہ وہ حکومت و سلطنت کے رنگ میں ہو یا مذہب و عقیدت کے نقاب میں۔ بہر حال خدا سے کھلا ہوا شرک ہے۔

پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ شیطانی لغزشوں کے اسباب کہیں باہر سے نہیں آتے بلکہ اس کے ذمہ دار خود انسانی اعمال ہوتے ہیں اور اس سوسائٹی کے اثرات جسے انسان اپنے لئے اختیار کرتا ہے اسی کو "قرین" کہا گیا ہے۔

قرآن کریم نے طاغوتی نظام کے سرغنوں کے لئے بھی شیطان کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نیز سرکش و شعلہ مزاج وحشی قبائل کے لئے بھی اور دنیائے مذہب میں ان کے لئے بھی جو وحیِ خداوندی میں تحریف و الحاق کرتے ہیں۔ یا بڑی بڑی خوشنما اور دلچسپ باتیں وضع کر کے لوگوں کو کتابِ خداوندی کی اطاعت سے دوسری راہوں کی طرف لے جاتے ہیں۔



مَلِكُ

(پیکر ان اطاعت)

يَا عَظَا فَرَاغَرْدَ بَا فِطْرَتِ رُوحِ الْاٰمِيْنَ

ملائکہ

قصہ آدم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ملائکہ کو حکم دیا گیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں اور انہوں نے اس حکم کی تعمیل میں اپنا سر جھکا دیا۔

ملائکہ ملائک کی جمع ہے جس کی دوسری صورت ملک ہے اور اس کا مادہ (ا۔ ل۔ ک) ہے۔ الوکۃ کے معنی ہیں پیغام رسانی۔ لہذا ملائکہ کے معنی قاصد، پیغام رساں اور پہنچی کے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم میں ملائکہ کے لئے رُسُل کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی پیغام رساں ہیں۔

اللَّهُ يُصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا ذَرَّ النَّاسَ ۖ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ۝ (۲۲/۷۵)

اللہ نے ملائکہ میں سے بعض کو پیام رسانی کے لئے برگزیدہ کر لیا۔ اسی طرح بعض انسانوں کو بھی۔ بلاشبہ اللہ ہی ہے سننے والا، دیکھنے والا۔

لیکن یہی لفظ ”ملک“ سے بھی مشتق ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں مَلَائِكَة کے معنی ہوں گے مختلف قوتیں۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ملائکہ سے مفہوم وہ قوتیں (FORCES) ہیں جو کائنات کی عظیم القدر مشینری کو مشیتِ خداوندی کے مطابق چلانے میں مصروف العمل ہیں۔ اور چونکہ وہ قوتیں جو نظامِ فطرت کو چلانے کے لئے مامور ہیں (یعنی قوائے فطرت) اس لئے قانونِ خداوندی کی زنجیر کے ساتھ جکڑ دی ہوئی ہیں کہ اُن سے انسان کام لے سکے اس لئے قصہ آدم میں کہا گیا ہے کہ ملائکہ

نے آدم کو سجدہ کر دیا۔ مطلب یہ کہ فطرت کی قوتیں انسان کے لئے تابع فرمان بنادی گئی ہیں۔ یہ تمام قوتیں خدا کی اسکیم (PLAN) کے مطابق (جسے مشیت کہا جاتا ہے) مختلف امور کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل ہیں۔ نظام کائنات کے اس طرح چلانے کا نام قرآن کی اصطلاح میں ”تدبیر امور“ ہے۔ ان تمام تدابیر (SCHEMES) کا مرکزی کنٹرول خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اسے ”استویٰ علی العرش“ یعنی خدا کا مرکز حکومت کائنات پر مسلط ہونا کہا جاتا ہے۔ سورۃ یونس میں ہے۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ
ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُدِيرُ الْأُمُورَ (۱۰/۲)

تہا را پروردگار تو الله ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ مراحل میں پیدا کیا (یعنی چھ معین زمانوں میں پیدا کیا)۔ پھر اپنے تخت حکومت پر متمکن ہو گیا۔ وہی تدبیر امور کرتا ہے (یعنی کائنات کی ہستی پیدا بھی اسی نے کی ہے اور اس میں قانون بھی اسی کا کارفرما ہے اور فرماں روائی بھی اسی کی ہے)۔

یہی وہ امر ہے جس کی بناء پر کائنات کا یہ عظیم الشان سلسلہ قائم ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ (۳۰/۲۵)

اور (دیکھو!) اس کی نشانیوں میں سے ایک (زبردست) نشانی یہ بھی ہے کہ آسمان اور زمین اس کے امر (حکم اور ارادہ) سے قائم ہیں۔

ملائکہ مدبرات امور ہیں | یہ تدبیر امور کس طرح نافذ العمل ہوتی ہے یہ چیز ہماری سمجھ سے بالا ہے

لیکن قرآن نے بتایا ہے کہ قوانین مشیت کے تابع ان امور الہیہ کو جاری دساری کرنے کے فرائض جن کے ذمہ ہیں انہیں ملائکہ کہا جاتا ہے۔ اسی لئے ملائکہ کو مدبرات امور کہا گیا ہے۔

فَالْمُدَبِّرَاتِ أُمْرًا (۷۹/۵)۔ دوسری جگہ انہیں الْمُقْتَضَاتِ امور بھی کہا گیا ہے (۵۱/۴)۔ سورۃ طلاق میں ہے:

”مُدَبِّرَاتِ أُمُور“ سے مراد جماعت مومنین بھی ہو سکتی ہے جو احکام و قوانین خداوندی کو انسانی دنیا میں نافذ کرتی ہے۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ
الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ إِنَّ
اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝ (۲۱/۱۲)

اللہ ہی کی وہ ذات ہے جس نے متعدد فضائی کتبے پیدا کئے اور ان ہی کی طرح زمین
کو پیدا کیا (اور) ان سب میں اللہ کا امر نازل ہوتا ہے (یہ تمام باتیں بار بار ہم اس لئے
بیان کرتے ہیں) تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ وہ ہر چیز کو
(اپنے) احاطہ علمی میں لئے ہوئے ہے۔

دوسری جگہ اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا گیا ہے۔

فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا
وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ وَحِفْظًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ
الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ (۲۱/۱۲)

سو دو مراحل میں اس نے متعدد فضائی کتبے بنا دیئے اور ہر کتبے میں اپنا حکم بھیج دیا اور
ہم نے اس قریب والے آسمان کو ستاروں سے زینت دی اور اس کی حفاظت کی۔ یہ
انداز ہے میں خدا نے زبردست واقف الکل کے۔

وَسَائِطُ ذُرَّاعٍ | یعنی اللہ نے ان فضائی کتبوں میں اپنی وحی نافذ کر رکھی ہے کہ وہ اپنے
فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں رہیں۔ اس وحی کا "نزل" بھی ملائکہ

ہی کے ذریعے ہوا ہے۔ کیونکہ ملائکہ تقسیم امور کرنے والے ہیں۔ لہذا ملائکہ وہ وسائط ذرّاع ہیں جن کی رُود
سے امور الہیہ کائنات میں نافذ ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے امور کی تنفیذ
میں وسائط ذرّاع کا محتاج ہے۔ اس کی ذاتِ سمودیت احتیاج کے ہر تصور سے منزہ اور اسباب و
ذرائع کے ہر شائبہ سے مستغنی ہے۔ لیکن یہ اس کا قائم کردہ نظام ہے کہ دنیاے خلق ہو یا عالمِ امر حوادث و

حاملین عرش | اثرات اس کے متعین فرمودہ نظام کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ احتیاج اور
انتظام میں بد بھی فرق ہے۔ اسی نہج سے ملائکہ کو عرش الہی کے اٹھانے والے اور
اس کے گرد طواف کرنے والے بتایا گیا ہے۔

وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِّينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۖ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَقِيلَ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝
(۴۵/۳۹ ذ ۴۰/۴)

تو دیکھے گا کہ ملائکہ عرش کے گرد اگر دھلقہ باندھے ہوں گے (اور) اپنے پروردگار کی تسبیح و تحمید کر رہے ہوں گے۔ اور (اس دن) تمام بندوں میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا کہ ساری خوبیاں (صرف) خدا (ہی) کو زیبا ہیں جو تمام عالم کا پروردگار ہے۔

تذکرہ قیامت کے ضمن میں فرمایا:

وَالْمَلَائِكَةُ عَلَى أَرْجَائِهِمْ ۖ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَلَاثَةٌ ۝ (۱۷/۶۶)

اور فرشتے اس کے تمام اطراف پر ہوں گے اور ان سے بھی اوپر تیرے پروردگار کے عرش کو اُس دن آٹھ ملائکہ اٹھائے ہوں گے

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے عرش وہ مرکزِ حکومتِ خداوندی ہے۔ جہاں کائنات کی تدبیر امور ہوتی ہے۔ چونکہ یہ تدبیر امور ملائکہ کی وساطت سے سرانجام پاتی ہے اس لئے ملائکہ عرشِ الہی کے اٹھانے والے اور مکرستہ اس کے گرد گھومنے والے ہیں۔ تعمیلِ ارشادِ خداوندی میں ان کی یہ سرگردانی اور انہماک ہی ہے جس سے یہ کارگاہِ عالم اس حُسن و خوبی سے چلے

ملائکہ میں معصیت کی قدرت نہیں

ہیں ان میں اپنا دخل کچھ نہیں دیتے۔ انہیں ان میں دخل اندازی یا خلافت و رزی احکام کی قدرت ہی نہیں۔

وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ ۚ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (۱۶/۴۹)

اور آسمانوں میں جتنی چیزیں اور زمین میں جتنے جانور ہیں سب تو انہیں خداوندی کے سامنے

لے ملائکہ کی تسبیح و تحمید سے مطلب یہ ہے کہ وہ ان امور کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل رہتے ہیں جن کے نتائج خدا کی ربوبیت کی حمد و ستائش کے پیکر بن جاتے ہیں۔

(اے پیغمبر!) کہہ دے کہ اگر ایسا ہوا ہوتا کہ زمین میں (انسانوں کی جگہ) ملائکہ بسے ہوتے اور اطمینان سے چلتے پھرتے تو ہم ضرور آسمان سے ایک فرشتہ پیغامبر بنا کر اتار دیتے۔

یہاں سے ملائکہ کی رسالت اور حضرات انبیاء کرام کی رسالت کا فرق بتن طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ ایک رسالت (پیغام رسانی) تو یہ ہے کہ اللہ نے پیغام دیا اور اسے رسول تک پہنچا دیا، جس طرح ایک چٹھی رسالت مکتوب الیہ تک چٹھی پہنچا دیتا ہے۔ یہ پیغام رسانی ملائکہ کی ہے، دوسری پیغام رسانی حضرات انبیاء کرام کی ہے جن کے متعلق فرمایا کہ چونکہ انہیں انسانوں کی رشد و ہدایت کے لئے بھیجا جاتا تھا اس لئے اس غرض کے لئے انسان ہی منتخب کئے جاتے تھے تاکہ وہ پیغام خداوندی کو ایک عملی نظام کی صورت میں مشکل کر کے بتادیں کہ انسانی معاشرہ کی صحیح تصویر کیسی ہونی چاہیئے۔

اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ بعض لوگ اس آیت **ایک نکتہ کی وضاحت** سے یہ استدلال لاتے ہیں کہ فرشتے بھی ہماری طرح کی مخلوق ہیں اور

جس طرح ہم زمین پر بستے ہیں، وہ بھی اسی طرح بس سکتے ہیں۔ فرشتوں کے مخلوق ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں لیکن یہ کہنا کہ وہ بھی ”ہماری طرح“ کی مخلوق ہیں قرآنی تصریحات کی ردشنی میں صحیح نہیں، جہاں تک اس آیت کا تعلق ہے، اس سے پہلی آیت میں ہے (اور دیگر مقامات میں بھی یہ آیا ہے) کہ ان لوگوں کا اعتراض تھا کہ رسول عام انسانوں جیسا انسان کیوں ہے۔ اسے کوئی فوق الفطرت ہستی ہونا چاہیئے جیسے ملائکہ (۱۴/۹۴)۔ ان کے اعتراض کے جواب میں کہا گیا کہ تم اپنی اچھوتہ پسندی کی دھن میں اتنا بھی نہیں سوچتے کہ رسول کا منصب کیا ہوتا ہے۔ رسول کے ذمے صرف خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچا دینا نہیں۔ وہ پہلے خود اس پیغام پر عمل کرتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی دوسرے انسانوں کے لئے نمونہ بنتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسول کو انہی جیسا ہونا چاہیئے جن کی طرف وہ رسول بن کر آئے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کی زندگی اس کے مخاطبین کے لئے نمونہ کیسے بن سکتی ہے؟ چونکہ یہاں انسان بستے ہیں اس لئے رسول بھی ایک انسان ہی ہونا چاہیئے، تمہارا مطالبہ کہ رسول کو فرشتہ ہونا چاہیئے اسی صورت میں معقول ہو سکتا تھا جب یہاں فرشتے بستے۔ یہ ان کے اعتراض کا منطقی جواب تھا۔

حضرت عیسیٰ کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا (اور ہے) کہ وہ فوق البشر تھے۔ ان کے اس

غلط عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ ان کی زندگی بنی اسرائیل کے لئے نمونہ تھی۔ اگر وہ فوق البشر ہوتے تو ان کی زندگی انسانوں کے لئے نمونہ کیسے بن سکتی تھی (۲۳/۵۹)۔ وہ فوق البشر ہوتے تو یہاں کی مخلوق کو بھی فوق البشر (ملائکہ) ہونا چاہیے تھا (۲۳/۶۰)۔

”انسانوں کے لئے انسانوں میں سے رسول“ یہ ایک ایسی حقیقت باہرہ تھی جس کی حکمت پر ہر چشم بصیر شاہد تھی لیکن نہ ماننے والوں (کفار) کے نزدیک یہی شے محل نظر تھی اور وہ اعتراض کرتے تھے کہ ہمارے جیسا ایک انسان اور رسول! بھلا یہ کیا؟ قوم نوح نے یہی اعتراض پیش کیا تھا جب کہا کہ

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ
يُرِيدُ أَنْ يَنْفَضِّلَ عَلَيْكُمْ ۚ وَ لَوْ شَاءَ اللَّهُ لَوُنْزِلَ مَلَكٌ مِثْلُ
مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ ۝ (۲۳/۲۴)

اس قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی وہ یہ سُن کر کہنے لگے ”یہ آدمی اس کے سوا کیا ہے کہ ہمارے ہی جیسا ایک آدمی ہے؟ مگر چاہتا ہے کہ تم پر اپنی بڑائی جتائے۔ اگر اللہ کو کوئی ایسی ہی بات منظور ہوتی تو کیا وہ فرشتے نہ اتار دیتا؟ (وہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی کو اپنا پیامبر کیوں بنانے لگا؟) ہم نے اگلے بزرگوں سے تو کوئی ایسی بات کبھی سنی نہیں“

یہی قوم عاد و ثمود نے کہا:

إِذْ جَاءَهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا
تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۚ قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنْزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا
بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ۝ (۴۱/۱۴)

جب اُن کے پاس اُن کے آگے سے بھی اور ان کے پیچھے سے بھی (بکثرت) پیغمبر آئے (اور ان میں سے ہر ایک یہی کہتا آیا) کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عہودیت (اطاعت و فرمانبرداری) اختیار نہ کرو، تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر ہمارے پروردگار کو (یہ) منظور ہوتا کہ وہ کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجے (تو وہ ہرگز ہمارے پاس جیسا ایک انسان نہ بھیجتا بلکہ) فرشتوں کو بھیجتا۔ (ہم تمہاری اس رسالت کو نہیں مانتے) بلاشبہ ہم ان تمام احکام (توحید وغیرہ)

سے منکر میں جنہیں لے کر تم اپنے دعوے کے مطابق خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہو۔
 حالانکہ حضرات انبیائے کرام خود اعتراف کرتے تھے کہ ہم فرشتے نہیں ہیں۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا:
 وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا
 أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ (۱۱/۳۱)

اور دیکھو! میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں
 غیب کی باتیں جانتا ہوں، نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔

نبی اکرمؐ نے بھی یہی فرمایا:

قُلْ لَا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا
 أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ ج (۶/۵۰)

لے پیغمبر! تم ان لوگوں سے کہہ دو "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے غیبی خزانے
 ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ غیب کا جاننے والا ہوں، نہ میرا یہ کہنا ہے کہ میں (انسانیت کا دارا)
 فرشتہ ہوں۔"

اس آیت سے بھی بعض لوگ یہ دلیل لاتے ہیں کہ فرشتے ہمارے جیسی مخلوق ہیں، جیسی تو رسول اللہ
 (یا حضرت نوحؑ) نے کہا کہ "میں فرشتہ نہیں"۔ یہ دلیل بھی بڑی کمزور ہے۔ اس سے تو بلکہ اس کے
 برعکس نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ (جیسا پہلے واضح کیا جا چکا ہے) مخالفین کا بنیادی مطالبہ
 یہ تھا کہ رسول کو انسان نہیں، فوق البشر ہستی ہونا چاہیے۔ اسی لئے وہ رسولوں سے معجزات کی
 فرمائش کرتے تھے۔ ان کے جواب میں کہا گیا کہ رسول فوق الفطرت باتیں کس طرح کر کے دکھائے
 جبکہ وہ کوئی فوق الفطرت ہستی نہیں۔ چونکہ مخاطبین کے ذہن میں فوق الفطرت سے مراد ملائکہ تھے
 اس لئے "وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ" کہہ کر ان کی تردید کی گئی۔ مطلب اس کا صاف ہے
 کہ (رسول نے کہا کہ) اگر میرا یہ دعویٰ ہوتا کہ میں انسان نہیں، کوئی فوق البشر ہستی ہوں تو تم مجھ سے
 فوق الفطرت باتوں کا مطالبہ بھی کرتے۔ جب میرا یہ دعوے ہی نہیں تو مجھ سے اس قسم کے مطابقت
 بے معنی ہیں۔

عجیب عجیب اعتراضات | اب آگے بڑھتے۔ کفار کا اعتراض فقط اتنا ہی نہیں تھا۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر یہ حضرات خدا کے رسول ہیں تو ان کے جلو میں

فرشتوں کی قطاریں کیوں نہیں ہیں۔ حضرت موسیٰ کے متعلق یہی اعتراض کیا کہ اگر یہ رسول ہے تو

فَلَوْلَا أُلْقِيَ عَلَيْهِ أَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ أَوْ جَاءَ مَعَهُ الْمَلَأِكَةُ

مُقْتَرِبِينَ ۝ (۴۳/۵۳)

(اگر وہ سچ مچ نبی ہے تو اس کے ہاتھوں میں) سونے کے کنگن کیوں نہیں ڈالے گئے یا

پرے باندھے ہوئے اس کے جلو میں فرشتے کیوں نہیں آئے۔

یہیں تک بس نہیں! بلکہ وہ تو کہتے تھے کہ خود ان پر بھی فرشتے کیوں نہیں نازل ہوتے۔

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلَأِكَةُ أَوْ

نُرَىٰ رَبَّنَا ۖ لَقَدْ اسْتَكْبَرُوا فِي أَنفُسِهِمْ وَعَتَوْا كِبِيرًا ۝ (۴۵/۲۱)

اور وہ لوگ جو ہمارے قانون کا آئنا سامنا کرنے کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ (ان پیغمبروں

میں کیا خصوصیت ہے کہ ان پر فرشتے آتے ہیں) ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے۔ یا

ہم (کھلی آنکھوں) اپنے پروردگار کو کیوں نہیں دیکھ پاتے (کہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش

ہی باقی نہ رہے) یہ لوگ اپنے دلوں میں اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں (نہیں بلکہ) یہ

لوگ تو (حدِ انسانیت سے بھی) دور نکل گئے ہیں۔

(اس کی تفصیل چند قدم آگے چل کر ملے گی)۔

نزولِ ملائکہ | لیکن اس نفی کا یہ مطلب نہیں کہ حضرات انبیاء کرامؑ کے علاوہ اور کسی پر فرشتے نازل نہیں ہوتے حضرات انبیاء کرامؑ پر نزولِ ملائکہ، اللہ کی وحی کے ساتھ ہوتا ہے۔

اور رسالت کی وحی، رسول کے علاوہ اور کسی پر نازل نہیں ہو سکتی بلکہ ابلاغِ وحی کے علاوہ ملائکہ، اور

مقاصد کے لئے بھی نازل ہوتے ہیں۔ ہم اس سے پیشتر دیکھ چکے ہیں کہ المیس کا کام خوف و حزن پیدا

کرنا ہے۔ اس کے برعکس ملائکہ قلبِ مومن میں وہ تسکین و طمانیت پیدا کرتے ہیں جس سے خوف

لے وحی کی دیگر اقسام و تفصیل کے لئے وحی کا عنوان دیکھئے۔

و حزن پاس نہیں کھٹکنے پاتا۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ
أَوْ يَخَافُوا وَلَا تَخْزَوْنَ وَاَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ

(۳۱/۳۰)

ملائکہ جو لوگ اقرار کر لیں کہ ہمارا (حقیقی) پروردگار (صرف) اللہ (ہی) ہے پھر اس
پر ثابت قدم رہیں تو (خدا کے) ملائکہ ان پر نازل ہوتے ہیں (جو کہتے ہیں) کہ تم نہ اندیشہ
کردنہ غم کرو اور اس جنت (کے ملنے) سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے (پیغمبروں کی نصرت)
وعدہ کیا جایا کرتا تھا۔

ذرا نزولِ ملائکہ کی شرط پر پھر غور فرمایجئے۔ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا
اللہ کی ربوبیت پر ایمان اور پھر اس ایمان پر استقلال، محکم ایمان، غیر متزلزل ایمان، کوہ شکن
ایمان، ایسا ایمان کہ ابلیس کی بڑی سے بڑی قوت بھی اس میں جنبش نہ پیدا کر سکے۔ اس سے نزولِ
ملائکہ ہوتا ہے جس سے قلبِ انسانی تسکین و طمانیت کی نورانی بارشوں کا مہبط بن جاتا ہے۔ یہی وہ
تسکین و طمانیت کی بارش | استقلال و استقامت تھی جس کی بنا پر بدر و حنین
ان جنود و عساکر سے فرمائی جنہوں نے آکر مخالفین کے قلوب میں خوف اور رعب اور مسلمانوں کے دلوں
میں سکون و طمانیت پیدا کر دی۔ سورۃ آل عمران میں ہے:

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ ۖ وَمَا النَّصْرُ

إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ (۱۲۳ - ۱۲۴/۳)

اور دیکھو، یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے بدر کے میدان میں تمہیں فتح مند کیا تھا حالانکہ تم بڑی
کمزور حالت میں تھے (اور تمہاری کامیابی کا کوئی دہم و گمان بھی نہیں کر سکتا تھا) پس تم
سے کہا گیا کہ اللہ کے قانون کی حفاظت میں آ جاؤ (اور اس کی نافرمانی سے بچو) تاکہ تمہاری
کوششیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ (اے پیغمبر!) وہ وقت (بھی) یاد کرو جب تم (میدانِ
جنگ میں) ایمان والوں سے یہ کہہ رہے تھے کہ ”کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں

کہ اللہ دشمن تھے تین ہزار آدمیوں کے مقابلہ میں) تین ہزار نازل کئے ہوئے ملائکہ سے تمہاری مدد فرمائے؟" ہاں بلاشبہ اگر تم استقامت پذیر رہو اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو اور پھر ایسا ہو کہ دشمن تم پر اسی دم چڑھ دوڑے تو تمہارا پروردگار (صرف تین ہزار ملائکہ ہی سے نہیں بلکہ) پانچ ہزار نشان رکھنے والے ملائکہ سے تمہاری مدد کرے گا (اور دشمنوں کی کثرت و طاقت تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکے گی!) اور یاد رکھو، یہ بات جو کہی گئی ہے، تو صرف اس لئے کہ تمہارے لئے (فتح مندی کی) خوشخبری ہو اور تمہارے دل اس کی وجہ سے مطمئن ہو جائیں۔ اور مدد و نصرت جو بھی ہے، اللہ کے قانون کے مطابق ہی آتی ہے۔ اس کی طاقت سب پر غالب ہے اور وہ اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے!

سورۃ انفال میں انہی ملائکہ کے متعلق فرمایا:

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنْتُمْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا
سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَأَصِرُوا فُتًى الْأَوَّعَاتِ
وَاصْبِرُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝ (۸/۱۲)

(اے پیغمبر!) یہ وہ وقت تھا کہ تیرے پروردگار نے ملائکہ کو حکم دیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں (یعنی میری مدد تمہارے ساتھ ہے) پس مومنوں کو استوار رکھو۔ عنقریب ایسا ہوگا کہ میں کافروں کے دلوں میں (مومنوں کی) دہشت ڈال دوں گا۔ سو (مسلمانو!) ان کی گردنوں پر ضرب لگاؤ۔ ان کے ہاتھ پاؤں کی ایک ایک انگلی پر ضرب لگاؤ!

یوم حنین کے متعلق ارشاد ہے،

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ ۚ وَ يَوْمَ حُنَيْنٍ
... وَ ذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝ (۹/۲۵-۲۶)

(مسلمانو!) یہ واقعہ ہے کہ اللہ بہت سے موقعوں پر تمہاری مدد کر چکا ہے (جبکہ تمہیں اپنی قلت و کمزوری سے کامیابی کی امید نہ تھی) اور جنگ حنین کے موقع پر بھی جبکہ تم اپنی کثرت پر اترا گئے تھے (اور سمجھتے تھے کہ محض اپنی کثرت سے میدان مار لو گے) تو دیکھو وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی پوری وسعت کے باوجود تمہارے لئے تنگ

ہو گئی۔ بالآخر ایسا ہوا کہ تم میدان کو پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے۔ پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی جانب سے دل کا سکون و قرار نازل فرمایا اور ایسی قوتیں انہیں عطا کر دیں جو نظر نہیں آتی تھیں۔ اور (اس طرح) ان لوگوں کو عذاب دیا جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی اور یہی جزا ہے ان لوگوں کی جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں! (یعنی ان کی بد عملی کا لازمی نتیجہ یہی ہے)۔

ان تمام مقامات پر غور کیجئے۔ ”ملائکہ کی مدد“ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اس سے جماعت مومنین کے دلوں کو تسکین ملی تھی اور ان کے عزائم پختہ ہو گئے تھے۔ دوسری طرف دشمنوں کے دل خوف زدہ ہو گئے تھے اور ان کے حوصلے چھوٹ گئے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان مقامات میں ملائکہ سے مراد وہ نفسیاتی محرکات ہیں جو انسانی قلوب میں اثرات مرتب کرتے ہیں اور چونکہ ان کے عزائم و اعمال پر نفسیاتی کیفیات بڑا گہرا اثر کرتی ہیں اس لئے فتح و شکست اور کامیابی و ناکامی کا بیشتر انحصار ان ہی پر ہوتا ہے۔ اسی قلبی سکون اور دلی اطمینان کا تذکرہ اس واقعہ میں بھی کیا گیا ہے۔ جب نبی اکرم (ص) اپنے ایک ساتھی جناب صدیق (کی معیت میں) صبح ہجرت ایک غار میں پناہ گزین تھے۔ دنیاوی نقطہ اعتبار سے بالکل بے کس و بے بس، بے سروسامان، بے یار و مددگار، گھربار چھوڑ کر وطن سے بھاگے ہوئے، دشمن اپنے پورے ساز و سامان سے تعاقب میں۔ ذرا تصور میں لائیے خوف و ہراس کے اس حوصلہ شکن منظر کو! اس بے کس کی حالت میں چھپے بیٹھے ہیں۔ دشمنوں کے گھوڑوں کی ٹاپ کی آواز کانوں میں آرہی ہے اس یار غار کی پیشانی پر اپنی خاطر نہیں بلکہ پیاس خاطر رفیق اعظم، تردد و پریشانی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ اس دوست کی نگاہوں نے اسے دیکھا اور پاس و نا اُمیدی کے اس ہولناک سماں میں پورے حرم و یقین کے ساتھ فرمایا کہ ”لَا تَحْزَنُ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا“ مت گھبراؤ اللہ ہمارے ساتھ ہے! اس تشبیہ قلب اور تسکین خاطر کو بھی ”نزل ملائکہ“ سے تعبیر کیا گیا ہے جب فرمایا کہ

إِذَا تَنْصَرَوْا فَقَدْ فَصَرَهُ اللَّهُ إِذَا أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا.....

..... وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (۹/۴۰)

اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہیں کرو گے تو (نہ کرو) اللہ نے اس کی مدد کی ہے اور اس وقت مدد کی ہے جب کافروں نے اسے اس حال میں گھر سے نکالا تھا کہ (صرف دو آدمی

تھے اور) دو میں دوسرا (اللہ کا رسول) تھا اور دونوں غار میں چھپے بیٹھے تھے اور اس وقت اللہ کے رسول نے اپنے ساتھی سے کہا تھا، 'غمگین نہ ہو! یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے' (وہ دشمنوں کو ہم پر قابو نہ پالنے دے گا) پس اللہ نے اپنا سکون و قرار اس پر نازل کیا اور پھر ایسی فوجوں سے مددگاری کی جنہیں تم نہیں دیکھتے، اور بالآخر کافروں کی بات پست کی اور تم دیکھ رہے ہو کہ اللہ ہی کی ذات ہے جس کے لئے بلند ہی ہے، اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

اللہ ملائکہ اور جماعتِ مومنین کی یہی تائید و نصرت تھی جس کے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا:
 فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِيرٌ (۶۶/۴)

اگر پیغمبر کے مقابلہ میں تم نے کچھ کیا تو یاد رکھو! پیغمبر تمہارا محتاج نہیں، خدا، جبریل اور نیک مسلمان اس کے رفیق ہیں اور اس کے بعد عام ملائکہ بھی اس کے مددگار ہیں! (تفصیل اپنے مقام پر آئے گی)۔

یہی تائید و نصرت ہے جسے درود و صلوٰۃ کہا گیا ہے۔
درود و صلوٰۃ
 اٰمَنُوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (۳۳/۵۶)

(اے جماعتِ مومنین!) دیکھو! خدا اور اس کے ملائکہ (سب) نبی کی تائید و نصرت کرتے ہیں۔ سولے ایمان والو! تم بھی اس کی تائید و نصرت کرو۔ یعنی اس نظامِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرو۔

صرف نبی اکرم کی تائید و نصرت نہیں بلکہ تمام مومنین کی۔
 هُوَ الَّذِي يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكُتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۖ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ۝ (۳۳/۴۳)

(اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) خدا ہی کی تو وہ ذات ہے جو تمہاری تائید و نصرت کرتا ہے۔ اور اس کے فرشتے (بھی) تاکہ وہ تمہیں (غیر اللہ کی محکومی کی تاریکیوں سے نکال کر) محکوم

فَمَنْ تَبِعَ هَذَا وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

وہی
رہبر منزلِ حیات

اگرچہ عقل فسوں پیشہ لشکرے انگیخت
تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست

وحی

انسان، وادیِ آدمیت میں اُترنے کو اُترا، لیکن ابلیس کی بے پناہ قوتوں کو دیکھ کر سہم گیا، جو قدم قدم پر تصادم و تزاحم کے لئے آمادہ پیکار تھیں۔ ایسی مہیب اور خوفناک وادی اور یہ بالکل تنہا! کشمکشِ زندگی ایسی جالِ کاہ اور یہ بے سرو سامان!! آنے والے خطرات کے تصور سے اس کا جی بیٹھ گیا۔ خوف اور دہشت سے قدم لڑکھڑانے لگے۔ اس بولناک منظر میں اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی معین مددگار نظر نہ آیا۔ حسرت بھری نگاہیں اوپر کو اٹھیں اور ہمہ تن التجا بن کر ایک بلند و بالا چوکھٹ سے جائگراہیں۔ پکارنے والے نے یوں پکارا۔ اور جواب دینے والے نے اپنے ترجم ربلو بیت سے اس طرح نوازا کہ سکون و طمانیت کی ہزار جنتیں اس کے قلب مضطرب آباد کر دیں۔ فرمایا کہ:-

لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ ۝ (۲/۱۳۸)

دیکھو، نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو، تم ہی سب برتر و اعلیٰ ہو۔

کیوں گھبراتے ہو، کیوں خوف کھاتے ہو؟ تم تو دنیا میں سب سے بلند ہو، لیکن اس بلندی تک پہنچنے کا طریقہ یہ ہے کہ

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۲۸)

جب ہماری جانب سے تمہاری طرف ہدایت آئے تو جو ہدایت کی پیروی کرے گا اس کے

لئے کسی طرح کا کھٹکا اور کسی طرح کی غمگینی نہیں ہوگی۔

یہ مت خیال کر کہ اس ظلمت کدہ میں تجھے تنہا چھوڑ دیا گیا ہے، نورِ ازیلی کی شمعِ فروزاں تیرے ساتھ ہے پھر گھبرا نا کیسا؟

اگرچہ عقل فسوں پیشہ شکر سے انگیخت

تو دل گرفتہ نباشی کہ عشق تنہا نیست

ابلیس کی تمام لرزہ انگیز اور حوصلہ شکن قوتیں ایک طرف اور ان کے مقابلہ کے لئے ہدایتِ خداوندی دوسری طرف اس کے بعد انسان کو کسی دوسری چیز کی ضرورت نہ تھی۔

یہ سوال کہ کشمکشِ حیات میں متصادم قوتوں کے مقابلہ کے لئے انسان خود اپنا خضرِ راہ ہو سکتا ہے

یا اس کی راہنمائی کے لئے کسی خارجی روشنی کی بھی ضرورت ہے؟ بڑا اہم اور بنیادی ہے اور شروع سے

آج تک اربابِ فکر و نظر کی توجہات کا مرکز چلا آ رہا ہے۔ اس مقام تک پہنچنے سے پیشتر چند ایک ابتدائی

مراحل کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ اصل بحث شروع ہونے سے پہلے یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ مذہب

کا سارا دار و مدار وحی کے عین پر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ خدا کا ماننا ایک حقیقت کا اعتراف ہے۔

لیکن جس مقصدِ عظیم کے لئے خدا پر ایمان ضروری ہے وہ وحی کے ذریعے ہی پورا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ

ہدایتِ خداوندی وحی کے توسط ہی سے ملتی ہے اور یہی وہ ہدایت ہے جس سے انسان قوانینِ الہیہ کے

تابع زندگی بسر کر کے شرفِ انسانیت کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لہذا جس شخص کا صحیح معنوں میں خدا پر

ایمان ہے اس کے لئے وحی کا ماننا بھی ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اور خدا کا تعلق ہی وحی

کے ذریعے قائم ہے۔ اگر وحی نہ ہو تو ہم جان ہی نہیں سکتے کہ خدا کیا ہے اور اس کا انسانوں کے ساتھ

واسطہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سے خدا کی معرفت (پہچاننے) کا مطالبہ نہیں۔ مطالبہ اس کی نازل کردہ وحی

کی رو سے اس پر ایمان لانے کا ہے۔ وحی کے معنی ہیں وہ قانون یا ضابطہ جس کے مطابق انسانوں کو زندگی

لے عقل اور ادراک عقلِ مباحث کا تعلق علمِ فلسفہ سے ہے اس لئے موضوعِ زیرِ نظر کا انداز بھی فلسفیانہ ہی ہونا چاہیے

لیکن چونکہ فلسفہ کے فنی غوامض اور اصطلاحی رموز کا سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اس لئے کوشش یہ کی گئی ہے

کہ فلسفہ کے فنی اسلوب سے ہٹ کر عام فہم انداز میں بات کی جائے۔ وما توفیقی الا باللہ العلیٰ العظیم۔

بسر کرنا چاہیے۔ یہ ضابطہ یا قانون عقل انسانی کا پیدا یا تجویز کردہ نہیں بلکہ انسانی عقل سے ماورا۔ خود خدا کی طرف سے ملا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ مغربی تعلیم نے ہماری ذہنیت کو اس درجہ محسوسات کی چار دیواری میں محبوس کر دیا ہے کہ وہ مادہ سے آگے کسی اور دنیا کو بمشکل تسلیم کرتی ہے۔ انیسویں صدی کے اخیر تک کائنات کے متعلق مغرب کے سائنسدانوں کا تصور میکائی تھا جس میں مادہ کو کسی عقیدے کی گنجائش نہ تھی۔ وہ تصور یورپ کی فکر گاہوں سے ایک عرصہ ہو امر و دود قرار پا کر رخصت ہو چکا۔ لیکن ہمارے ہاں کی ذہنیتیں ابھی تک اسی تصور سے ماؤف چلی آرہی ہیں۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ ان کی تسکین خاطر کے لئے یورپ کے مفکرین اور ارباب سائنس کی جدید تحقیقات و نظریات کو سامنے لا کر دیکھا جائے کہ وحی پر ایمان خلاف علم و بصیرت تو نہیں؟

سب سے پہلے دیکھنا یہ ہے کہ کیا نوع انسانی کے سامنے کوئی سوال (PROBLEM) بھی ہے جسے اس کو بحیثیت انسان حل کرنا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ کسی دوسری نوع کے سامنے ایسا کوئی سوال نہیں۔ **ایک بنیادی سوال** | سلسلہ ارتقا میں انسان سے پہلی کڑی حیوانات کی ہے۔ ان کی زندگی محض طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے جس کی ضروریات و داعیات کی تسکین ان کا مقصود حیات ہے اور ان کی دنیا میں یہ سب کچھ میکائی طور پر ہوتا رہتا ہے۔ جب کھانے پینے کو مل گیا (یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ پیش پا افتادہ خطرات سے حفاظت و صیانت کا اطمینان ہو گیا) تو تمام مسائل حیات حل ہو گئے۔ اس کے بعد کوئی پیکان کاوش نہیں جو ان کے پیچھے سکون میں وجہ اضطراب ہو۔ کوئی نشتر تجست نہیں جو ان کی رگ طمانیت کے لئے باعث خلش ہو، کوئی اسرار و بواطن نہیں جن کی پردہ کشائی کا "جنون" انہیں حیران و سرگرداں رکھے۔ کوئی زور و غواض نہیں جن کی کتنہ و حقیقت سے آگہی کا تقاضا ان پر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر دے۔ لیکن کیا انسان کی بھی یہی کیفیت ہے؟ کیا اس کے دائر حیات بھی محض کھانے پینے اور سو رہنے تک محدود ہیں؟ اس کا جواب؟ نظر جھکائیے اور اپنے دل سے پوچھئے اور نگاہ اٹھائیے، تو انسانیت کی تاریخ لے قرآن کریم اس بیچ زندگی کو کفر و شرف انسانیت سے انکار کی زندگی قرار دیتا ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ (۱۲۱)

کفر کی زندگی بسر کرنے والوں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ (حفاظتِ دنیوی سے) متمتع ہوتے ہیں اور حیوانات کی طرح کھاتے پیتے (اور سوہتے) ہیں

سے دریافت کیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ عالمِ نفس و آفاق اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی زندگی کا ایک حصہ اسی طرح طبعی قوانین کے تابع ہے جس طرح حیوانات کا۔ اس سطح تک انسان کی زندگی حیوان کی سطح کی زندگی ہے۔ لیکن (جیسا کہ انسان کے عنوان میں لکھا جا چکا ہے) انسان کی زندگی حیوانی سطح پر ہی نہیں، اس سے بلند بھی ہے۔ یہ سطح، انسانی زندگی کی سطح ہے۔ حیوانی سطح تک تو اس کے سامنے بھی کوئی ”سوال“ نہیں ہوتا۔ لیکن جو یہی یہ حیوانی سطح سے ابھر کر انسانی زندگی میں پہنچتا ہے، اس کی دنیا میں ایک حیرت انگیز انقلاب واقع ہو جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کی تسکین محض ”آم کھانے“ سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے بعد یہ ”ہیڑ گننے“ کی بھی کوشش کرتا ہے۔ ”کیا ہے؟“ ”کیوں ہے؟“ کیسے ہے؟“ اور ”کیسے ہونا چاہیے؟“ کے معنی رہ رہ کر اس کے دل میں کھٹک پیدا کرتے ہیں۔ قصہ آدم پر ایک بار پھر نگاہ ڈالئے۔ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی۔ اس کی ابتدائی زندگی جو ہنوز غلشِ تجسس سے لذت آشناء ہوئی تھی اتنی ہی تھی کہ ”وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْنَئِذَا شِئْتُمَا“ (۲/۳۵) اور ہم نے کہا کہ اے آدم! تو اور تیری بیوی اس جنت میں رہو اور اس میں جہاں سے چاہو جی بھر کر کھاؤ پیو، گویا اس عہدِ طفولیت میں زندگی کے تقاضے خورد و نوش سے آگے کچھ نہ تھے۔ یہ آدم کے آب و گل کا زمانہ تھا۔ یہ محض گندھا ہوا خمیر تھا جو بنو زانی پیکر میں مشعل نہیں ہوا تھا۔ یہ اس کی آرزوؤں کا بچپن تھا، نہ دل میں کوئی کانا تھا، نہ اس کا سننے کی کھٹک۔ نہ درد تھا، نہ درد کی کسک۔ لیکن ”عہدِ شباب“ میں پہنچ کر بچپن کے کھلونے کس طرح جی پہلا سکتے تھے؟ اب تقاضوں کی دنیا زالی تھی۔ آرزوؤں کا عالم جدا گانہ تھا۔ اب رہ رہ کر جی چاہتا تھا کہ عروسِ حقیقت بے نقاب سامنے آجائے تاکہ حسنِ اپنی انتہائی بے ایکوں اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ ریز ہو۔ آپ نوعِ انسانی کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ ہر زمانہ اور ہر ملک میں انسان کسی لاینحل مسئلہ کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دے گا۔ رموزِ فطرت کی عقدہ کشائیوں میں اُس کے ذہن کی تنگ و تازہ امورِ عالم کے سمجھنے اور سلجھانے میں اس کے فکر کی جدوجہد ہر شے میں غور و تدبیر ہر چیز میں تفکر و تلمیض۔ گاہ اپنے ماحول سے جنگ و پیکار۔ گاہ ستاروں کی دنیا سے چشمک و ستیز کبھی ان سے بھی آگے فضا کی لامحدود پہنائیوں میں کھوجانے کی آرزو۔ کبھی خود اپنے دل کی دنیا میں کسی نامعلوم مدعا کے حصول کی تڑپ۔ غرضیکہ جہاں فکر و نظر میں اس کا جہدِ مسلسل اور تب و تاب ہم

اس غلش و کاوش کا آئینہ دار ہے جو کسی ”سوال“ کے حل کے لئے اس کے دل و دماغ کی دنیا
وہ سوال کیا ہے؟ | میں حشر برپا کئے ہوئے ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ سوال کیا ہے؟ تفصیل اس
 اجمال کی طویل ہے لیکن اصل حقیقت تک راہنمائی کے لئے قصۂ آدم

کے ایک اور لطیف گوشے کی طرف نگاہ اٹھائیے۔ آپ نے غور کیا ہے کہ ابلیس نے کیا کہہ کر آدم کو غلابا
 تھا؟ اُس نے اس کے کان میں کیا سحر پھونکا تھا کہ یہ سب کچھ بھول بھلا کر اس کے پیچھے ہو لیا؟ ظاہر ہے
 کہ وہ کوئی ایسی ہی بات ہوگی جو اس کے دل کی گہرائیوں میں چل رہی ہوگی جو اس کی آنکھوں میں
 انتہائے شوق بن کر آتی اور حسرت بن کر لوٹ جاتی ہوگی! ابلیس نے اس کے اسی و فوری شوق و اضطراب
 کو بھانپ کر اس کے اس کمزور پہلو سے فائدہ اٹھایا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ دیا کہ آدم جس چیز کی
 تلاش میں ہو تمہیں اس کا سراغ بتاؤں۔

انسان کی آرزو کیا تھی؟ ابلیس نے کیا کہہ کر اسے اپنے پیچھے لگا لیا تھا؟ قرآن کریم نے اسے دو لفظوں
 میں بیان کر دیا ہے۔ سورۃ ظہ میں ہے۔

قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ (۱۱/۲۰)

(ابلیس نے کہا) اے آدم! کیا میں تجھے ہمیشگی کے درخت کا پتہ نشان دوں اور ایک

ایسی بادشاہت کا جو فنا پذیر نہ ہو۔

غور فرمایا آپ نے کہ قلب انسانی کی یہ آرزو کیا تھی؟ بقائے دوام اور حیات جاوداں! انسان ہمیشہ
 زندہ رہنا چاہتا ہے۔ حیات جاوید کی خواہش اس کے دل کی گہرائیوں میں ہے۔ یہی ہے وہ سوال
 جو روزِ اول سے اس کے سامنے ہے۔ یہی ہے وہ معتمہ جس کے حل کی تلاش نے اسے یوں نعل
 بر آتش بنا رکھا ہے۔

ابلیس کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ عقل بے ہاک کا منظر ہے اس کے دعوے انکار کا مدار
 اس منطقی توجیہ پر تھا کہ اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَ خَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ (۱۱/۲۱)
 ”میں آدم سے بہتر ہوں مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے“ اس لئے میں اسے سجدہ
 کیوں کروں؟ اور اپنے اس منطقی استدلال کو ایسا حرفِ آخر سمجھ لیا کہ جس نے اسے آگ سے اور
 اُسے مٹی سے پیدا کیا تھا اپنے استدلال کے مقابل میں اُس کی حکمت کی بھی کوئی حیثیت نہ سمجھی۔ اسی کا

نام عقل بے باک ہے۔

انسان کے دل میں حیات جاوید اور بقائے دوام کی خواہش بجا اور درست۔ لیکن اس کے حصول کا جو ذریعہ عقل بے باک نے بتایا وہ یکسر غلط اور گمراہ کن تھا اور اس کا نتیجہ بہبوط و تنزل۔ اس نے جو کچھ بتایا تھا قرآن کریم نے ایک لفظ میں اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ فَبَدَأْتُ لَهُمُ الْاَنْهَمًا (۲۰/۱۲۱)۔ یعنی اس سے انسان کا جنسی شعور بیدار ہو گیا۔ ابلیس نے اس کے کان میں یہ سحر پھونکا کہ حیات جاوید افزائش نسل کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔ مرنے والا باپ اپنی زندگی کا تسلسل اپنے بیٹے کے آئینہ حیات میں دیکھتا ہے وہ خوش خوش مرتا ہے کہ میرا اور میرے خاندان کا نام دنیا میں باقی ہے۔ میرا چراغ روشن ہے۔ میرے شجر زندگی کی شاخ آگے بڑھ رہی ہے۔ اس سے اسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ میں ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ وہ اس سے حیات جاوید کی خواہش کی تسکین حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ ابلیس کا فریب ہے، یہ عقل بے باک کا دھوکا ہے۔ اسے حیات جاوید سمجھنا بہبوط و تنزل ہے۔ اگر یہی حیات جاوید ہے تو یہ حیوانات کی ہر اس نوع کو حاصل ہے جس نے ناموافق مادی حالات کا مقابلہ کر کے اپنی نسل کو آگے بڑھانے کی صلاحیت پیدا کر لی (تفصیل انسان کے عنوان میں گزر چکی ہے) گائے، بھینس، بھیر، بکری، اونٹ، گھوڑا، اس دنیا میں شہید انسان سے بھی پہلے سے موجود ہیں اور ان کی نسل برابر آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ اس قسم کی حیات جاوید کا تو مطلب یہ ہے کہ انسان اور حیوان میں کچھ فرق ہی نہیں۔ بلکہ ایک حیثیت سے انسان درجہ حیوانات سے بھی گر جاتا ہے کیونکہ افزائش نسل سے یہ خود اپنے دشمن پیدا کرتا جاتا ہے۔ ایک فرد دوسرے فرد کی جان کا لاگو۔ ایک قوم دوسری قوم کے مٹانے کی فکر میں بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۲۶)۔ مختلف افراد میں ایسی (WEDGES) ٹھک جاتی ہیں۔ (عدو کے یہی معنی ہیں) جن سے ایک فرد دوسرے فرد سے الگ ہو جاتا ہے جس سے انسان کی عالمگیر برادری ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔ علاوہ بریں نسل کے ذریعے حیات جاوید کے تصور کا مفہوم یہ ہے کہ انسان حیوانی ارتقاء کے میکانیکی عمل ہی کی ایک کڑی ہے اور اس کی زندگی فقط طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے لہذا اس کے سامنے مسئلہ

۱۔ تفصیل ان امور کی قصہ آدم میں گزر چکی ہے۔

صرف اس قدر ہے کہ طبعی حوائج و ضروریات کو کس طرح پورا کیا جائے اور اس میں دیگر افراد و اقوام سے کس طرح مبالغت و منافست حاصل کی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ عالم طبیعیات سے متعلق ہے اس لئے اس کا حل بھی علم محسوسات (یعنی دنیائے عقل) کے دائرہ کے اندر ہے۔ لہذا انسانی مسئلہ کو صرف اسی قدر ماننے والے نہ انسانی زندگی کو طبعی زندگی سے زیادہ کچھ مانتے ہیں اور نہ اس کے لئے عقل انسانی کے علاوہ کسی اور روشنی کی راہنمائی کی ضرورت کے قائل ہیں۔ آج کی اصطلاح میں اس روش فکر و اسلوب حیات کا نام مادہ پرستی سمجھ لیجئے۔ اس کے برعکس خالق کائنات نے بتایا کہ یہ تصور غلط ہے انسان کو جو فنا ہو جانے کا خوف اور مٹ جانے کا غم ستا رہا ہے اس کا علاج علم محسوسات (عقل) کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہ انسان، طبیعیات و محسوسات کے ماوراء کچھ اور رکھتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ راز حیات سے آگاہ ہو۔ یہ حقیقت کا ادراک کر کے۔ یہ اس عظیم کو سمجھ لے کہ زندگی اپنے طول و عرض دونوں میں ایک غیر منقطع وحدت (INDIVISIBLE UNIT) ہے۔ طول میں اس طرح کہ زندگی کی جوئے رواں مرنے کے بعد بھی مسلسل جاری رہتی ہے۔ اور عرض میں اس طرح کہ تمام نوع انسانی کی تخلیق اور نشو و نما ایک فرد و واحد کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن ان امور کا پالینا عقل انسانی کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے ایک خارجی روشنی کی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح آنکھ کے لئے سورج کی روشنی کی۔ ظاہر ہے کہ یہ بیچ فکر اس انداز نگاہ سے بالکل مختلف ہے جو زندگی کو محض حیوانی سطح پر دیکھتی ہے۔ یہ دونوں اسالیب فکر دو الگ الگ بنیادیں ہیں جن پر دو مختلف تہذیبوں کی عمارت اٹھتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی نظام فکر و تمدن پر غور کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس اساس و بنیاد کو دیکھا جائے جس پر وہ نظام قائم ہے جو نظام انسان کی طبعی زندگی ہی کو منتہی و مقصود سمجھے، اُس کے نتائج عالم طبیعیات میں کتنے ہی درخشندہ و تابناک کیوں نہ ہوں اس گروہ کے لئے کبھی وجہ اطمینان نہیں ہو سکتا جو انسان کو اس کے طبعی پیکر سے کچھ ماوراء بھی سمجھتا ہے۔ اور جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی طبعی اور ماوراء طبعی دونوں زندگیوں میں بلند و شاداب ہونی چاہئیں۔

سوال ہمارے سامنے یہ ہے کہ کیا انسان محض پیکر آب و گل ہی کا نام ہے یا اس سے ماوراء کچھ اور بھی ہے! اور کیا راز حیات و ادراک حقیقت (یعنی انسان کا اپنی اور کائنات کی

حقیقت کو سمجھ لینا) تنہا عقل انسانی کے لئے ممکن ہے۔ آئندہ صفحات میں اسی اجمال کی تفصیل اور اسی سوال کا حل پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ [آئندہ صفحات میں "رازِ حیات" اور "ادراکِ حقیقت" کی اصطلاحات اسی مفہوم کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔]

علمُ الاشیاء | انسان کے شرف و مجد کا راز علم میں ہے۔ لہذا علم ہی وہ ذریعہ ہو سکتا ہے جس سے اسے حقیقت کی آگہی حاصل ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسا علم ہے جس سے یہ امکان واقعہ کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ علم کی دنیا پر نگاہ ڈالنے تو سب سے پہلے ہمارے سامنے محسوسات کا علم آتا ہے۔ یہی وہ علم ہے جسے قصہ آدم میں "عِلْمُ الْأَسْمَاءِ" سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ ذرا آگے چل کر معلوم ہوگا "اسماء" کا لفظ ایسا جامع ہے کہ محسوسات و تصورات کی پوری دنیا اس کے اندر سمٹ کر آجاتی ہے۔ محسوسات کی دنیا میں کسی شے کا علم ممکن نہیں جب تک اس کا تصور آپ کے ذہن میں نہ آجائے اور کسی چیز کا تصور ممکن نہیں جب تک اس کا نام نہ رکھ دیا جائے

اس لئے علم الاسماء یا علم الاشیاء و حقیقت تصوراتی علم (CONCEPTUAL KNOWLEDGE) ہے۔ اس علم سے انسان کائنات کے محسوس دمرئی پہلو کے متعلق آگہی حاصل کر سکتا ہے۔ لہذا اس علم کی دنیا، انسانی حواس (SENSES) کے دائرہ تک محدود ہے۔ یعنی انسانی حواس (SENSES)

اسے جو معلومات (DATA) ہم پہنچاتی ہیں ان سے اسے اشیائے کائنات کا محسوس علم (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) حاصل ہوتا ہے۔ اور اس کا ذہن اس محسوس علم کے

مختلف گوشوں میں باہمی امتزاج سے جو تصورات قائم کرتا ہے انہیں (CONCEPTUAL KNOWLEDGE) کہا جاتا ہے۔ انسان کے لئے یہ علم بھی کچھ کم شرف و مزیت کا موجب نہیں۔ دنیائے طبیعیات (PHYSICAL WORLD) کی تسخیر اسی علم کی بنا پر ہے۔ انسان کو غاروں سے نکال کر آسمان کی دھنوں میں اذنِ بال کشائی اسی علم نے عطا کیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کو صرف حواس ہی نہیں دیئے گئے بلکہ ان کے ساتھ قوتِ فکر و تمیز (INTELLECT) بھی ودیعت کی گئی ہے۔

لئے اسے (MIND) بھی کہا جاسکتا ہے۔

قوتِ عقل کا فریضہ تنقید ہے۔ یعنی اس کی خبر رساں ایجنسیاں جو معلومات بہم پہنچاتی ہیں عقل ان پر تنقید
عقل انسانی کر کے استدلال کے ذریعے اپنے حدود کے اندر صحیح اور غلط کا موازنہ کرتی ہے۔ آنکھ دکھاتی ہے کہ چاند میں آدمی بیٹھا ہے۔ عقل اس ”خبر“ پر تنقید کرتی

ہے اور استدلال کے ذریعہ اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ اس میں آدمی نہیں ہو سکتا۔ یہ فریب نگاہ ہے۔
 یا ہم دُور سے دھواں اٹھتا دیکھتے ہیں، تو عقل فیصلہ کر دیتی ہے کہ نیچے آگ ہے۔ اس طرح عقل انسانی
 جزئیات سے استنباطِ نتائج کے بعد کلیات یا علت (CAUSE) سے معلول (EFFECT)

تک پہنچتی ہے۔ علم اور اس کے ساتھ عقل کی قوتِ تنقید انسان کی ماہِ الا تمیاز خصوصیت ہے۔ تجارب و
 مشاہدات سے اصول متعین کرنا، ان اصولوں کی روشنی میں اشیائے کائنات سے کام لینا اور پھر
 ان سب کے ماحصل کو آگے منتقل کرنا اسی قوت کے بل بوتے پر ہے۔ انسان کے پاس اپنے اسلاف
 کا جس قدر سرمایہ ہے وہ اسی قوت کی بدولت جمع ہوا۔ اسی کی وجہ سے محفوظ ہے اور اسی کے ذریعے
 آگے منتقل ہوتا ہے۔ اس کے تمدن و عمرانیت کی متاعِ گراں بہا، قوتِ عقل و فکر کی بنا پر روز بروز بڑھتی
 چلی جا رہی ہے۔ فلسفہ، کلام، تاریخ، طبقات الارض، ہیئت، فلکیات، حیاتیات، طبیعیات،
 ماوراء الطبیعیات، علم النفس، معاشیات، سیاست، تدبیر منازل، غرضیکہ دنیائے محسوسات کے
 قدیم و جدید علوم و فنون، عقل و بصیرت، فہم و فراست، دانش و بینش، تدبیر و تفکر اور شعور و ادراک ہی
 کے کرشمے ہیں۔ اس لئے قوتِ عقل کی عظمت سے کسے انکار ہو سکتا ہے؛ لیکن عقل کی اس عظمت و

کیا عقل ادراکِ حقیقت کر سکتی ہے؟ | تفوق کے باوجود سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

جس کی طرف شرف میں اشارہ کیا گیا ہے اور جو ہماری اس بحث کا نقطہٴ ماسکہ اور مرکزِ ثقل ہے؛ کیا وہ
 اس سوال کا حل پیش کر سکتی ہے جس نے قلبِ انسان کو طلسمِ تہج و تاب بنائے رکھا ہے؟

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ عقل (یا علم استدلالی) کا دائرہ عالم محسوسات ہے۔ لہذا سب سے
 پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ دنیائے طبیعیات (PHYSICAL WORLD) میں جو محسوسات کی دنیا کا
 دوسرا نام ہے عقلی اکتشافات کی کیا کیفیت ہے؛ کیا اس دائرہ میں انسانی تحقیقات اشیاء کی حقیقت
 کا علم حاصل کر سکی ہیں؛ طبیعیات کی دنیا، مادہ (MATTER) سے متعلق ہے۔ انیسویں صدی عیسوی

کے اخیر تک سائنسدانوں کی دنیا میں عام طور پر سمجھا یہ جاتا تھا کہ یہ کائنات فضا کی پینائیوں (SPACE) میں ایک بے جان ڈسے کی طرح پڑی ہے اور چند قوانین کی رُو سے جنہیں "اندھی فطرت" برٹے کار لاتی ہے اس میں میکائیکی عمل جاری و ساری ہے۔ کل تک یہ تحقیق سائنس کے مسلمات میں سمجھی جاتی تھی۔ کائنات کے متعلق اس میکائیکی تصور (MECHANISTIC CONCEPT OF UNIVERSE) کا اثر یورپ کی تمام دنیا نے فکر پر چھار ہا تھا۔ جس کا نتیجہ وہ تمدن ہے جو آج یورپ اور اس کے ساتھ باقی دنیا کو جہنم کے عیش و مہیب گڑھوں کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہا ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے شروع سے یورپ کی دنیا نے سائنس میں ایک عظیم انقلاب کے آثار اُبھرنے شروع ہوئے جس نے چند ہی سال کے عرصہ میں مادیت (MATERIALISM) اور کائنات کے میکائیکی تصور کی بنیادوں میں تزلزل پیدا کر دیا۔ سب سے پہلے تحقیقات کا رخ اس طرف مڑا کہ جس چیز کو ہم ٹھوس اور جامد (SOLID AND INETR) مادہ کہتے ہیں۔ وہ نہ ٹھوس ہے نہ جامد اور نہ ہی (اپنے اصطلاحی معنوں میں) مادہ۔ بلکہ وہ برقیات (ELECTRONES) کا مجموعہ ہے جو ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ برق (ELECTRICITY) توانائی (ENERGY) کے سوا اور کچھ نہیں۔ مادہ کے متعلق اب تحقیق یہ ہے کہ

مادہ کیا ہے؟ | تمام مادہ توانائی ہی کی ایک شکل ہے۔ درحقیقت کسی شے میں آخر کار انجماد (SOLIDITY) اور مادیت کا تصور ہی

غلط ہے جو کچھ موجود ہے محض توانائی ہے۔

(OUTLINES OF MAN'S KNOWLEDGE, P.192)

اس نظریہ کی رُو سے مادہ کی دنیا درحقیقت "غیر مادی" دنیا قرار پا جاتی ہے۔ توانائی مادہ کی تعریف

لہ ہم برق (ELECTRICITY) کا تصور صرف برقی ہونی اشیاء (ELECTRIFIED OBJECTS) سے کر سکتے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ برقی ہونی اشیاء اور ہیں اور خود برق اور برقیات (ELECTRONES) برقی ہونی اشیاء (ELECTRIFIED OBJECTS) نہیں بلکہ برق کی مثبت (POSITIVE) اور منفی (NEGATIVE) قوتوں کا کرشمہ ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے مجرد برق کا تصور ممکن نہیں۔

(DEFINITION) میں آتی ہی نہیں۔ اس لئے اب کائنات کی اصل مادہ نہیں بلکہ ماورائے مادہ سمجھی جاتی ہے۔ یہی چیز ہے جس کے متعلق (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) سرجیمس جینز نے اپنی کتاب (THE MYSTERIOUS UNIVERSE) میں کہا ہے کہ کائنات "ذریعہ کی سر بہر لہریں ہیں" لیکن اس سے بھی آگے بڑھتے تو حکیم آئن سٹائن (EINSTEIN) کے نظریہ اضافیت (RELATIVITY) نے اس تصور میں مزید انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس کا نظریہ زمان و مکان (THEORY OF TIME AND SPACE) ایک بے حد دقیق فنی مسئلہ ہے لیکن اس نظریہ کی رُو سے قائم شدہ تصور کے متعلق رسل (RUSSELL) کے الفاظ میں اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ

نظریہ اضافیت نے زمان کو "زمان — مکان" میں سمو کر ادیت کے روایتی تصور کو فلامغول کے دلائل سے کہیں زیادہ مجروح کیا ہے۔ عقل عامہ کے نزدیک مادہ وہ ہے جو زمان میں قائم اور مکان میں گردش کرتا ہے۔ لیکن اضافیت کے قائل (عالم) طبیعیات کے نزدیک یہ تصور اباطل ہے۔ اب مادہ کا ٹکڑا، مختلف خصوصیات کا حامل، ٹھوس ٹکڑا نہیں رہا بلکہ باہمی مربوط حوادث کا مجموعہ قرار پا گیا ہے۔

(RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM)

یعنی حکیم آئن سٹائن کی تحقیق کی رُو سے مادہ کوئی ایسی شے نہیں جو ٹھوس اور جامد وجود رکھتی ہو بلکہ وہ چند مربوط حوادث (INTER-RELATED EVENTS) یا خیالاتِ منجمد (CONDENSED THOUGHTS) کا مجموعہ ہے جس کی اصل حرکت یا توانائی ہے۔ لہذا

طبعی سائنس نے اب تمام اشیاء کو حرکت (MOVEMENT) میں تبدیل کر دیا ہے..... کائنات جو ہمیں اشیاء کا مجموعہ نظر آتی ہے ایک ٹھوس شے نہیں جو فضا میں بڑی ہے۔ یہ شے (THING) ہے ہی نہیں بلکہ عمل (ACT) ہے یا حوادث

لے یہ کتاب علامہ اقبالؒ کے مشہور لیکچرز کا مجموعہ ہے۔ آئندہ اوراق میں جہاں جہاں اس کتاب کے حوالہ کی ضرورت ہوگی اختصار کی خاطر ہم اسے صرف "خطبات" کہہ کر پکاریں گے۔

(خطبات ۱ صفحہ ۴۹-۵۳)

(EVENTS) کی عمارت۔

اندازہ فرمائیے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں عالم طبیعیات میں کائنات کی اساس و بنیاد کے متعلق کس قدر عظیم الشان تبدیلی واقع ہو چکی ہے۔ یہ وہ تبدیلی ہے جس سے سائنس کو اپنی کوتاہیوں کا خود اعتراف ہو گیا ہے۔

(BELIEF NAD ACTION, BY VISCOUNT SAMUEL; P-39)

کائنات کا تصور | اور اس کی وجہ سے اب مادیت کے بجائے "کائنات کا روحانی تصور" انسب قرار پا گیا ہے۔ (ایضاً ص ۴۱)۔ لہذا وہی سائنس جو انیسویں صدی کے اخیر تک کائنات کے میکاکی تصور سے یورپ کی دنیا کو خالص مادیت کی طرف لے جا رہی تھی، اب اپنی ہی تحقیقات کی رُو سے ماوراء المادیت (یعنی کائنات کے "روحانی تصور") کی طرف لے آ رہی ہے۔ سچ ہے۔ بقول بیکن :-

فلسفہ کا تصور اس علم انسان کو دہریہ بنا دیتا ہے۔ لیکن اس کی گہرائیوں میں اُتر کر

انسان (یکسر) مذہب پرست بن کر نکلتا ہے۔ (SAMUEL; P-41)

اب تحقیق کے ایک دوسرے رُخ کی طرف آئیے۔ مشہور فلاسفر برکلی (BERKELEY) کا نظریہ تھا کہ جن چیزوں کا علم ہمیں حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے ان کا وجود خارج میں نہیں ہوتا۔ وہ ہمارے ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک پھول آپ کو سُرخ نظر آ رہا ہے۔ تو اس کی یہ سُرخی پھول کے اندر موجود نہیں ہوتی، بلکہ روشنی کی لہریں دیکھنے والے کے دماغ پر ایسا اثر مرتب کرتی ہیں جس سے اسے سُرخ رنگت کا احساس ہوتا ہے (ہمارے زمانہ میں پروفیسر WHITE HEAD نے اس نظریہ کو مزید دلائل سے مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے) اس سے ظاہر ہے کہ حواس کے ذریعے اشیاء کا جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے وہ درحقیقت "فریب نگاہ" ہے۔ اس حسین فریب کے متعلق پروفیسر (EDDINGTON)

لے اس کتاب سے ماخوذ اکثر اقتباسات آئندہ اوراق میں ملیں گے جہاں اس کتاب کا ذکر صرف SAMUEL کے نام سے کیا جائے گا۔

نے اپنے مختصر لیکن نہایت جامع لیکچر (SCIENCE AND THE UN-SEEN WORLD) میں بڑے دل کش انداز میں بحث کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہم سب اس فریب میں مبتلا ہیں کہ نفس انسان کی گہرائیوں تک پہنچنا تو خیر ناممکن ہے لیکن مادہ کی حقیقت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ مادہ کی حقیقت کا علم ہمیں کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ یہی ہوتا ہے کہ مادی شے سے کوئی اثر (INFLUENCE) باہر آتا ہے اور ہمارے نظام عصبی کے کسی انتہائی حقیقتِ اشیاء کنارے سے ٹکراتا ہے اس سے ہمارے اندر کچھ طبیعیاتی اور کیمیائی

(PHYSICAL AND CHEMICAL) تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں جو اعصاب کے تاروں سے دماغ تک پہنچتی ہیں۔ وہاں پہنچنے پر ایک معمہ (MYSTERY) ظہور میں آتا ہے۔ یعنی انسان کے دل (MIND) میں ایک خیالی تصویر (IMAGE) یا سنی کی کیفیت (SENSATION) پیدا ہوتی ہے جو اس تحریک یا ہیجان سے مختلف ہوتی ہے جو اعصاب میں ہوئی تھی۔ یعنی اعصاب نے اس شے کا اثر کچھ اور لیا تھا اور دل میں اس کا اثر کچھ اور پیدا ہوا۔ اس اثر سے جو نتیجہ حاصل کیا جاتا ہے وہی اس شے کا علم کہلاتا ہے۔ اس علم کے متعلق جو جی میں آئے کہتے۔ لیکن اتنا تو بدیہی ہے کہ یہ علم بہر حال شے سے متعلقہ کی اصل حقیقت کا علم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اس شے کی اصل حقیقت اعصاب کے تاروں کے ذریعے ذہن انسانی تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ اعصاب کے ذریعے صرف وہ اثرات منتقل ہوتے ہیں جو انہوں نے اخذ کئے تھے۔ ان اثرات سے ہم ایک نتیجہ مستنبط کر لیتے ہیں۔ لہذا یہ استنباطی یا استخراجی علم (INFERRED KNOWLEDGE) مادہ کے پیکر کا عکس ہوتا ہے نہ کہ اس کی حقیقت۔ یہی وجہ ہے کہ مادی اشیاء سے متعلقہ علم کو محض رموز و اشارات (SYMBOLS) کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اشارات اسی صورت میں استعمال کئے جاتے ہیں جب کسی شے کی حقیقت کا علم نہ ہو جیسے الجبر میں (x) کی علامت ایک نامعلوم مقدار (UN-KNOWN QUANTITY) کی قائم مقام ہوتی ہے۔ ذہن انسانی ان اشارات کو اخذ کرتا رہتا ہے۔ ایک ہی قسم کے اشارات کو بار بار اخذ کرنے سے ان سے مرثب شدہ عکس پختہ ہو جاتا ہے لیکن اس عکس کو اصل شے کی حقیقت

لے ترجمہ کے بجائے مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ لہذا ان اشارات سے ہم حقیقت کا علم نہیں حاصل کر سکتے جس طرح مخطہ نشر الصوت (BROADCASTING STATION) سے نشر شدہ آوازوں سے ہم براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کی حقیقت کا علم حاصل نہیں کر سکتے۔ آج آپ اگر کسی عالم طبیعیات سے پوچھیں کہ اس نے ایٹھر (ETHER) یا برقیہ (ELECTRON) کے متعلق بالآخر کیا تحقیق کیا ہے تو اس کا جواب ایسا نہیں ہو گا جیسے کسی میز یا کرسی کے متعلق کچھ بتا دیا جائے بلکہ وہ چند اشارات (SYMBOLS) اور ریاضی کی چند مساوات (EQUATIONS) گنا دے گا۔ اب اگر اس سے پوچھا جائے کہ یہ اشارات کیا بلا ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ملے گا کہ علم طبیعیات کو اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس علم کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس سے یہ اشارات کے نیچے اصل حقیقت کی گہرائی تک اُتر سکے۔ دنیا سے طبیعیات کے متعلق ان اشارات اور مساوات ہی کا علم حاصل ہو سکتا ہے نہ کہ اس فطرت کا جس کے مظہر یہ اشارات ہیں۔“

(SCIENCE AND THE UN-SEEN WORLD; CHAPTER-III)

ان تصریحات کو سامنے رکھتے اور پھر سوچتے کہ عقل (علم استدلالی) کے ذریعے (غیر مرمی و غیر محسوس دنیا تو ایک طرف) خود محسوسات کی دنیا میں حقیقت کا علم کس قدر حاصل ہو سکتا ہے اور سائنس اپنے نتائج مستخرجہ کے متعلق حتمی اور یقینی طور پر کیا کہہ سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ خود یورپ کے جلیل القدر محققین اب رفتہ رفتہ اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ علم محسوسات کے ذریعہ ادراک حقیقت ممکن نہیں۔ سر جیمس جینز کائنات کے مسئلہ پر نہایت عالمانہ بحث کرنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ

جو کچھ کہا گیا ہے اور جو نتائج تجربہ و پیش کش کئے گئے ہیں سچ تو یہ ہے کہ وہ تمام محض قیاسی اور غیر یقینی ہیں۔ ہم نے اس مسئلہ پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیا عہد حاضر کی سائنس ان مشکل مسائل کے متعلق جو ہمیشہ کے لئے ماورائے سرحد ادراک رکھے گئے ہیں کچھ کہہ سکتی ہے؟

ہم زیادہ سے زیادہ روشنی کی ایک مدھم کرن دیکھ پاتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہم کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ کرن بھی فریب نگاہ ہی ہو اس لئے کہ

اس باب میں ہمیں کچھ دیکھنے کے لئے اپنی آنکھوں پر بہت بوجھ ڈالنا پڑا ہے۔ سو آج یہ دعوے قطعاً نہیں ہو سکتا کہ دورِ حاضرہ کی سائنس کوئی (یقینی) اعلان کر سکتی ہے بلکہ انب یہ ہے کہ سائنس کو چاہیے کہ اس قسم کے اعلان کرنا چھوڑ دے۔ علم کے دریا کا رخ اکثر اوقات پیچھے طرف مڑتے بھی دیکھا گیا ہے۔

(THE MYSTERIOUS UNIVERSE)

ریڈنگ یونیورسٹی کا طبیعیات کا پروفیسر ڈاکٹر جیمس آر نلڈ کر دتھر لکھتا ہے :

نظامِ فطرت اپنی گہری بنیادی سادگی میں اس قدر تجرّانگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں

(THE GREAT DESIGN P: -52)

کسی موضوع پر حرفِ آخر آخری آنسان کے لئے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ اسی کتاب میں علمِ الافلاک کا ماہر کیلیفورنیا کی رصد گاہ کا ڈائریکٹر ڈاکٹر ایٹکن، ستاروں کی دنیا کی کرشمہ سازیوں سے متجّر ہو کر لکھتا ہے۔

”کائنات کی ابتدا اور اس کی انتہا کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔“ (ایضاً ص ۲۵)

سرفرائس ینگ ہسبنڈ اپنے مقالہ میں لکھتا ہے۔

ہم سائنس سے جو کچھ معلوم کر سکتے ہیں وہ اتنا ہی ہے کہ علم کا سمندر بے کنار ہے۔ ہم ہی معلوم کر سکتے ہیں کہ ہم فطرت کے متعلق کبھی بھی سب کچھ نہیں جان سکتے۔ (صفحہ ۲۵۴)

یہ تو تھے علمائے طبیعیات، اب ایک عالمِ تاریخ کی زبان سے سنئے۔ پروفیسر (ALFRED COBBAN) نے (۱۹۴۲ء میں) تہذیبِ مغرب کی شکست درخنت پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں اس نے ان تمام عناصر سے بحث کی تھی جو اس تہذیب کے اجزاء ہیں اور اس کے بعد بتایا تھا کہ اس تہذیب کی تعمیر میں کس طرح خرابی کی صورت مضمحل تھی۔ دنیائے سائنس پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے۔

ہم کبھی یہ تصور نہیں کر سکتے کہ (اور تو اور) سائنس کی محدود دنیا میں بھی قطعی حقیقت کا ادراک کر لیا گیا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا جب تک اس تمام محسوس کائنات کا علم حاصل نہ ہو جائے۔

(THE CRISIS OF CIVILISATION, PP 94-95)

عقل (REASON) کے متعلق پروفیسر صاحب کا بیان یہ ہے کہ

گذشتہ کچھ عرصہ سے عقل (REASON) کچھ ایسی راندہ درگاہ ہوئی ہے کہ اب اسے چند فریب خوردہ مادہ اور طبیعی لوگوں کی متروک تہمت پرستی خیال کیا جاتا ہے۔ (ایضاً ص ۱۲)

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

عہد حاضر کا سب سے بڑا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ اب چاروں طرف سے عقل اور عقل پرستی پر حملے ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ سائنس نے خود عقل کے قلعہ پر دھاوا بول دیا ہے۔ جدید ریاضیات کے انکشاف نے کائنات کے معما کو پھر سے اجاگر کر دیا ہے..... علاوہ بریں علم النفس کے ماہرین نے دنیا کے علم میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا جس کی رو سے عقل کو اب نفس انسانی کی کائنات میں وحید تو ایک طرف، کوئی ممتاز مقام بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ قانون عقل پر سب سے آخری اور کاری ضرب علم تصورات (IDEOLOGY) کے تجزیہ نے لگائی ہے جیسا کہ ڈاکٹر (KARL MANNHEIM) نے ثابت کیا ہے، مفکرین دور حاضرہ اب رفتہ رفتہ اس حقیقت سے آشنا ہو رہے ہیں کہ تصورات (IDEAS) کو اس معاشرتی اور تاریخی پس منظر سے کبھی الگ نہیں کیا جاسکتا جن میں وہ موجود ہیں۔ (ایضاً ص ۱۳)

یہ ہے اس عقل کی حقیقت جس کی ابھی چار دن پہلے یورپ میں پرستش ہو رہی تھی جس سے مرعوب ہو کر مشرق کا ذہنی غلام کسی ماوراء عقل نظریہ کو ارباب دانش و بینش کے سامنے پیش کر لے دیا اس پر ایمان کے اظہار سے شرماتا تھا! آج انہی پرستاروں نے خود اپنے ہاتھوں اس بُت کے ٹکڑے کر دیئے ہیں لیکن ہماری غلامانہ ذہنیت کی یہ کیفیت ہے کہ ان پریشان ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے اکٹھا کرتے پھر رہے ہیں تاکہ انہیں جوڑ کر اس بُت کو پھر سے کعبہ دل میں بٹھالیں! سچ ہے:

وفاواری بشرط استواری اصل ایماں ہے

یہ ہے عقل کی محدودیت۔ لہذا جس طرح حد نگاہ سے آگے آنکھوں والا اور اندھا دونوں برابر ہوتے ہیں، سرحد عقل سے آگے عقلمند اور بے عقل، دونوں یکساں ہوتے ہیں۔



اس مقام پر اس حقیقت کا بیان کر دینا ضروری ہے کہ جو کچھ عقل (یا علم استدلالی) کے متعلق

اور پر لکھا گیا ہے اس سے عقل کی تنقیص یا تحقیر مقصود نہیں ہے۔ اس سے مفہوم صرف اتنا ہے کہ عقل کا دائرہ اپنا ہے اور ادراک حقیقت اس کے بس کی چیز نہیں۔ نیز یہ کہ دنیائے طبیعیات میں جو کچھ ابھی کل تک عین مطابق عقل سمجھا جاتا تھا آج کی عقل خود اس کی تغلیط کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن کا گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں، عقل کا مدار کئی اس علم پر ہے جو حواس کے ذریعے مرتب ہوتا ہے اور حواس اولتے بدلتے رہتے ہیں اس لئے اس بنیاد پر استوار عمارت بھی غیر تبدیل نہیں ہو سکتی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

فروغ دانش ما از قیاس است قیاس ما از تقدیر حواس است

چو جس دیگر شد ایں عالم دگر شد سکون و سیر و کیف و کم دگر شد

ہمیں سے ہم صنما اس سوال تک بھی پہنچ جاتے ہیں کہ جس چیز کو عام طور پر **خلاف عقل کا مفہوم** کہلاتا ہے اس سے مراد کیا ہوتی ہے۔

سب سے پہلے ایک فرد کی عقل کو سمجھئے۔ بچپن میں اس کی عقل کچھ اور ہے۔ جوانی کے عالم میں کچھ اور۔ ایام پختگی میں اس سے الگ اور بڑھاپے میں ان سب سے جدا۔ جس بات کو ایک شخص بچپن میں عین مطابق عقل خیال کرتا ہے، دس برس بعد ان کھلونوں پر خود ہی ہنستا ہے۔ جن نظریات زندگی کو وہ عالم شباب میں عین تقاضائے عقل خیال کرتا ہے، ذرا پختگی کو پہنچ کر ان پر خود ہی نادم ہوتا ہے۔ بڑھاپے میں پہنچ کر کیفیت ہی بدل جاتی ہے وہ ساری دنیا کو بے عقل سمجھتا ہے اور دنیا خود اس پر ہنسی ہے۔

وَمَنْ تَعَمَّرَهُ نَكَسَهُ فِي الْخَلْقِ ۖ أَفَلَا يَعْقِلُونَ ۝ (۳۶/۶۸)

جسے ہم طویل عمر دیتے ہیں اسے نگوں سار کر دیا کرتے ہیں۔ کیا یہ لوگ پھر بھی نہیں سمجھتے؟ ایک طرف زمانہ کے امیال و عواطف بدل چکے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف اس کی قوت حافظہ کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے سے جانتا ہے اسے بھی بھول چکا ہے۔

وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَكَّلُكُمْ ۖ وَمِنْكُمْ مَنْ يَرْدُ إِلَىٰ أَرْدَالِ الْعُصْرِ

لَٰكِي لَا يَعْلَمُ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ۝ (۱۶/۷۰ نیز ۲۲/۵)

اور اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر وہی ہے جو تمہاری زندگی پوری کر دیتا ہے۔ اور تم میں سے

کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو (بڑھاپے کی) نکئی عمر تک پہنچ جاتا ہے کہ (ذہن و عقل کی) سمجھ بوجھ رکھنے کے بعد پھر نادان ہو جائے۔ بیشک اللہ (سب کچھ) جاننے والا، بر بات کی قدرت رکھنے والا ہے !

ان حالات میں کہیں کہ جب کوئی شخص کسی چیز کے متعلق کہتا ہے کہ یہ خلاف عقل ہے تو اس سے کیا سمجھا جائے؟ یہ تو خلاف عقل کا سوال ہے۔ جس چیز کو وہ آج عین مطابق عقل کہتا ہے کل ہی اسے خلاف عقل کہنے لگ جائے گا۔ پھر ایک شخص کی عمر کے مختلف ادوار کو چھوڑ کر ایک ہی عمر کے مختلف افراد کو دیکھئے۔ ان کی عقلوں کا تفاوت اس قدر تین ہوتا ہے کہ جو چیز ایک شخص کے نزدیک عین مطابق عقل ہے اسے دوسرا شخص سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتا۔ پھر افراد کو چھوڑ کر زمانہ کی عقل کو لیجئے جس چیز کو ابھی پچاس برس پہلے خلاف عقل کہا جاتا تھا، وہ آج عین مطابق عقل ہے۔ اگر کسی سے بیس تیس برس ادھر کہا جاتا کہ ایک آدمی لندن کے کسی گوشے میں بات کرے تو دنیا کے کونے کونے میں بیک وقت پہنچ جاتی ہے تو وہ اُسے پاگل خانے بھجوانے کی کوشش کرتا لیکن آج یہی ”خلاف عقل“ بات ہر شخص کے مشاہدہ کی چیز ہے۔ لہذا جس چیز کو ہم آج خلاف عقل کہتے ہیں اس کی کیا دلیل ہے کہ وہ فی الواقعہ عقل کے خلاف ہے؟ خود مادہ اور دنیا کے طبیعیات کے متعلق سائنس کی تحقیقات کے اختلاف (اور وہ بھی صدیوں میں نہیں بلکہ چند سال کے عرصہ میں) گذشتہ صفحات میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ ایسے اختلاف جو فرعی اور جزعی نہیں بلکہ اصولی اور کلی ہیں۔

کہیں کہ جو چیز یوں ادلنے بدلنے والی ہو اسے ادراک حقائق کا قابل اعتماد ذریعہ کیسے قرار دیا جاسکے؟

لہذا عقل و فکر کو چھوڑ کر کسی بات کو اندھا دھند مان لینا خلاف شرف انسانیت ہے تو کسی بات سے محض اس لئے انکار کر دینا کہ وہ میری یا میرے زمانہ کی عقل کے خلاف ہے یہ بھی انتہائی حماقت اور ضد ہے۔ قرآن کریم نے سورہ یونس کی دو جلیل القدر آیات میں ان دونوں گروہوں کا ذکر نہایت دل آویز اور بصیرت افروز انداز میں فرمایا ہے۔ پہلے اس گروہ کا ذکر کیا جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتا اور محض ظن و تخمین کی اتباع کرتا ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ

الْحَقُّ سَنُتَنَّا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ ۝ (۱۰/۳۶)

اور ان لوگوں میں زیادہ تر ایسے ہی ہیں جو صرف وہم و گمان کی باتوں پر چلتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ حق کے مقابلے میں ظن و گمان کچھ کام نہیں دے سکتا۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس سے بے خبر نہیں۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو حقیقت سے محض اس لئے انکار کر دیتا ہے کہ وہ اس کی عقل کے خلاف ہے اور اس کے اپنے احاطہ علم میں نہیں آ سکتی۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ ۚ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ كَذِبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَأَنْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِيْنَ ۝ (۱۰/۳۹)

نہیں، یہ بات نہیں ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے، اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے، ٹھیک اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔ تو دیکھو ظلم کرنے والوں کا کیسا کچھ انجام ہو چکا ہے۔

غور سے دیکھئے تو ان کا رجحان خود کے جس قدر گوشے نظر آئیں گے وہ ان ہی دو کیفیتوں کے مظہر ہوں گے۔ صحیح روش یہ ہے کہ ظن و تخمین پر بھروسہ کرنے والوں کو چاہیئے کہ فکر و نظر سے کام لیں اور تنہا اپنی عقل پر بھروسہ کرنے والوں کو چاہیئے کہ عقل کی محدودیت کو بھی پیش نظر رکھیں۔



گذشتہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ سائنس (یا علم محسوسات) کی رو سے کئی حقیقت کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ (J.W.N. SULLIVAN) اپنی کتاب (LIMITATIONS OF SCIENCE) میں لکھتا ہے:

سائنس کو اب اپنے متعلق احساس ہو گیا ہے، اس لئے اب اس میں فردنی اور انکسائی بھی آگیا ہے۔ اب ہمیں یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لئے سائنس کا طریقہ ہی واحد طریقہ ہے (واحد طریقہ تو ایک طرف) اب تو دنیا کے سائنس کے مشاہیر

اس امر پر مصر ہیں اور بڑی شدت سے مُصر کہ جہاں تک ادراک حقیقت کا تعلق ہے، سائنس صرف جزوی سا علم ہم پہنچا سکتی ہے۔



دنیاۓ معاملات اور عقل | ہم دیکھ چکے ہیں کہ اور تو اور خود عالم طبیعیات میں بھی حقیقت کا ادراک عقل کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اب سائنس اور فلسفہ کی دنیا سے نیچے اُتر کر معاملات کی دنیا میں آئیے اور دیکھئے کہ کیا اس دنیا میں بھی عقل، انسانی راہ نمائی کے لئے کافی ہو سکتی ہے، ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ وہی نظام انسانی ذات کے داعیات و مقتضیات کی تسکین کر سکتا ہے جو حقیقت پر مبنی ہو۔ اور چونکہ عقل، ادراک حقیقت نہیں کر سکتی اس لئے یہ ظاہر ہے کہ عقل کی رُو سے وضع و تشکل کردہ نظام، انسانی معاملات کی دنیا میں کبھی فلاح و سعادت کے نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ اس باب میں عقل کی ناقصیت فقط اتنی ہی نہیں کہ اس کا دائرہ محدود ہے۔ بلکہ اس کی کمزوری اس سے بھی کہیں گہری ہے، ظاہر ہے کہ انسان پتھر نہیں، اس کے سینے میں جذبات کا ایک طوفان ہے جو ہر وقت متلاطم رہتا ہے۔ جذبات اور عقل کی کشمکش ایسی اور بدیہی ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ جب جذبات (مثلاً غصہ، حسد، انتقام یا دوسری طرف جذبہ محبت) انسان پر غالب آجاتے ہیں تو وہ، وہ کر بیٹھتا ہے جس پر طوفان جذبات کے فرد ہونے پر خود ہی نادم ہوتا ہے اور اتنا نقصان اٹھاتا ہے کہ بعض اوقات اس کا عمر بھر افسوس رہتا ہے حتیٰ کہ

لے یہ ہو سکتا ہے کہ سائنس کی تحقیقات اسی طرح آگے بڑھتی رہیں تو انسانی علم کم از کم دنیاۓ طبیعیات میں کسی یقینی مقام تک پہنچ جائے۔ لیکن یہ صرف حقیقت کے ایک گوشہ (ASPECT) کی جھلک ہو گی پھر اس چیز کو بھی پیش نظر رکھیے کہ یہ نہیں کہ اگر حقیقت کے مختلف پہلوؤں (ASPECTS) کو یک جا کر دیا جائے تو ان کا مجموعہ حقیقتِ کُلّی بن سکتا ہے۔ حقیقتِ کُلّی اور شے ہے اور اس کے مختلف پہلو اور۔ آپ ایک شخص کے مختلف عادات و خصائل کا علم حاصل کر لینے کے بعد یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے اس کی ذات (PERSONALITY) کا کبھی علم حاصل کر لیا ہے۔ عادات و خصائل (صفات) اس کی ذات کا پر تو ضرور ہیں۔ لیکن ان پر چھائیوں کا مجموعہ اصل ذات نہیں ہو سکتا۔

بعض مقامات پر انسان جذبات سے مغلوب ہو کر جان تک پر کھیل جاتا ہے۔ ایک بیمار جانتا ہے کہ فلاں چیز کھانے سے مرض بڑھ جائے گا۔ لیکن جاننے کے باوجود اسے کھا لیتا ہے اس کی سزا بھگتنا ہے۔ ایک شخص جانتا ہے کہ قتل کی سزا موت ہے۔ لیکن جوش انتقام میں اندھا ہو جاتا ہے اور پھانسی کے تختے پر لٹک جاتا ہے۔ یہاں تک تو ہدیہات کی حدیں تھیں جن کے اندر ہم محسوس کر لیتے ہیں کہ فلاں عمل جذبات کے ماتحت سرزد ہوا ہے اور فلاں تقاضائے عقل سے۔ لیکن قیامت تو اس سے آگے بڑھ کر شروع ہوتی ہے۔ جہاں عقل حیلہ جو، خود جذبات سے متاثر ہو کر انسان کو ناصح مشفق کے نقاب میں فریب دیتی ہے۔ اس باب میں علم تجزیہ نفس (PSYCHO ANALYSIS) نے ایک حد تک ان حقیقتوں کا اکتشاف کیا ہے جو اس سے پیشتر پردہ شہود پر نہ آئی تھیں (ہر چند یہ فن ابھی اپنے عہد طفولیت میں ہے لیکن بایں ہمہ اس نے نفسیاتی دنیا میں نئی واقعات ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے) یعنی ہوتا یہ ہے کہ انسانی خواہش کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ عقل اس کے جواز کے لئے منطقی توجیہات تراشتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ایسے ایسے دلائل پیش کرتی ہے کہ یہ سب کچھ عین مطابق عقل معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ یکسر جذبات کے داعیات پر مبنی ہوتا ہے۔

فریب کش مکش عقل دیدنی دارد

کہ میر و تافلہ و ذوقی رہزنی دارد

کہیے کہ تنہا عقل کی راہنمائی انسان کو ہلاکت و بربادی کے کس جہنم کی طرف لے جائے گی؟ فلسفہ قدیم و جدید دونوں اس حقیقت پر متفق ہیں کہ ہماری سعی و عمل کے محرکات ہمارے جذبات ہوتے ہیں۔ اسطو کے الفاظ میں ”عقل ہماری کسی قوت کو متحرک نہیں کر سکتی“ اس لئے

ہر عمل جو ارادۂ سرزد ہو بظاہر کتنا ہی معقول (مبنی بر عقل) کیوں نہ نظر آئے درحقیقت

ہمارے ”مفاد“ پر مبنی ہوتا ہے اور مفاد کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد جذبات پر ہو۔۔۔

قوت ارادی کو آمادہ بہ عمل کرنے کے لئے مفاد کا احساس نہایت ضروری ہے۔ اس کے

سوا اس کے لئے اور کوئی جذبہ محرک نہیں ہو سکتا۔

(MYSTICISM BY EVELYN UNDERHILL)

ڈاکٹر جوڈ اپنی کتاب (GUIDE TO MODERN THOUGHT) میں رقمطراز ہے۔

عقل در حقیقت ہماری خواہشات کی لونڈی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ ہم جن مقاصد کو غیر شعوری طور پر حاصل کرنے کی خواہش کریں ان کے حصول کے لئے ذرائع بہم پہنچا دے اور جو کچھ ہم کرنا چاہیں اس کے جواز کے لئے دلائل تلاش کر کے ہتیا کر دے!

دنیا میں آج جس قدر فتنہ و فساد ہر پاہے محض اس لئے ہے کہ ہر شخص اور ہر گروہ اپنے جذبات کی تسکین اور اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے۔ عقل کی ہنرمندی ان جذبات و خواہشات کی تکمیل کے لئے ذرائع بہم پہنچاتی ہے۔ اب مختلف عقول کی جنگ (BATTLE OF WITS) شروع ہو جاتی ہے۔ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ دوسرے کو بیوقوف بنا کر اپنا اُتو سیدھا کرے۔ دو کا نڈا اس کوشش میں ہوتا ہے کہ اپنی عقل کے زور پر گاہک کو بیوقوف بنا کر روپیہ کی چیز سوا میں بیچے۔ اور گاہک اس کوشش میں کہ اپنی عقل کے زور پر دو کا نڈا کو بے وقوف بنا کر بارہ آنے میں خرید لائے۔ یہ چھوٹے پیمانے پر ہے۔ بڑے پیمانے پر سلطنتوں اور مملکتوں کے معاملات اسی پنج پر طے پاتے ہیں۔ عقل پرستوں کی ساری سیاست کا مدار انہی حیلہ کاریوں پر ہے۔ بعض کم لبعض عدد۔

قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے

جس کی عقل غالب آجائے وہی کامیاب و کامران اس کے سامنے سب قوانین و دساتیر، اصول و مسلمات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ دنیا میں یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ آج ہو رہا ہے۔

اُمّتے بر اُمّتے دیگر چرد

وانہ لیں می کار دُعاں حاصل برد

از تن شاں جاں ربودن حکمت است

از ضعیفاں ناں ربودن حکمت است

پردہ آدم درمی سوداگری است

شیوہ تہذیب نو آدم درمی است

یہی وجہ ہے کہ جو شخص اپنے جذبات کی تسکین ہی کو مقصد زندگی سمجھتا ہے علم و عقل کے باوجود فلاح و سعادت کی راہ سے محروم رہتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا علم اور اس کی عقل اس کی صحیح راہ نمائی کے بجائے اس کی خواہشات کی تکمیل کے اسباب و ذرائع بہم پہنچاتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے علم و عقل کی اہمیت پر زور دینے کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا کہ جب ”عقل“ جذبات کے تابع ہو کر چلے تو انسان سعادت کی راہ نہیں پاسکتا۔ ارشاد ہے۔

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ..... أَفَلَا تَذَكَّرُ ۝ (۴۵/۲۳)

(کیا تم نے ایسے لوگوں کی حالت پر غور کیا جنہوں نے اپنے جذبات ہی کو اپنا خدا بنا رکھا ہے؟ چنانچہ ایسے شخص کی اس بے راہ روی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے علم (و عقل) کے باوجود خدا کا قانون صحیح راستے کو اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ اس کے کانوں پر اور دل پر بہرہیں لگ جاتی ہیں اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ خدا کے قانون کی رو سے جس شخص کی حالت یہ ہو جائے اسے کون صحیح راستے پر لاسکتا ہے۔ کیا تم لوگ ایسی کھلی کھلی باتوں کے بعد بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے؟

سماعت و بصارت و قلب یہی تو ذرائع علم تھے۔ لیکن جب عقل و علم جذبات و خواہشات کے تابع ہو جائیں تو کانوں اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور دل غلافوں میں لپٹ جاتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے کہہ دیا کہ العلم کے لئے (یعنی علم حقیقی) جس کی تفصیل چند قدم آگے چل کر آئے گی کسی کے جذبات کا اتباع جائز نہیں۔

وَكَذَلِكَ أَنزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۖ وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ
بَعْدَ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۖ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ دَلِيلٍ وَلَا رَاحَةٍ
اور اسی طرح ہم نے اسے (یعنی قرآن کو) بالکل واضح انداز میں اتارا اگر حصول علم کے بعد تو نے ان لوگوں کے جذبات کی پیروی کی۔ تو سمجھ لے کہ پھر اللہ کے مقابلہ میں نہ تو تیرا کوئی کارساز ہو گا نہ بچانے والا۔

انسانی جذبات راستہ کے پُر فریب مناظر رنگ و بو میں الجھ کر رہ جانا چاہتے ہیں۔ لیکن جس کی نگاہوں کے سامنے حقیقت کی روشنی ہو، وہ منزل کی سوچتا ہے۔ خواہ وہ منزل دُور اور راستہ پُر خطر ہی کیوں نہ ہو۔ قصہ قارون کے ضمن میں فرمایا،

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ..... وَلَا يُلْقَاهَا إِلَّا الْضَّالُّونَ ۝ (۲۸-۲۹)
چنانچہ (جب ایسا ہوا کہ) قارون اپنی قوم کے سامنے اپنی آرائش (اور ساز و سامان) کے ساتھ نکلا تو جو لوگ صرف حیاتِ دنیوی (اور اس کے ساز و سامان) ہی کے طالب تھے وہ

کہنے لگے: اے کاش ہمارے پاس بھی یہی (عیش و عشرت کے) سامان (اور اسباب تنعم) ہوتے جو قارون کو دیئے گئے ہیں۔ بلاشبہ وہ بڑا ہی نصیبہ ور ہے۔ مگر ان لوگوں نے جو علم کی روشنی رکھتے تھے (ان کی یہ باتیں سُن کر) یہی کہا۔ تمہارا ناس ہو، جو حصّہ خدا کے قانون کے مطابق (دنیا اور آخرت میں ملتا ہے وہی) ان لوگوں کے لئے بہترین چیز ہے جو ایمان لے آئے ہوں اور (ساتھ ہی) نیکو کار (بھی) ہوں۔ مگر وہ حصّہ صرف انہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو اپنے پروگرام پر استقامت کے ساتھ عمل پیرا رہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مفادِ عاجلہ ہی کو اصل حیات سمجھنے والوں (اور یوں اپنے جذبات کی تسکین میں کامیابی محسوس کرنے والوں) کا علم جذبات کی چار دیواری میں سمٹ کر رہ جاتا ہے اور اس کی نگاہوں کو محض حقیقت تک نہیں پہنچنے دیتا۔

وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ..... وَهُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ اهْتَدَىٰ ۝ (۲۸-۵۳/۳۰)

اور انہیں اس کے متعلق کچھ بھی علم نہیں ہے۔ وہ لوگ محض ظن و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور (ظاہر ہے کہ) حقیقت کے متعلق یہ ظن و تخمین ذرا بھی فائدہ نہیں دے سکتے تو (آپ پیغمبر اسلام!) جو لوگ ہمارے ذکر (کو سننے اور اس پر کاربند ہونے) سے اعراض اور روگردانی کا معاملہ کریں اور صرف دنیوی زندگی ہی کے طلب گار ہوں تو تم بھی ان سے اعراض کرو۔ (اور ان کی مطلق پرواہ نہ کرو) اُن لہ نصیبوں (کا مبلغ علم اتنا ہی ہے) وہ اپنی قبولِ حق کی صلاحیت کو کھو چکے ہیں اور اس کے علاوہ اب کچھ نہیں کر سکتے۔ یقیناً جو لوگ خدا کے راستے سے گم ہو گئے ہیں تمہارا پروردگار انہیں خوب جانتا ہے۔ اور وہ انہیں بھی خوب جانتا ہے جو حقیقت کا راستہ پا گئے ہیں۔

رفتہ رفتہ اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اس کی عقل یکسر جذبات کے تابع ہو جاتی ہے اور وہ غلط راستہ پر چلنے کے باوجود سمجھتا ہے کہ بالکل راہِ راست پر ہوں۔ یہ شقاوتِ انسانی کی آخری حد ہے۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ فَقَدْ ضَلَّ سَبِيلًا فَهُوَ
لَهُ قَرِيْنٌ ۝ وَ اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ
اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (۳۶-۳۷/۳۴)

اور جو لوگ خدا سے رحمٰن کے ذکر (نصیحت و احکام الہی سے) مُنہ موڑ لیتے ہیں ہم ان کے لئے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں (جو ان پر مسلط ہو جاتا ہے) بس! پھر وہی ان کا ساتھی (اور ہم نشین ہوتا ہے۔ اور (دیکھو) پھر (ایسا ہوتا ہے کہ) یہی لوگ خود افرادِ نسلِ انسانی کو (حقیقت کے) راستہ سے روکنے لگتے ہیں (اور خود ہی ایک دوسرے کے لئے شیطان بن جاتے ہیں) اور یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ وہ صحیح راستہ پر چل رہے ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق فرمایا کہ باوجود آنکھیں رکھنے کے انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ سب کچھ دیکھتا بھالتا ہے لیکن تباہی کے جہنم کی طرف چلا جاتا ہے۔ اقوام سابقہ کے قصص کے سلسلہ میں فرمایا۔

وَ عَادًا وَ ثَمُودًا وَ قَدْ ثَبَّيْنَا لَكُمْ مِنْ مَّسَلِكِهِمْ دَهْرًا وَ زَيْنًا لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَغْوَاهُمْ فَصَدَّ هُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَ كَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ۝ (۲۸/۲۹)

اور (دیکھو) ہم نے عاد و ثمود (جیسی زبردست قوموں) کو بھی تباہ و برباد کر دیا (اُن کی تباہی کچھ چھپی ہوئی نہیں ہے) ان کی آبادیوں سے تم پر (تباہی کی یہ داستان) خوب آشکارا ہو چکی ہے۔ (یہ تباہی کیوں آئی؟ محض اس لئے کہ) شیطان نے ان کی بد عملیوں کو ان کی نگاہوں میں خوشنما بنا رکھا تھا اور وہ انہیں (متواتر) حق کے راستہ سے روکتا رہا۔ چنانچہ بار بار کی خدائی تینہوں کے باوجود انہیں اپنی بے راہ روی کا احساس تک نہ ہو سکا۔ اور یہ بات نہیں تھی کہ وہ اندھے ہو چکے ہوں یا انہیں نظر نہ آتا ہو۔ (دنوی معاملات میں) وہ دیکھ بڑے (ہوشیار اور) دیدہ در تھے!

اس کی تفسیر دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

وَ لَقَدْ مَلَكْنَاهُمْ فِيمَا إِن مَّكَّنَّاكُمْ فِيهِ..... وَ حَاقَّ رَبِّهِمْ مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝ (۲۶/۲۷)

اور ہم نے (زمین میں) انہیں اتنا اقتدار دے رکھا تھا جتنا تمہیں بھی نہیں دیا۔ اور ہم نے انہیں (دیکھنے کے لئے) آنکھیں (سننے کے لئے) کان اور (سمجھنے کے لئے) دل دے رکھے تھے۔ مگر ان کی وہ آنکھیں، کان اور دل کچھ بھی کام نہ آ سکے۔ (کیونکہ وہ ان کی قبول

حق کی صلاحیت کو خود ہی کھو چکے تھے) اس وجہ سے کہ وہ آیات الہی کا ضد اور ہٹ دھرمی سے انکار کیا کرتے تھے (اور اس حد تک پہنچ کر صلاحیت باقی نہیں رہا کرتی) اور (بالآخر) جن چیزوں کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے (یعنی عذاب الہی) وہ اُن پر نازل ہو کر رہیں۔

اور اگر آپ کے نزدیک عاود و ثود کی یہ داستانیں اتنی پرانی ہیں کہ ان کا اثر زائل ہو چکا ہے تو خود اپنی آنکھوں کے سامنے یورپ کے مستبصرین کی حالت کو دیکھ لیجئے۔ کس طرح وہ خود اور ان کے ساتھ پوری دنیا ہلاکت میں گھر چکی ہے اور باوجود آنکھیں رکھنے کے کوئی نجات کی راہ دکھائی نہیں دیتی؛ دکھائی دے بھی کس طرح؛ ایک تو عقل خود محدود۔ پھر اس پر وہ امیال و عواطف سے متاثر اور جذبات کے زغے میں گھری ہوئی۔ یہی ہے کہ انسان کی نگاہ محض سطح پر رہتی ہے معاملات کی گہرائی تک نہیں اُتر سکتی۔ اسی لئے فرمایا کہ

وَعَلَىٰ أَنْ تَكْفُرُوا شَيْئًا ۖ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَلَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا ۖ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۲/۲۱۶)

بہت ممکن ہے ایک بات کو تم بُرا سمجھتے ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ اور ایک بات تمہیں اچھی لگتی ہو۔ اور اسی میں تمہارے لئے بُرائی ہو (پس اپنے جذبات کی پسندیدگی) اور ناپسندیدگی کی بنا پر اعمال کی اچھائی بُرائی کا فیصلہ نہ کرو) اللہ جانتا ہے (کہ تمہارے لئے کس ناگواری میں خوشگواری اور کس پسندیدگی میں ناپسندیدگی ہے) مگر تم نہیں جانتے! عقل کی یہی کوتاہ دامن ہے جس کی بنا پر انسان ان چیزوں کی آرزو کرتا رہتا ہے جو درحقیقت اس کے لئے مضر ہوتی ہیں۔

وَيَذَرُ الْإِنْسَانُ بِالْإِثْمِ كَالْخَيْْرِ ط وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَاجِزًا ۝ (۱۷/۱۱ نیز ۲۱/۳۷)

اور جس طرح انسان اپنے لئے بھلائی کی دعائیں مانگتا ہے اسی طرح (بسا اوقات) بُرائی بھی مانگنے لگتا ہے۔ اگرچہ نہیں جانتا کہ یہ اُس کے لئے بُرائی ہے) اور حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی جلد باز ہے۔

انسان کی اس کمزوری پر پھر غور کیجئے کہ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُوزًا (یہ بڑا جلد باز واقع ہوا ہے)۔ ادھر ایک چیز سامنے آئی اور ادھر اس کے جذبات نے اسے نہایت حسین و دل کش نقاب اڑھا کر اس کی نگاہوں کو فریب دیا۔ اُس نے عقل سے پوچھا اور عقل نے جذبات کے غلام ہونے کی حیثیت سے فوراً ایک منطقی توجیہ اس کے جواز میں تراش دی۔ بس پھر کیا تھا؟ اس مقصد کے حصول کے لئے لہو پانی ایک کر دیا۔ گویا اس کی تمام زندگی کا دار و مدار اسی مقصد کے حصول میں مضمر ہے اور کبھی خیال نہ کیا کہ ان فریب نگاہ پردوں کے پیچھے بھی جہانک کر دیکھ لیا جادے کہ اُن میں چھپا کیا ہے؟ سچ ہے

كَانَ الْإِنْسَانُ عَجُوزًا بِقَوْلِ عَلَامَةِ اقْبَالَ،

کم شناسد نفع خور از ضرر
جادہ ہموار و نا ہموار چسیت

آدمی اندر جہان خیر و شر
کس نداند رشت و خوب کا چسیت



تمدن کی زندگی اور تنہا عقل کی رہبری اگر انسان کو ایسی زندگی بسر کرنی ہوتی کہ ایک فرد کسی ایک جزیرہ میں تنہا رہتا

اور دوسرا دوسری اور میں تنہا، تو بھی گزارہ ہو جاتا، لیکن انسان، ارسطو کے الفاظ میں "سیاسی حیوان" (POLITICAL ANIMAL) ہے۔ یہ مدنی الطبع واقعہ ہوا ہے۔ اسے آپس میں مل جل کر رہنا ہے۔ اس پنج کی زندگی کا تقاضا ہے کہ انسانوں کے مفاد میں باہمی تصادم ہو، یہ تصادم جذبات پر مبنی ہوتا ہے (کہ مفاد کا تعلق جذبات سے ہے) اور جذبات کے تقاضوں کو بردے کار لانے والی قوت عقل ہے۔ اس لئے مدنی الطبع انسان کے لئے تنہا عقل کی راہنمائی (جسے صحیح الفاظ میں جذبات کی کاہنجی کہنا چاہیے) بڑی ہلاکت آفریں ہے۔ غور فرمائیے انسانی حقوق اور ان کا تحفظ، یہی وہ بنیاد ہے جس پر انسانی تمدن کی فلک بوس عمارت قائم ہے۔ مملکت اور اس کا نظام، حکومت اور اس کا انصرام، سلطنت اور اس کا نظم و نسق، ایک قبیلہ کا دوسرے قبیلہ سے برسرِ پیکار ہونا، ایک قوم کا دوسری قوم سے نبرد آزمائی کرنا، ایک ملک کا دوسرے ملک پر دھاوا بول دینا۔ یہ سب کیا ہیں؟ انسانی حقوق و مفاد کے تصادم اور اُن کے تحفظ اور سلب و دہی کی آگ اور خون سے لکھی ہوئی داستانیں (بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ) کی تفسیریں ہیں۔ اس باب میں ہلا کو اور چنگیز خاں سے لے کر دورِ حاضر کی (بظاہر)

مہذب لیکن (درحقیقت) "وحشی" اقوام تک سب ایک ہی رنگ میں رنگی ہوئی چلی آرہی ہیں عقل نے انہیں کیا سکھایا ہے؟ یہی ناکہ قتل و غارت گری، تباہی اور بربادی کے موثر ترین ذرائع کس طرح ایجاد کئے جاسکتے ہیں۔ جنگیزی اور ہلاکو خانی دور، وحشت و بھالت کا دور تھا، اس لئے وہاں ایک انسان دوسرے انسان کو مشکل و دوچار گھنٹے میں مار سکتا تھا۔ آج علم و عقل اپنی انتہائی بلندیوں پر ہے اور انسانی درندگی کی حالت یہ ہے کہ ایک ساعت میں لاکھوں انسان آگ اور خون کے جہنم میں دھکیل دیئے جاسکتے ہیں۔ بستیوں کی بستیاں، ملکوں کے ملک اس طرح ویران اور برباد کئے جاتے ہیں۔ (کَاتِلْهُ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مِّنْ كَوْرًا) میدان جنگ میں سپاہی آگ کے شعلوں سے کھیل رہے ہوتے ہیں اور اُدھر شہروں کے اندر سائنسدانوں کی جماعتیں اپنے علم و عقل کے تمام مایہ ناز سرمایہ کو لے کر اس فکر میں غرق کہ کوئی ایسی نئی ایجاد ہاتھ لگ جائے جس سے انسانوں کی بربادی جلد از جلد عمل میں لائی جاسکے۔ پہلی جنگ عظیم کے دس سال بعد دنیا کی ۶۸ حکومتوں میں سے ۶۳ نے ایک میثاق پر دستخط کئے جو (KELLOGG PACT) کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں انہوں نے نہایت جوش و خروش سے اعلان کیا کہ

اس مقدس فریضہ کے شدید احساس کے ساتھ کہ ہمیں نوع انسانی کی فلاح و بہبود کو ترقی دینا ہے، اس جذبہ سے متاثر ہو کر کہ وقت آگیا ہے کہ اس امر کا اعلان کر دیا جائے کہ جنگ کو قومی حکمت عملی کی حیثیت سے یکسر ترک کر دینا چاہیے۔ اس یقین کے ساتھ کہ حکومتوں کے باہمی معاملات میں تغیر و تبدل اس صلح کے طریقوں سے ہی ہونے چاہئیں اس میثاق پر دستخط کرنے والی حکومتیں (اپنی اپنی اقوام کے نام پر) حلفاً اعلان کرتی ہیں کہ وہ بین الاقوامی معاملات کے تصفیہ کے لئے جنگ کے طریق کار کو مذموم سمجھتی ہیں اور آپس کے باہمی تعلقات کے لئے اسے بحیثیت قومی حکمت عملی اختیار کرنے سے بیزاری کا اظہار کرتی ہیں۔ اس میثاق پر دستخط کرنے والی جماعتیں اس امر پر متفق ہیں کہ تمام باہمی تنازعات کا حل یا تصفیہ (خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں اور ان کی ابتداء کسی طرح ہوئی ہو) پرامن طریقہ کے علاوہ اور کسی طریق سے نہیں کیا جائے گا۔

لیکن اس میثاق اس کی ابھی روشنائی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ یہی اقوام پھر اسی طرح آپس میں

گتھم گتھا ہو گئیں۔ اور یہ سب کچھ کس چیز کے لئے؟ ”روٹی“ کی خاطر اور اپنی اپنی قوم (نسل) کے تحفظ کے لئے! کیا اس کے بعد بھی اس حقیقت بامبرہ کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ مدنی الطبع انسان کی راہ نمائی کے لئے عقل کی راہ نمائی (جو درحقیقت اس کے جذبات کی برومندی کا آلہ کار ہوتی ہے) راہ نمائی نہیں رہزنی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ یورپ اپنے موجودہ نظام سے جو تنہا عقل پر مبنی تھا اس درجہ تنگ آچکا ہے کہ وہ کسی نظام جدید کی تلاش میں پاگلوں کی طرح مارا مارا پھر رہا ہے۔ پروفیسر کوہن (جس کا تعارف پہلے کرایا جا چکا ہے) تہذیب مغرب کی تباہی کے سلسلہ میں چاروں طرف سے مجبور ہو کر لکھتا ہے:-

اب صرف اتنا پوچھنا باقی رہ گیا ہے کہ عقل کے علاوہ کوئی ایسی بنیاد بھی ہے جس پر ہم قانون حکومت کی دوبارہ تشکیل کر سکیں؟ اگر دنیا میں کوئی عالمگیر مذہب ہوتا تو اس کے آسمانی قوانین پر جدید نظام حکومت کی بنیاد رکھی جاسکتی تھی لیکن ایک ایسی دنیا میں جہاں مختلف مذاہب موجود ہوں یہ کوشش کرنا کہ ان میں سے کسی ایک کے ضابطہ کے مطابق ”قانون فطرت“ کو قائم کر دیا جائے۔ نہ یہ کہ نظری طور پر اس کا جواز مشکل ہوگا بلکہ عملی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم پھر سے لڑائیوں کے دور کو واپس بلا لیں گے۔

(صفحہ ۹۲)

سروست اس چیز کو نظر انداز کر دیجئے کہ پروفیسر صاحب نے اپنے اس بیان کے آخری حصہ میں کتنی بڑی کھوکھالی ہے۔ (اس کا جواب اپنے مقام پر آئے گا۔ جہاں یہ بتایا جائے گا کہ دنیا میں عالمگیر مذہب، یعنی دین، ہونے کی اہلیت کس میں ہے) یہاں صرف یہ دیکھئے کہ یورپ کس طرح اپنے نظام تمدن سے، کہ جس کی بنیاد عقل پر تھی تنگ آکر اب ایک ایسے نظام کی تلاش میں جس کے نظام کی بنیاد وحی آسمانی پر ہو اس سے بڑھ کر تنہا عقل کے یورپ کیسا نظام چاہتا ہے؟

ناکافی ہونے کی اور کیا دلیل ہوگی؟

پروفیسر کوہن کو چونکہ کوئی عالمگیر مذہب دکھائی نہیں دیا۔ (اس لئے کہ ان کے سامنے حقیقی اسلام نہیں۔ ہم نے حقیقی اسلام ان تک پہنچایا ہی نہیں۔ ورنہ یورپ تو اسلام کے لئے تڑپ رہا ہے) اس لئے آگے چل کر وہ اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ دنیا آج کس قسم کا نظام چاہتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

”ہمارے اس کہنے سے کہ کیا کوئی ایسا قانون ہے جو انسانی فطرت کے اندر موجود ہو۔ دراصل مطلب یہ ہے کہ کیا کہیں کوئی ایسا ضابطہ اخلاق ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے قابل قبول ہو اور جسے خود انسانی انداز زندگی سے اخذ کر کے مرتب کیا جائے؟ محض عدل و انصاف کے نظری اصول کے طور پر نہیں۔ بلکہ جس طرح حق (RIGHT) کے مثبت تصورات کوئی واقعہ محسوس کیا جاتا ہے۔ اگر کہیں کوئی ایسا ضابطہ ہے تو وہی نظام فطرت انسانی بن سکتا ہے۔“ (صفحہ ۱۰۵)

اس کے بعد وہ حقوق انسانی اور فطرت انسانی کے اجمال کی وضاحت کر کے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ایسا مان لینا غیر معقول نہیں کہ اس قسم کے عالمگیر اخلاقی تصورات کا وجود ثابت کیا جاسکتا ہے۔ (لیکن) ضابطہ اخلاق ایسی چیز نہیں جسے عقل سے ثابت کیا جاسکے۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد ہی حق و باطل اور خیر و شر کی تمیز پر ہوتی ہے اور اس یقین پر کہ انسان کو حق اور خیر قبول کرنا چاہیئے اور باطل و شر سے مجتنب رہنا چاہیئے۔ لہذا فطرت انسانی کے اس اخلاقی حکم کو عقلاً کس طرح ثابت کیا جاسکتا ہے؟ اگر کوئی پوچھے کہ انسان کو کیوں حق اختیار کرنا اور باطل سے اجتناب کرنا چاہیئے تو اس سوال کا جواب بحجراں الفاظ کے جن میں یہ سوال پوچھا گیا ہے اور کیا دیا جاسکتا ہے۔ اس کا جواب اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ جواب خود سوال کے اندر موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ اخلاقی ضابطہ جبلی طور پر انسانوں کے اندر موجود نہیں۔ اس لئے کہ باطل پرستی بھی دنیا میں کچھ کم نہیں ہے۔“ (صفحہ ۱۰۸)

آپ نے غور فرمایا کہ علم و عقل اور تہذیب و سائنس کے علمبردار اپنے نظام تمدن کے استحقاقوں تنگ اگر کس چیز کی تلاش میں ہیں؟ ایک ایسے ضابطہ حیات کی جو ”فطرت انسانی“ کے عین مطابق۔ بلکہ خود فطرت ہی پر مبنی ہو۔ جسے تمام نوع انسانی داعیات فطرت کی حیثیت سے قبول کرے۔ اور یوں یہ ضابطہ عالمگیر نظام حکومت بن سکے۔ پروفیسر کوئن کے نزدیک اس قسم کا ضابطہ نہ تو جبلی طور پر انسانوں کے اندر موجود ہے اور نہ ہی عقل کی رو سے قائم کیا جاسکتا ہے۔ لہذا کوئی اور ذریعہ ہونا چاہیئے جس کی رو سے اس قسم کا ضابطہ وجود میں آسکے (اس کی تفصیل آئندہ ادراک میں آئے گی)۔

یورپ کا قلبی اضطراب | یورپ کے موجودہ قلبی اضطراب اور ذہنی خلفشار کے متعلق پروفیسر جوڈ کا بیان بھی قابل غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اس زمانہ میں مشین نے انسان کو بے پناہ قوت دے دی ہے اور اس قوت سے وہ تعمیر اور تخریب کے بے حد و حساب کام کر سکتا ہے۔ وہ چاہے تو سمندروں کو پھاڑ دے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے۔ آسمان اس کے سامنے گرد ہے اور کائنات سرنگوں۔ لیکن اتنی قوت پا کر بھی وہ سکھی نہیں ہوا۔ بلکہ وہ اور دکھی ہے۔ آج مشین کی طاقت انسان کو مطمئن کرنے کے کام نہیں آرہی۔ بلکہ اُلٹا اسے تباہ و برباد کیا جا رہا ہے..... اگر اس طاقت کو قابو میں رکھنے کی کوئی سبیل نہ کی گئی تو انسانیت کا انجام اچھا نظر نہیں آتا۔

انسان کی ہزار ہا سال کی جدوجہد کا یہ انجام کیوں ہوا؟ اور آج وہ مشین کے ہاتھوں کیوں ایسا بے بس نظر آ رہا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ ہم نے طاقت کو حاصل کر لی اور آگ اور پانی اور معدنیات کو کام میں لانے کے وسیلے ڈھونڈ لئے۔ لیکن اس طاقت کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی عقل ہم نے حاصل نہ کی۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج انسان اس مصیبت میں گرفتار ہے۔ ضرورت ہے کہ طاقت کو صحیح راہ پر چلانے کی عقل ہم پہنچائی جائے۔ اور اگر طاقت اور عقل میں صحیح توازن ہو جائے تو آج ہماری مصیبتیں دُور ہو سکتی ہیں اور انسانیت آنے والی تباہی سے بچ سکتی ہے۔

بے شک انسان مظاہرِ فطرت کو مستحضر کرنے میں اپنے آباؤ اجداد سے بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ لیکن جہاں تک اس کے اپنے رہنے پہننے اور دوسروں سے مل کر زندگی گزارنے یعنی اخلاقیات و سیاسیات کا تعلق ہے۔ وہ اب تک وہیں ہے جہاں ہزاروں برس پہلے یونان کے قدیم باشندے تھے۔ ہم نے گومادی ترقی تو بہت کر لی ہے۔ لیکن روحانی اور اخلاقی لحاظ سے ہم ذرا بھی آگے نہیں بڑھے۔ اور آج رونا بھی اس بات کا ہے اور ساری ضرورت بھی یہی ہے کہ ہم اپنی مادی طاقت کے مطابق اپنے اندر روحانی اور اخلاقی عقل پیدا کریں تاکہ اس طاقت کا صحیح مصرف ہو سکے۔ ورنہ یہ طاقت وبالِ جان ہو جائے گی۔

غور کیا آپ نے کہ مغرب کے یہ مفکرین، کشاں کشاں کس طرح اس مقام کی طرف بڑھ رہے ہیں جس کی طرف

قرآن کریم نے راہنمائی کی ہے؟ اس کے بعد پروفیسر موصوف لکھتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ عقل (یعنی اخلاقی عقل) ہم کیسے سیکھیں اور موجودہ اخلاقی ورور دھانی مُردنی کو زندگی سے کیسے بدلیں؟ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کہیں سے کچھ زیادہ اُمید نظر نہیں آتی اور آثار بھی کچھ ایسے ہیں کہ نا اُمید ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ مثینی طاقت کو قابو میں رکھنا اور نئی اخلاقی قدروں کو پیدا کرنا اس دور میں مشکل ہو گیا ہے۔ نوجوان روایتی مذہب سے بالکل برگشتہ ہو چکے ہیں۔ کوئی اخلاقی ضابطہ انہیں پسند نہیں آتا۔ اعلیٰ نصب العین سے وہ بیزار ہو چکے ہیں اور زندگی کی شب و روز کی مسرتوں ہی میں راحت پاتے ہیں کسی وعدہ فردا کا انتظار ان کو گراں ہے اور عشرتِ امروز ہی اب ان کا عقیدہ بن گیا ہے "آج کھاؤ پیو کل کو تمہیں مرنا ہے" یہ ہے اصول آج کے نوجوان کا اور شاید یہ وہی دور ہے جو "سپنگلر" کے الفاظ میں کسی کلچر کی موت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ کیا ہم سمجھ لیں کہ موجودہ تمدن فنا کے ہاتھ سے نہیں بچ سکتا اور یورپ پر اب دم نزع طاری ہے۔ اور جو کچھ روما کے ساتھ ہوا۔ اب بعینہ ہی حشر یورپ کا ہوگا؟

مغربی فلاسفر پسکال نے لکھا ہے کہ انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے اور اسی طرح انسان کا ارادہ بھی کسی نہ کسی سے مجتہد کرنے پر مجبور ہے اور جب ایمان و مجتہد کے لئے اس کو کام کی باتیں نہیں ملتیں تو وہ بیکار اور خراب مقصدوں پر رکیچہ جاتا ہے۔ غلا قدرت کے کارخانے میں محال ہے اور محض باڑی دنیا میں نہیں بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلانا ممکن ہے۔ ان جب خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگتا ہے۔ اور اچھے نصب العینوں سے دستکش ہو جائے تو بُرے راستے اس کو خوش آتے ہیں۔ یورپ کو اگر اس دلدل سے نکلنا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ بے یقینی کی جگہ یقین

لے "سپنگلر" کی کتاب (DECLINE OF THE WEST) اپنے موضوع پر ایک بلند پایہ تصنیف ہے اور اب

ذوق کے لئے اس کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

اور ایمان لے لے۔ بے راہ روی ختم ہوا اور یورپ والے نئی قدروں پر ایمان اور اخلاقی ضابطوں سے محبت پیدا کریں۔ وہ زندگی جس میں نہ ایمان کی گرمی ہو اور نہ اخلاقی ضابطہ کی کشش، وہ زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔ ایچ جی۔ ویلز کی رائے میں اس دور کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ طاقت اور قوت ہے لیکن اس کا کوئی مصرف موجود نہیں۔ یعنی کوئی ایسا نصب العین موجود نہیں جو نوجوانوں کی امنگوں، دلوں اور حوصلوں کو روشن کرنے کا راستہ۔ ایک طرف اتنی زیادتی اور دوسری طرف اتنی کمی یہ ہمارا سب سے بڑا دوگ ہے۔ لیکن ہمارے اندر اس نصب العین کی تلاش کا مادہ فنا نہیں ہوا۔ اور اس سے اُمید ہوتی ہے کہ شاید ہم نئے دور کو پیدا کر سکیں۔ اور اخلاقی اور مذہبی قدر کے نہ ہوتے ہماری زندگیوں میں جو غلا پیدا ہو گیا ہے، وہ بھرا جاسکے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہماری تہذیب آپس میں ٹکرائے گا۔ اگر ہمیں پچھلے تو اپنے لئے کوئی مذہب تلاش کرنا ہو گا جس کو ہم دل سے مانیں اور اس کے اصولوں پر زندگی ڈھالیں۔

(ماخوذ از "کتاب" لاہور، فروری ۱۹۳۲ء)

یورپ کا یہ تمام اضطراب و خفقان، یہ سب بے چینی اور پریشانی، یہ سب وحشت و سرسبکی، یہ عدم اطمینان و فقدان سکون کا جہنم، نتیجہ ہے اس تمدن کا جسے تنہا عقل کی بنیادوں پر کائنات کے میکا نیکی تصور کے مطابق قائم کیا گیا۔ تنہا عقل اور اک حقیقت نہیں کر سکتی اس لئے کہ اس کا قائم کردہ نظام کبھی انسانی ذات کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ اور میکا نیکی تصور چونکہ انسان کو ایک مشین بنا دیتا اور اس کی زندگی کو جوئے رواں قرار دینے کے بجائے، اسی مجلس آب و گل میں ختم کر دیتا ہے۔ اس لئے مایوسیوں کے زہریلے سانپ اس کے تحت الشعور میں بُری طرح سے زہر افشال اور شعلہ ریز رہتے ہیں۔

عشق ناپید و خرومی گزوش صورتِ مار

اس طرح بقول علامہ اقبالؒ یورپ کا نوجوان۔

اپنے فکر کی دنیا میں خود اپنی ذات کے خلاف ستیزہ کار رہتا ہے اور سیاسی دنیا میں دوسروں کے خلاف نبرد آزما۔ وہ نہ اپنی کف بردہاں سکشی کو ضبط میں لاسکتا

ہے اور نہ ہی ہوس زہر پرستی کے استسفار کی تسکین کا سامان فراہم کر سکتا ہے یہی وہ چیزیں ہیں جو اس کے تمام بلند مقاصد کو (ایک ایک کر کے) ہلاک کر رہی ہیں اور ایسی کیفیت پیدا کر رہی ہیں کہ وہ زندگی کے ہاتھوں بیزار ہے۔ وہ نگاہ فریب مناظر میں جذب ہو کر اپنی ذات کی گہرائیوں سے یکسر منقطع ہو چکا ہے۔ اس منظم مادہ پرستی کے میدان میں اس کی توانائی پر وہ فالج گر چکا ہے جسے ہکسل کی نگاہ نے بھانپا اور اس پر اظہارِ تائیف کیا تھا۔ (خطبات ص ۷۷)



ہم دیکھ چکے ہیں کہ ادراک حقیقت علم استدلالی (عقل) کے ذریعے ممکن نہیں۔ اب یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا اس علم کے علاوہ انسان کے پاس کوئی اور علم بھی ہے۔ لیکن اس کڑی تک پہنچنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا سیکر انسانی میں ذریعہ علم و احساس دماغ ہی ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی۔ بالفاظِ دیگر یہ کہ انسان محض اسی آب و گل کے پیکر کا نام ہے جسے ارتقاء کے میکائیکی عمل کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے یا اس سے اور کچھ اور بھی۔

انسان کے گرد و پیش کی دنیا کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) جامد مادہ (INORGANIC)

MATTER (۲) حیات (LIFE) (۳) شعور (CONCIOUSNESS) علم طبیعیات (PHYSICS)

مادہ سے متعلق ہے اس سے آگے علم الحیات (BIOLOGY) ہے۔ اس کے بعد شعور۔ کائنات کے میکائیکی تصور کی رُو سے (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور جس کے سب سے بڑے علمبردار ڈارون اور اس کے رفقاء تھے کارہن اور ان کا ماہر الامتیاز کارنامہ نظریہ ارتقاء مادیت ہے) مادہ کے مختلف عناصر کے امتزاج سے "کسی نہ کسی طرح" زندگی کی شاخ پھوٹ نکلی اور مختلف ارتقاء منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ زیادہ نفیس ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ حیوانی قالب نے انسانی پیکر

لے ہم اس مقام پر دماغ (BRAIN) اور قلب (MIND) کے اصطلاحی اور فنی فرق کی بحث میں نہیں الجھنا چاہتے۔ دماغ سے ہمارا مفہوم علم استدلالی کا مقام ہے جسے مادہ پرست سائنسدان عمل ارتقاء کا میکائیکی نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ لے یہی اس کی سب سے بڑی غلطی ہے "کسی نہ کسی طرح" نہیں بلکہ ایک حکیم مطلق کے ارادہ سے ایک عظیم انشان مقصد کے تحت

شعورِ انسانی کیسے پیدا ہوتا ہے؟ اختیار کر لیا جو سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی قرار دی جاتی ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کی رد سے ”دنیاے

سائنس میں اس خیال کے لئے کوئی بنیاد نظر نہیں آتی کہ انسان کے موجودہ امتزاجی پیکر میں کوئی بھی مادہ اضافہ ممکن ہے۔“ (خطبات ص ۱۱۰)۔ ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ انسانی شعور کا مقام دماغ (BRAIN) ہے جو ارتقاء کے میکائیکی عمل کا نتیجہ ہے۔ لہذا جب پیکرِ انسانی کا یہ میکائیکی عمل ختم ہو جائے گا تو پھر کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ لیکن دورِ حاضرہ کی تحقیقات نے جہاں مادہ کی اصل دنیا کے متعلق محیر العقول اکتشافات ہم پہنچائے ہیں وہاں حیات کی دنیا میں بھی قدیم زوایائے نگاہ کو بڑی حد تک بدل دیا ہے۔

عصرِ رواں کے اربابِ سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ انسانی فکر کے متعلق تحقیق جدید قوتِ فکر (INTELLECT) مادہ کے میکائیکی عمل کا

نتیجہ نہیں۔ مشہور عالمِ حیات (J.S. HALDANE) اس مسئلہ پر تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ انسانی شعور مشینی عمل نہیں ہے۔ اس لئے کہ ”ایک مشین کے متعلق یہ تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے قیام و بقا اور مزید نشو و ارتقاء کا ذریعہ بن سکتی ہے۔“ (خطبات ص ۱۱۰)۔ پروفیسر (A.V. HILL) اپنے ایک لیکچر میں خود حیات کے متعلق بیان کرتا ہے۔

”میں آج آپ کے سامنے یہ نہیں کہنا چاہتا (اس لئے کہ آپ اس سے پہلے متعدد بار اس غلط نظریہ کو سن چکے ہیں) کہ مسئلہ حیات موجودہ زمانہ کی طبیعیات اور کیمیا سے سمجھایا جاسکتا ہے۔ خواہ سمجھانے والا کیسا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو (ایسا ممکن نہیں) آیا مستقبل کے علمِ طبیعیات اور کیمیا کے ذریعے ایسا ممکن ہوگا۔ اس کے متعلق میں قیاس آرائی نہیں کرنا چاہتا۔ جب علمِ طبیعیات کے حوادث غیر متعین ہو جائیں..... جب علمِ الکیمیا علمِ طبیعیات بن جائے اس وقت صورتِ حالات اور ہوگی۔ لیکن اس وقت تک میں (HALDANE) کی ہم نوائی میں یہی کہتا رہوں گا کہ جب ہم علمِ حیات (یا اشیلہ کی قوتِ نو) کو تما م دیکھتے ہیں تو ہمارے سامنے ایک بالکل مختلف صورت آجاتی ہے۔ ایسی صورت جس کی وحدت اور بنیادی فطرت ایسی ہی اہم ہے جیسے طبیعیات کے کسی اور تصور کی

(THE PHYSICAL REASONABLENESS OF LIFE)

حیات میکائی عمل نہیں | یعنی زندگی "عناصر میں ظہور ترتیب" کا نام نہیں۔ یہ اپنے امتزاجی عناصر کا میکائی مجموعہ نہیں۔ اس کی بنیادی فطرت، ان عناصر کی فطرت و اساس سے بالکل مختلف ہے جن سے یہ مرکب ہے۔ لہذا جب خود زندگی مادی ارتقاء کے میکائی عمل کا نتیجہ نہیں تو ظاہر ہے کہ زندگی کا لطیف جوہر یعنی فکر انسانی (INTELLECT) میکائی عمل کا نتیجہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ پروفیسر (C. LLOYD MORGAN) اپنی مشہور تصنیف (THE EMERGENCE OF NOVELTY) میں اس مسئلہ پر مبسوط بحث کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ فکر انسانی سلسلہ ارتقاء کی سابقہ کڑیوں کی پیداوار نہیں۔ اسی طرح علم الحیات کا مشہور محقق (DR. DRIESCH) لکھتا ہے کہ "نظریہ میکائی کی راہ میں ایک بڑی مشکل شعور تھا۔ اس لئے کہ شعور بدایتاً مادی چیز نہیں"۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ ۱۹^{ویں} صدی کے بعد رفتہ رفتہ علم الحیات اور علم النفس کے محققین کے تصور میں کس طرح بنیادی تبدیلی پیدا ہوتی گئی جس سے یہ میکائی تصور عہد پارینہ کی داستان بن کر رہ گیا۔ ان محققین کے نزدیک شعور مادی ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہے۔ (THE GREAT DESIGN)

(WILDON CARR) کا حسب ذیل اقتباس (جسے علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں نقل

کیا ہے) اس باب میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

اگر عقل ارتقاء کی پیداوار ہے تو مبداء حیات اور مابیت حیات کا سارا میکائی تصور مہل پڑتا ہے اور صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ جو اصول سائنس نے اختیار کیا ہے اس پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ اس اصول کو الفاظ میں ادا کرتے ہی ہمیں یہ نظر آ جاتا ہے اس کے اندر تناقض موجود ہے۔ بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ خود عقل جو ادراک حقیقت کی ایک جہت ہے نتیجہ ہو ایک ایسی چیز کے ارتقاء کا جس کا وجود محض ایک تصور منتشر ہے اسی جہت

۱۔ مغرب کے مادی تصور سے ماؤف ذہن کا مظاہرہ ان ہی الفاظ میں ہوتا ہے ۷

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب

موت کیا ہے؟ انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

ادراک کا جسے عقل کہتے ہیں۔ اگر عقل ارتقائے حیات سے وجود میں آئی ہے تو وہ تصور حیات جس کی رُو سے عقل کا بہ حیثیت ادراک حقیقت کی جہت کے نشوونما پانا ممکن ہے ایک مقرون فعل کا تصور ہونا چاہیے نہ کہ صرف ایک مجرد میکانیکی حرکت کا تصور جس کا خیال عقل نے اپنے مشمول ادراک کی تحلیل کے ذریعے قائم کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ اگر عقل ارتقائے حیات کا نتیجہ ہے تو وہ قائم بالذات نہیں بلکہ منحصر ہے اس چیز کے عمل پر جس سے اس نے ارتقا پائی ہے۔ تو پھر ایسی صورتوں میں سائنس کو کیا حق ہے کہ علم کے موضوعی پہلو کو نظر انداز کر کے معروضی ادراک کو قائم بالذات سمجھ بیٹھے۔ غرض حیاتیات کا صریح اقتضا ہے کہ سائنس کے اصول پر دوبارہ غور کیا جائے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ انسانی فکر مادی عناصر کے امتزاج کا نتیجہ نہیں۔ اس سے الگ کچھ اور ہے اور اس کی کنہ و حقیقت دریافت کر لینا علم الحیات کی دسترس سے باہر ہے چنانچہ (SAMUEL) اس موضوع پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

یہ کہنا بھی غلطی ہے کہ چونکہ علم الحیات، طبیعیات اور کیمیا کے ذرائع اختیار کر کے ایک خاص حد تک کامیابی حاصل کر چکا ہے اس لئے اس حد سے آگے بھی وہی ذرائع استعمال کئے جائیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس علم کی کامیابی جس نقطہ پر جا کر رک گئی ہے اس سے آگے ایک نیا موضوع شروع ہو جاتا ہو جو اُن (سابقہ) ذرائع کی حدود سے آگے ہو۔

یہاں تک ہم نے یہ دیکھ لیا کہ فکر انسانی ارتقا کے میکانیکی عمل کا نتیجہ نہیں اس سے ہم کم از کم اس نتیجہ تک تو ضرور پہنچ گئے کہ پیکر انسانی میں کسی غیر مادی شے کا انکار محض اس بناء پر نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا وجود عالم طبیعیات یا علم الحیات کی رُو سے میکانیکی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔ پیکر انسانی میں اس قسم کی چیزوں میں سے ایک تو قوت فکر (INTELLECT) ہے جسے ہم نے علم استدلال کے مرکز سے تعبیر کیا ہے اور جسے عرف عام میں دماغ (BRAIN) کہا جاتا ہے۔ لیکن انسان کی دنیا میں اس کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جس کا دائرہ استدلالی قوت کی حدود سے ماورا رہے۔

لے دماغ سے مفہوم کا سہ سر میں مادی خلیات (CELLS) کا مجموعہ (بھیجا) نہیں بلکہ قوت عقل و فکر ہے۔

قرآن کریم اس چھپی ہوئی دنیا کو نفس کہہ کر بکارتا ہے۔ فلسفہ اے آنا (SELF) یا خودی (EGO) کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اسی سے انسان کی شخصیت (PERSONALITY) عبارت ہے اور اسی سے اس کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) قائم ہے۔ جب آپ "میں" کہتے ہیں تو اس سے مفہوم نہ آپ کا گوشت پوست کا جسم ہوتا ہے نہ دماغ، بلکہ ان سے کچھ الگ۔ کائنات کا تمام ہنگامہ اسی نفس انسانی میں سے قائم ہے۔ اسی کا نام "نفس انسانی" ہے جس کا مقام استدلال کی دنیا سے آگے ہے۔ نفس انسانی کے متعلق سائنس کی دنیا ابھی کچھ بھی مفید مطلب معلومات بہم نہیں پہنچا سکی۔ اس باب میں بقول (SAMUEL)

"سائنس نے بہت تھوڑا فاصلہ طے کیا ہے۔ زندگی اور نفس کے متعلق آج ہمارا علم قریب قریب

اسی مقام پر ہے جہاں مادہ کے متعلق ہمارا علم تین چار صدیاں پیشتر تھا۔"

دل اور دماغ، نظردر فکر میں کیا باہمی تعلق ہے؟ یہ ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟ ان کے دواور عمل و نفوذ کے حدود کہاں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا ابھی تک کوئی جواب نہیں مل سکا۔ (واضح رہے کہ جب ہم دماغ کے بالمقابل دل یا فکر کے مقابل نظر وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کریں گے تو ان سے مراد انسانی نفس اور اس کی کار فرمائی ہوگی)۔ اس سلسلہ میں (SIR CHARLES SHERRING) رقمطراز ہے۔

دل اور دماغ کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اس کے متعلق نہ صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ عقدہ

لاہنخل ہے بلکہ یہ بھی کہ ہنوز وہ بنیاد بھی نہیں معلوم ہو سکی جہاں سے اس سوال کے حل کی

ابتدا کی جاسکے۔ (THE BRAIN AND ITS MACHANISM)

مسٹر (SULLIVAN) لکھتا ہے،

نظریہ ارتقاء اگرچہ ہمارے جسم کی ارتقائی منازل کے متعلق ہمیں بہت کچھ بتاتا ہے لیکن ہمارے نفس کی ارتقائی منازل پر بہت ہی کم روشنی ڈالتا ہے۔

(LIMITATIONS OF SCIENCE)

علم النفس (PSYCHOLOGY) یا اس کے دوسرے شعبے، نفس کی قوتوں اور اس کے شعوری مظاہر سے بحث کرتے ہیں لیکن نفس کی مابیت کے متعلق یہ علوم بھی کچھ نہیں بتا سکتے۔ مابیت تو ایک

طرف۔ لارڈ بلفور کے الفاظ میں۔

کوئی شخص نہ یہ محسوس کر سکتا ہے اور نہ اس امر کو حیطہ تصور میں لاسکتا ہے کہ طبعی تبدیلیاں کس طرح نفسیاتی تجارب پیدا کرتی ہیں۔

(THE FOUNDATION OF BELIEF)

لیکن کچھ نہ معلوم ہونے کے باوجود دنیا کے مغرب اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو چکی ہے کہ ”نفس یا آنا“ چند خصائص و رجحانات ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ شعوری زندگی کا ایک پیام گز اور شعوری سرگرمیوں کا نیا سرچشمہ ہے۔“

(MORAL VALUES AND THE IDEA OF GOD; BY DORLEY)

پروفیسر (EDDINGTON) جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اس موضوع پر بڑے دل کش انداز میں گفتگو کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”ہم نے اس سے پیشتر یہاں تک بحث کی ہے کہ ”بجلی کے ذرات کس طرح سمٹ سمٹا کر انسانی پیکر کی صورت اختیار کر گئے۔ لیکن ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ

لے (LORD BELFOUR) دوسرے مقام پر نفس انسانی کی مابیت کے متعلق جو کچھ لکھتا ہے وہ اسی کے الفاظ میں سنئے۔ وہ کہتا ہے۔

(AN "I" MUST HAVE CHARACTER QUITE APART FROM THE EXPERIENCES, ACTIVE AND PASSIVE, WHICH FILL HIS CONSCIOUS LIFE. HE MUST HAVE (OR BE) A SOUL - A SOUL WHICH IS SOMETHING MORE THAN AN ORGANISED COLLECTION OF CAPACITIES OR A PROCESSION OF PHYSICAL STATES - A SOUL WHICH IS NOT ONLY MERELY SUBSTANCE BUT HAS AN INDIVIDUALITY WHICH IS UNIQUE AND INDESCRIBABLE: THEISM AND THOUGHT -

لے ترجمہ کے بجائے مفہوم پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

انسان ان عناصر سے جن کے متعلق پہلے بحث کی جا چکی ہے، بالکل مختلف اور جدا گانہ شے ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شعور (CONSCIOUSNESS) نے ارتقائی منازل طے نہیں کیں..... لیکن یہ حقیقت کا ایک ایسا پہلو ہے جو ہماری مادی تحقیق و تفتیش کے دائرے میں نہیں آ سکتا یہاں سے مادہ اور روح کی ثنویت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایک طرف شعور ہے کہ وہ مختلف خیالات و کیفیات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ دوسری طرف مادی دماغ ہے جس میں سالمات و برقیات بگولہ کی طرح رقص کرتے رہتے ہیں۔ ان دونوں میں باہمی تضاد و تباہی بھی ہے اور عجیب و غریب قسم کا تطابق و توافق بھی۔ میکاکی تصویر جیات ہی کہے گا کہ جب ہمارے دماغ میں برقی سالمات رقص کرتے ہیں تو ان سے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ شعور انسانی، جذبات و خواہشات، آرزوؤں اور امنگوں اور حقوق و فرائض کی ایک نرالی دنیا اپنے اندر لئے ہے جن کے ادنیٰ سے اشارے پر دماغ کے تمام اجزائے لائی تجزی رقص کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں کے احوال و کوائف، طبیعیات کے پیمانوں سے نہیں ماپے جاسکتے، یہی پروفیسر فراگے چل کر لکھتا ہے کہ (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) "محسوسات کی دنیا میں ہم اشیاء کی حقیقت کے متعلق کچھ بھی علم نہیں رکھتے۔ ہم صرف ان اشارات (SYMBOLS) کو جانتے ہیں جو ہمارے حواس کے ذریعے ہمارے ذہن پر مرسم ہوتے ہیں۔ لیکن اس تمام کائنات میں ایک چیز ایسی بھی ہے جس کا ہمیں براہ راست علم ہے اور وہ ہے انسان کا قلب (MIND)۔ ہم "اشارات" سے اشیاء کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن اگر ہم ان اشارات کو اس حقیقت کی دنیا کے پس منظر کے سامنے رکھ دیں جس سے ہمارا قلب متعلق ہے، تو ہم اشیاء کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن خود قلب انسان کی حقیقت طبیعیات کے قوانین سے معلوم نہیں ہو سکتی اس لئے کہ یہ قوانین صرف "اشارات" تک جاسکتے ہیں۔ ان سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ لیکن جب زندگی شعور کے ساتھ متمسک ہو جاتی ہے تو ہم ایک بالکل جدا گانہ دنیا میں جا پہنچتے ہیں۔ یہ وہ دنیا ہے جس میں طبیعیات اور کیمیا کے اصول اسی طرح ناکام رہ جاتے ہیں جس طرح یہ کوشش کہ انسانوں کی جماعت پر گرامر کے قواعد و ضوابط کی مانند قوانین سے حکومت کی جائے۔"

لے اس ثنویت کا حل صرف قرآن پیش کر سکتا ہے۔ لیکن اس بحث کا مقام یہ نہیں۔

غور فرمایا آپ نے کہ مغرب کے ”مادہ پرست“ نفسِ انسان کے متعلق کس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں؟ اور دیکھتے! پروفیسر (C. LLOYD MORGAN) نے ”ارتقائے نفس“ کے عنوان سے ایک محققانہ مقالہ لکھا ہے جس کے اخیر میں وہ رقمطراز ہے:

میں اپنے اس عقیدہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ (نفس کے) اس ارتقار کو ایک ”نفسِ اعلیٰ“ (SUPER MIND) کا مظہر یا عکس سمجھنا چاہیئے۔ وہ ”نفسِ اعلیٰ“ جو ان تمام اشیاء کا خالق ہے جسے ہم ”جدید“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں اس ارتقائے نفس کے اندر یہی دیکھتا ہوں کہ اوپر سے نیچے اور ازل سے آخر تک ایک عظیم الشان اسکیم (تدبیر) عمل پیرا ہے۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ فطرت کی ہر شے میں یہ ارتقائی بالیدگی خدائی عاملیت (DIVINE AGENCY) کا ہی مظاہرہ ہے۔ اور چونکہ اس سلسلہ ارتقار میں نفسِ انسانی بلند ترین مقام پر ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ارتقائے نفس انسانی اس ”نفسِ اعلیٰ“ کی عاملیت کا آئینہ ہے۔ لیکن (جیسا کہ میرا عقیدہ ہے) ”نفسِ اعلیٰ“ لا محدود اور زمان کی قیود سے بے نیاز ہے اس کی ذات کے لئے ”ازل“ اور ”آخر“ اور ”جدت“ و ”اعادہ“ کے الفاظ ان معانی میں استعمال نہیں کئے جاسکتے جن معانی میں یہ نفسِ انسانی سے بحث کرتے وقت استعمال ہوتے ہیں..... وہ ”روحِ خالق“ جو قدیم اور واجب الوجود ہے ارتقار کی پیداوار نہیں بلکہ وہ ایسی ذات ہے کہ خود ارتقار کی برہمتی ہوئی صورت اس کا پرتو ہے۔

دوسرے مقام پر لکھا ہے:

میرا یہ عقیدہ ہے کہ جانداروں میں یہ ارتقائے نفس، خدائے تعالیٰ کی قوتِ تخلیق و ہدایت (CREATIVE AND DIRECTIVE POWER OF GOD) کا رہن منت ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ”ارتقائے نفس“ کی ترکیب کا اطلاق خود خدائی ذات پر بھی ہوتا ہے۔ نہیں۔ نفس یا روح خداوندی قدیم ہے اور زمان و مکان کی حدود سے بالا۔ (THE GREAT DESIGN)

اقتباس ہالامیں ”خداے تعالیٰ کی قوت تخلیق و ہدایت“ (CREATIVE AND DICTATIVE POWER OF GOD) کے الفاظ کو سامنے رکھتے اور پھر قرآن کریم کی ان آیات جلیلہ پر غور کیجئے جن میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا ذکر ہے اور سوچئے کہ کیا یورپ کا مادہ پرست سائنس کی تحقیقات کی رُو سے انہی نتائج تک نہیں پہنچ رہا جن کی طرف قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پیشتر اشارہ کیا تھا؟ سورہ طہ میں ہے کہ فرعون کے سوال کے جواب میں کہ (فَمَنْ رَبُّكُمَا يَمُوسَىٰ) اے موسیٰ! تم دونوں بھائیوں کا رب کون ہے؟ حضرت موسیٰ نے فرمایا:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ (۲۰/۵۰)

کہا کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اس کی پیدائش عطا کی اور پھر اسے (اس کے کمال تک پہنچنے کی) راہ بتائی۔

۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا:

الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِي بَيْنَ (۲۶/۷۸)

اللہ وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور پھر وہی میری راہنمائی کرتا ہے۔

سورہ اعلیٰ میں ہے:-

الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ ۖ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ (۸۴/۳-۲)

خدا وہ ہے جس نے انسان کی تخلیق کی اور اس میں صحیح صحیح توازن رکھ دیا۔ پھر اس کی زندگی کے لئے پہلے مقرر کر دیئے اور ان کی طرف اس کی راہ نمائی کر دی۔

ان آیات میں خَلَقَ اور هَدَىٰ پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ پروفیسر مارگن کے الفاظ (CREATIVE AND DICTATIVE POWER

کیا انہی قُدرِ انی الفاظ کا ترجمہ نہیں! غور کیجئے کہ قرآن علم انسانی کو کن بلندیوں تک لے جاتا ہے؟ اگر ان محققین مغرب کے سامنے کہیں قرآن ہوتا تو ان کی راہیں کس قدر آسان ہو جاتیں؟ ان کی حالت یہ ہے کہ مدتوں غلط راستوں پر چلتے رہتے ہیں اور پھر ہزاروں ٹھوکریں کھا کر صحیح راہ پر آتے ہیں۔ اگر تلاشی حقیقت کے اس بحر بے کنار میں قرآنی روشنی کے مینار ان کے سامنے ہوں تو ان کا ہر قدم منزل کی طرف بڑھے اور انہیں اندھیرے میں ٹکریں نہ مارنی پڑیں (لیکن اس بحث کا یہ مقام نہیں)۔

نفس انسانی کے متعلق جو کچھ گذشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے، اسے بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ حیات، ربانی توانائی (DIVINE DNERGY) کی مظہر ہے جو عالمگیر ہے اور ساری کائنات کی رگ و پے میں برقی تپاں کی طرح جاری و ساری۔ جب حیات، شعور (CONSCIOUSNESS) سے متعارف (IDENTIFY) ہوتی ہے تو اس سے انسانی انا (HUMAN EGO) متشخص ہوتا ہے۔ شعور، انسان کی انفرادی (INDIVIDUAL) شے ہے۔ میرے دکھ اور درد کے احساس (FEELING) میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ دوسرے میرے ساتھ ہمدردی کر سکتے ہیں۔ میرے درد کا مداوا سوچ سکتے ہیں۔ لیکن میرے درد کے احساس میں شرکت نہیں کر سکتے۔ چونکہ نفس انسانی (EGO) حیات اور شعور کے تمسک و تعارف سے متشخص ہوتا ہے اس لئے یہ بھی انفرادی ہوتا ہے۔ اسی انفرادیت کی رُو سے یہ اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔ شعور انسانی میکانیکی عمل ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس لئے نفس انسانی بھی طبعی ارتقاء کی تخلیق نہیں۔ پیکر انسانی اس ایگو کا ذریعہ اظہار (VEHICAL) ہے اصل انسان یہی ایگو ہے۔

مستی زیادہ می رسد و از ایاغ نیست

ہر چند بادہ نتواں خورد بے ایاغ

ایگو کی انفرادیت کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ اس لئے پیکر بدلنے سے کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔ شعور انسانی کے ظرف میں ایسی وسعتیں پیدا کی جاسکتی ہیں کہ حیات جس انداز میں مکمل طور پر اپنا نمود چاہتی ہے یہ اس کے قابل ہو جائے اسی کا نام استحکام خودی ہے۔

جب حیات اور شعور اپنی لامتناہیت (INFINITY) میں متعارف ہوتے ہیں تو اسے (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) آخری ایگو (ULTIMATE EGO) کہا جاتا ہے۔ وہ اس آخری ایگو کی بحث کے بعد لکھتے ہیں۔

ربانی توانائی کا ہر ذرہ خواہ اپنے وجود کے اعتبار سے کیسا ہی ناچیز کیوں نہ ہو ایک

ایگو خودی ہے۔ لیکن خودی کی نمود (EPRESSION) کے مختلف

مدارج ہیں تمام دائرہ ہستی میں، خودی کا تدریجی ارتقار جاری و ساری ہے۔ حتیٰ کہ پیکر انسانی میں پہنچ کر یہ اپنی تکمیل حاصل کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشہر آئن کریم آخری ایغو (UL TIME EGO) کو انسان کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب بتاتا ہے۔

(خطبات صفحہ ۶۸)

انسانی ایغو اپنے وجود، انفرادیت اور اختیار و ارادہ کی بنیاد پر عجیب و غریب صفات و خصوصیات (ATTRIBUTES AND CHARACTERS) کا حامل ہوتا ہے۔ جوں جوں اس میں استحکام اور وسعت پیدا ہوتی جائے، اس کی خصوصیات آخری ایغو کی خصوصیات و صفات سے مشابہ ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن اگر اس میں ضعف اور اضمحلال پیدا ہوتا جائے تو یہ درجہ انسانیت سے گر کر برباد ہو جاتا ہے۔ جن اعمال سے خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے انہیں اعمالِ صالحہ کہا جاتا ہے۔ جن سے اس میں ضعف آتا ہے وہ سیئات ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ:

دنیا میں دکھ پہنچانے والے یا آرام دینے والے اعمال نہیں ہوتے۔ صرف خودی کو مستحکم کرنے والے یا اسے تحلیل (DISSOLVE) کرنے والے اعمال ہوتے ہیں۔ یہ اعمال ہی ہیں جن سے اس میں مستقبل کی زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آ جاتا ہے..... لہذا انفرادی بقا ہمیں بطور استحقاق نہیں مل سکتی۔ یہ ذاتی جدوجہد سے حاصل کرنی پڑتی ہے۔ انسان اس کے لئے امیدوار ہوتا ہے۔

(خطبات، صفحہ ۱۱۳)

ان تصریحات کو سامنے رکھتے اور گذشتہ صفحات میں نفس انسانی کے متعلق جو کچھ مغربی محققین کے خیالات سے مقبوس کیا گیا ہے اس پر پھر غائرانہ نگاہ ڈالنے بات واضح ہو جائے گی۔ (نفس کے متعلق مزید تفصیلات میں جانے کا یہ مقام نہیں جس سلسلہ میں یہ بات چھڑی ہے اس کے لئے اتنے سے اشارات کافی سمجھے جاتے ہیں)۔

گذشتہ صفحات میں یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی ہے کہ انسان کے پاس عقل (یعنی علم استدلالی) کے علاوہ کچھ اور بھی ہے جس پر عقل کے قوانین حکمرانی نہیں کر سکتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا انسانی زندگی کے اس دائرے میں (جو عقل کی فرمانبرداری سے باہر ہے) ادراک حقیقت کا امکان ہے؟ اس دائرے کے بلند ترین مقام کا نام "نفس انسانی" ہے (HUMAN EGO)۔ لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ انسان

ہی نہیں بلکہ حیوانات تک سے بعض افعال اس قسم کے سرزد ہوتے ہیں جو عقل کے تابع نہیں ہوتے۔ اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان سے جو ایسے اعمال سرزد ہوتے ہیں جو اس کی عقل کے تابع نہیں ہوتے وہ بالضرور اس کے نفس ہی کے مظاہر ہوتے ہیں۔ لہذا ہمیں پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس قسم کے افعال (جو عقل کی فرمانبرداری سے باہر ہیں) کس کس شعبے سے سرزد ہوتے ہیں۔ اس باب میں ہمارے سامنے سب سے پہلے وہ چیز آتی ہے جسے جبلت (INSTINCT) کہتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ وہ دائرہ ہے جس میں استدلال کو کوئی دخل نہیں۔ بلکہ اس کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب عقل دشوور ہنوز بیدار بھی نہیں ہوتے۔ انسان کے علاوہ باقی کائنات میں جبلت ہی چیز ہے جسے عام طور پر قوانین فطرت کہا جاتا ہے جن کی رُو سے یہ تمام سلسلہ ایک نظم و ضبط کے تحت چلا جا رہا ہے۔ پانی جب تک سیال ہے لشیب کی طرف بہتا ہے جس قالب میں چاہیے ڈھل جاتا ہے۔ ایک خاص درجہ حرارت میں پہنچ کر بھاپ بن کر اڑنے لگ جاتا ہے۔ تفریط کی طرف آئے تو ایک خاص مقام پر سردی سے منجمد ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی جبلت ہے۔ یہی اس کی "فطرت" ہے۔ آگ ہمیشہ حرارت پہنچاتی ہے۔ پتھر کو ادھر اچھالنے ہمیشہ نیچے کی طرف آتا ہے۔ اس کے بعد زندگی کی دنیا کی طرف آئے۔ بٹ کا بچہ انڈے سے نکلے ہی پانی کی طرف دوڑتا ہے۔ لیکن مرغی کا بچہ پانی میں اپنی ہلاکت دیکھتا ہے۔ شیر بھوکوں مر جائے گا لیکن کبھی گھاس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ بکری کا بچہ جان طلب کیوں نہ ہو کبھی گوشت کے پاس تک نہیں آئے گا۔ یہی ان کی جبلت ہے جس کی خلاف ورزی کا انہیں اختیار نہیں۔ ہر ایک اس قانون کی اطاعت کر رہا ہے۔ وَ لِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (۱۶/۲۹)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے اللہ کے حضور سجدہ کرنے کا ہے كُلُّ لَہٗ قَانِثُوْنَ ہ سب اسی کے قانون کے تابع ہیں۔ جہاں تک انسان کی طبعی زندگی کا

لے ہیں اس مقام پر مسئلہ تعین اور غیر تعین (DETERMINISM AND INDETERMINISM)

کی اس کشمکش میں نہیں الجھنا چاہیے جو اس باب میں یورپ کے مفکرین و محققین کی بحث و تمحیص کامرکز بن رہی ہے۔ ہم صرف اس عمومی حالت کا ذکر کر رہے ہیں جو ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ (نہ کہ برقیات کے قانون حرکت و گردش کا)۔

تعلق ہے۔ اس کا بچہ بھی ان چیزوں کو جبلی طور پر اختیار کر لیتا ہے۔ انسان کا بچہ بھی پیدا ہوتے ہی اپنی خوراک کے سرچشموں کی طرف لپک کر جاتا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ اُس نے عقلاً یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسے ایسا کرنا چاہیئے بلکہ اس لئے کہ اُس کے اندر خود بخود بلا استدلال "اس قسم کی ایک امنگ (URGE) پیدا ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کیا جہلت اس مسئلہ کا حل پیش کر سکتی ہے جو ہمارے پیش نظر ہے؟

طبعی زندگی کے قوانین | جہاں تک انسان کی طبعی زندگی کا تعلق ہے۔ یہ بھی حیوانات کی طرح طبعی قوانین کے تابع ہے۔ بھوک، پیاس، ٹھکان، یمنہ، سلسلہ تولید وغیرہ میں دونوں پر ایک ہی قسم کے قوانین حاوی ہیں۔ لیکن انسان کو ساتھ ہی اختیاردارادہ بھی دیا گیا ہے۔ اگرچہ اپنی طبعی زندگی میں یہ اپنے اختیاردارادہ کو زیادہ استعمال میں نہیں لاتا کہ قوانین طبعی کی خلاف ورزی کی سزا فوراً مل جاتی ہے۔ بایں ہمہ اس کے اختیاردارادہ کے مظاہرات ہر وقت ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ انسان کا بچہ بھی اپنی پیدائش کے ساتھ ہی اپنی خوراک کے سرچشموں کی طرف اسی طرح لپک کر جاتا ہے جس طرح بکری کا بچہ۔ لیکن انسان کے بچہ کی ساتھ ہی یہ حالت بھی ہے کہ جو چیز اس کے سامنے آئے۔ مفید ہو یا مضر، حیات آفریں ہو یا ہلاکت انگیز، بلا تکلف منہ میں ڈال لیتا ہے۔ اسی لئے جب بچہ ذرا گھٹنیوں چلنے لگتا ہے تو اس کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کبھی آگ میں ہاتھ ڈال دیا۔ کبھی پانی میں ڈکیاں لینے لگا۔ کہیں اس چیز کو نگل گیا۔ حیوانات کے بچوں کی یہ کیفیت کبھی نہیں ہوتی۔ اور ایک بچہ پر ہی کیا موقوف ہے۔ انسان کے ساتھ بڑھاپے تک تمام سفر حیات میں قدم قدم پر یہی ہوتا ہے۔ ساری زندگی خلاف فطرت اور اس کا نتیجہ ہزاروں قسم کی بیماریاں۔ ہماری اپنی تو یہ حالت تھی ہی۔ ہم نے جن جانوروں کو اپنے قریب لا کر گھریلو (DOMESTIC) بنایا۔ اپنے اغراض و مقاصد کی خاطر آہستہ آہستہ ان کی طرز زندگی کو بھی ایسا بدلا کہ انہیں بھی اپنے جیسے عواض آلام کا شکار بنا دیا۔

جب انسان کا اپنی طبعی زندگی میں یہ عالم ہے تو اس کی عائلی، معاشری، تمدنی، معاشی، سیاسی زندگی میں جو کیفیت ہوگی وہ محتاج تفصیل نہیں۔ کائنات کی دیگر اشیاء اور انسانی زندگی کا ہی فرق ہے جسے ان بصیرت افروز الفاظ قدسی میں بیان کیا گیا ہے۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَن فِي السَّمَوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ
وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَ
كَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ۚ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۚ وَمَن يُهِنِ اللَّهُ
فَمَا لَهُ مِن مُّكْرِمٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ۝ (۲۲/۱۸)

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ آسمان اور زمین کی ہر چیز، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت،
چوہائے اور بعض انسان بھی خدا کے حضور میں سجدہ ریز ہیں۔ (اسی کے وضع کردہ قوانینِ فطرت
پر عمل پیرا ہو کر اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا مظاہرہ کر رہے ہیں)۔ بعض انسان ایسے
بھی ہیں جو قانونِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں اور (بہی وہ) لوگ ہیں جن پر عذابِ خداوندی
مقرر ہو چکا ہے (ان کے لئے کامیابی و کامرانی کے بجائے ہر قسم کی ذلت و رسوائی منتظر ہے)
اور (ظاہر ہے کہ) جسے خدا کا قانون رسوا کر دے تو اس کے لئے عزت دینے والا (کون ہو سکتا
ہے) کوئی بھی نہیں۔ (بہی خدا کا قانون ہے جو اٹل ہے۔ نہ یہ کسی کی سفارش سے تبدیل ہو سکتا
ہے نہ کسی کے جبر سے)۔ یہ تو انہیں خدا کے اقتدارِ مطلق کی رُوسے وضع ہوئے ہیں۔

ضمیر کی آواز | لیکن جو سوال ہمارے سامنے ہے اس میں حیوانی زندگی چندال اہمیت نہیں رکھتی۔
اس سوال کی تو ابتدا ہی منزلِ انسانیت سے ہوتی ہے۔ لہذا دیکھنا یہ ہے کہ کیسا

وادیِ انسانیت میں جہالت کی راہنمائی کافی ہو سکتی ہے؟ تمدنی زندگی میں انسانی معاملات، اخلاقیات
(ETHICS) کے دائرہ میں آتے ہیں، اور اخلاقیات کے دائرہ میں جہالت کا نام ضمیر (CONSCIENCE)

کی آواز ہے۔ لہذا بات یہاں تک پہنچی کہ کیا تنہا "ضمیر کی آواز" اس قابل ہے کہ انسان کی صحیح راہ نمائی کر سکے؟
کیا یہ خیر و شر کی تعین و تفریق کا قابلِ اعتماد معیار قرار پاسکتی ہے؟ کیا اور اک حقیقت اس کے بس کی
بات ہے؟

یہ امر یہی ہے کہ اخلاقی مقتضیات انسان سے شروع ہوتے ہیں۔ ایک بکری کی جہالت میں ہے کہ
وہ گھاس کھائے۔ گوشت کی طرف نظر اٹھا کر بھلی نہ دیکھے۔ لیکن یہ اس کی جہالت میں نہیں کہ وہ گھاس
اپنے ہی مالک کے کھیت سے چرے۔ دوسرے کے کھیت میں نہ جا گھسے۔ یہ تقاضا انسان سے شروع ہوتا
ہے۔ عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کے اندر ایک قوتِ تمیز موجود ہے جو اسے بتا دیتی ہے کہ جائز کیا

ہے اور ناجائز کیا؟ اس قوت تمیز کا نام ”ضمیر“ (CONSCIENCE) رکھا گیا ہے۔ اس کو انسان کے اندر کی آواز یا دل کا فتویٰ کہا جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقعہ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت تمیز ہے جو اسے جائز اور ناجائز کا فرق بتا دے! یہ بات بادی تعمق سمجھ میں آجائے گی کہ انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں جو حق اور باطل، خیر اور شر، جائز اور ناجائز میں تمیز کر سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کے اندر سے ایک آواز ضرور اٹھتی ہے جو اسے بعض کاموں سے روکتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ آواز حق اور باطل کی تمیز بھی کرتی ہے۔ مشاہدہ اس کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حق اور باطل مطلق اقدار (ABSOLUTE VALUES) کا نام ہے، اضافی اقدار (RELATIVE VALUES) کا نام نہیں۔ یعنی حق کے یہ معنی نہیں کہ وہ ایک انسان کے لئے حق ہو اور دوسرے کے لئے حق نہ ہو۔ اگر انسان کے اندر کوئی ایسی قوت ہے جو حق و باطل میں تمیز کر سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ ہر انسان کے اندر سے یکساں اٹھنی چاہیے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ گوشت کھانے والے خاندان کے بچے کے سامنے جب گوشت آتا ہے تو اس کی ضمیر اسے بالکل نہیں ٹوکتی۔ لیکن ایک سبزی خور گھرانے کے بچے کے سامنے گوشت کا نام آجانے سے اس کی طبیعت ابا کرنے لگتی ہے۔ جرائم پیشہ قبائل (مثلاً ٹھگوں) کے بچے بلا تکلف انسان کی جان لے لیتے ہیں اور اس میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن جینیوں کا بچہ کیروں کو روک کر کبھی ایذا نہیں پہنچاتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ نفس تو امہ برائی سے روکتا ہے۔

وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (۷۵/۲)

اور نہیں۔ میں انسان کے احساسِ ندامت کو شہادت میں پیش کرتا ہوں۔

لیکن اُسی برائی سے جسے وہ برائی سمجھتا ہے۔ اس نفس میں لوامیت کا جو ہر تو ہے لیکن وہ اسی چیز کے خلاف ملامت کرتا ہے جسے اس نے (مختلف اثرات کے ماتحت) قابلِ ملامت سمجھ رکھا ہے۔ لہذا جس چیز کو ”ضمیر کی آواز“ کہا جاتا ہے۔ وہ حق و باطل کی تمیز کا معیار نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ”آواز خارجی اثرات سے متاثر ہوتی ہے۔ (SAMUEL) اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

اگر یہ صحیح ہو تاکہ انسان کے اندر ایک ایسی فطری جبلت ہے جو (تمام اثرات) سے آزاد ہے اور حق و باطل کے فیصلہ میں کبھی غلطی نہیں کرتی تو نیک عملی کے ہر معاملہ میں

تمام انسان ہمیشہ متفق ہوا کرتے اور آج بھی متفق نظر آتے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی ہم آہنگی نہ کبھی پہلے ہوئی ہے اور نہ آج ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی آدمی کا یہ کہنا کہ میں نے فلاں بات کو نہایت دیانتداری سے حق سمجھ کر اختیار کیا ہے "اس بات کو فی الحقیقت حق نہیں بنا سکتا۔

لہذا جس چیز کا نام ضمیر رکھا جاتا ہے وہ ان اثرات سے مرتب ہوتی ہے جو انسان غیر شعوری طور پر وراثت، ماحول، تربیت اور تعلیم سے اخذ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا اپنا وجود کچھ نہیں ہوتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ضمیر (INTERNALISED SOCIETY) کا نام ہے۔ لہذا ضمیر میں یہ صلاحیت کہاں ہو سکتی ہے کہ وہ حق اور باطل، خیر اور شر، غلط اور صحیح کا امتیاز کر کے بتا دے۔



ذوق | جبلت کے بعد ہمارے سامنے علم غیر استدلالی کا ایک اور میدان آتا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا۔ ایک شخص کے دو بچے ہیں۔ وراثت و ماحول کے اعتبار سے انہیں (قریب قریب) یکساں ہونا چاہیے۔ لیکن ان میں سے ایک طبعاً (ان خود) شاعری کا ذوق رکھتا ہے اور دوسرے کو اس سے قطعاً کوئی لگاؤ نہیں۔ ایک شخص کو آپ دیکھیں گے کہ کوئی عمدہ سی تصویر اس کے سامنے آجائے وہیں ٹھنک کر رہ جائے گا اور دنیا جہاں سے بے خبر، پیروں کھڑا رہے گا۔ لیکن باقی دنیا اس کے پاس سے یوں گذرتی جائے گی گویا وہاں کوئی چیز وجہ جاذبیت نہیں۔ دقت علی ہذا۔ یہ "ذوق کی دنیا" استدلال کی دنیا سے بالکل الگ ہے۔ علم الحیات کی اس وقت تک کی تحقیقات یہ نہیں بتا سکیں کہ ذوق کا یہ اختلاف کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ کسی اچھے گانے والے کے ایک الاپ سے آپ کے رگ و پے میں کیف و سرور کی ایک دنیا رقصاں و جنباں نظر آتی ہے لیکن آپ کسی دوسرے کو کبھی نہیں سمجھا سکتے کہ ایسا کیوں اور کس طرح ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ فن موسیقی کے بعض قواعد و اصطلاحات کو سمجھا سکیں گے۔ لیکن اس دوسرے پر وہ اثر کبھی مرتب نہیں ہو سکے گا جو آپ پر ہوا۔ اس کے اصرار پر آپ یہی کہیں گے کہ

ذوق میں بادہ ندانی بخدا تانچشی ہا

کیف و سرور کی اس دنیا کے جرمات نشاط و دروہجت آئیں، عقل کے پیانوں سے نہیں ماپے جاسکتے۔ جس کا تعلق ذوق سے ہے؟

مختلف افراد میں 'اختلاف ذوق کی وجہ کیا ہے' اس کی بابت 'انسان کی طبعی زندگی سے متعلق علوم ابھی تک کچھ نہیں بتا سکے۔ دورِ حاضر میں، علم النفس کے ماہرین نے ان امور کو اپنی تحقیق و تفتیش کی آماجگاہ بنایا ہے، لیکن اس باب میں حتمی طور پر وہ بھی کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ پائے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسانی ہمتہ ہنوز اپنے گہوارہ میں ہوتا ہے اور بولنا بھی نہیں سیکھتا، وہ اپنے ماحول کے نقوش اپنے تحت الشعور میں جذب کئے چلا جاتا ہے اور اس طرح اپنے عادات و خصائل اور سیرت و کردار کی رُو سے وہ کچھ بن چکتا ہے جو کچھ اسے آگے چل کر بننا ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ اس کی مستقبل کی زندگی کی بنیاد یا بچپن کے ابتدائی دو تین سال میں رکھی جا چکتی ہیں۔ ان کا اندازہ یہ ہے کہ اختلاف ذوق بھی انہی غیر شعوری نقوش کے مظاہر کا نام ہے۔

لیکن انسانی (یا انفرادی) ذوق کی کیفیت و ماہیت کچھ ہی ہو، یہ واضح ہے کہ جبلت و ضمیر کی طرح یہ چیز بھی ادراک حقیقت کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔



وجدان | ذوق کے علاوہ، ایک اور شے بھی ہے جس کا تعلق (بظاہر) استدلالی دنیا سے نہیں۔ اسے وجدان یا (INTUITION) کہا جاتا ہے۔ مثلاً آپ کے سامنے کوئی معاملہ آتا ہے۔ آپ استدلال کی کڑیاں عبور کئے بغیر، یونہی بلا سوچے سمجھے کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں اور وہ اکثر صحیح نکلتا ہے۔ شاعری کی دنیا میں جسے آند کہتے ہیں اس کا تعلق بھی وجدان سے ہے۔ اسی کے لئے غالب کہتا ہے کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

غالب صریح خامہ نوائے سروش ہے

عرب اسے 'إِنْف' کہہ کر پکارتے ہیں۔ فکری دنیا ابھی تک وجدان کے متعلق بھی نہیں بتا سکی کہ اس کی ماہیت کیا ہے لیکن ہمارے دور کا وجدان کا سب سے بڑا نمونہ 'برگسان' اسے (A HIGHER KIND

OF INTELLECT) ایک بلند نوع فکر۔ ہی قرار دیتا ہے جو فکری ارتکاز (CONCEN

TRATION) یا ممارست کا غیر شعوری نتیجہ ہوتی ہے۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ انسان جب بات کرتا ہے

تو اس کے اندر کئی ایک صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں اور وہ بہ عمل آتی ہیں وہ پہلے سوچتا ہے کہ مجھے کیا کہنا ہے۔

پھر اس کے لئے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے۔ پھر ان الفاظ میں ایک ربط پیدا کر کے انہیں فقروں کی لڑی میں پروتا ہے۔ اس کے بعد ان فقروں کو زبان سے ادا کرتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ انسان کو ایک فقرہ بولنے کے لئے کس قدر کاوش کرنی پڑتی ہے۔ جب کوئی بچہ پہلے پہل بولنا سیکھتا ہے تو اس کی یہ کاوش نمایاں اور محسوس طور پر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ لیکن آپ کسی شعلہ نوا مقرر کو دیکھئے۔ وہ دو تین سو لفظ فی منٹ کی رفتار سے بولتا ہے اور گھنٹوں مسلسل بولتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے موضوع کے متعلق سوچتا بھی ہے۔ اس کے اظہار کے لئے الفاظ کا انتخاب بھی کرتا ہے۔ ان لفظوں کو فقروں میں مربوط بھی کرتا ہے۔ پھر ان فقروں کو زبان سے اس طرح ادا کرتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ تلفظ نہ بگڑنے پائے بلکہ جن جذبات کے اظہار کا وہ ذلیہ ہیں، آواز کے زیر و بم اور شگفت و گداز سے ان کی بھی پوری پوری نمود ہوتی چلی جائے۔ وہ یہ سب کچھ برقی رفتاری کے ساتھ کئے چلا جاتا ہے اور سامعین تو ایک طرف، خود اسے بھی اس کا علم و احساس نہیں ہوتا کہ وہ کب سہ چتا ہے۔ کس طرح الفاظ کا انتخاب کرتا ہے۔ کب ان لفظوں کو فقروں کے قالب میں ڈھالتا ہے اور پھر کس طرح دریا کی سی روانی کے ساتھ انہیں ادا کئے چلا جاتا ہے۔ اس کے اس عمل میں کہیں فکری کاوش نظر نہیں آتی۔ لیکن ہوتا یہ سب کچھ فکری کاوش ہی کی رو سے ہے۔ فکری کاوش میں مہارت سے انسان میں اس قسم کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ جب اپنی توجہ کو کسی موضوع پر مرکوز کرتا ہے تو غیر شعوری طور پر اس کے ذہن کی مشینری کے مختلف پرزے بیک وقت حرکت میں آ جاتے ہیں اور اس تیزی سے حرکت کرتے ہیں کہ فکر کی عام سست خرابی اس حرکت کا احساس نہیں کر سکتی۔ بعینہ جس طرح پانچ ہزاری سیکنڈ کی رفتار سے گردش کرنے والے پیئ کی حرکت تیز سے تیز نگاہ بھی محسوس نہیں کر سکتی۔ وہ ساکن نظر آتا ہے۔ دور حاضر کے علم النفس کی تحقیق یہ ہے کہ ہماری معلومات، نفس غیر شعوری کے ریکارڈ روم سے ابھر کر شعور کی سطح پر آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ شعور کی مشینری کی رفتار جس قدر تیز ہوگی اسی قدر سرعت کے ساتھ یہ ذخیرہ شعور کی سطح پر آتا جائے گا۔ اور (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) اگر اس مشینری کی حرکت کی رفتار برق پائے تو شعور کو اس کا احساس بھی نہیں ہوئے پاتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات اسے یاد بھی نہیں پڑتا کہ وہ معلومات اسے کب حاصل ہوئی تھیں۔ فراموش شدہ حکایتیں، زیادہ رفتہ واقعات و حوادث، طاق نسیاں کی زینت وادہ تشبیہات و تمثیلات، فضا کی پہنائیوں میں گم گشتہ اشعار و اقتباسات، یوں سامنے آتے چلے جاتے ہیں گویا ان کا کہیں سے ”نزل“ ہو رہا ہے۔

حالانکہ ان کا کہیں خارج سے نزول نہیں ہوتا: تحت الشعور کی گہرائیوں سے صعود ہوتا ہے۔ اسی کو (عصر حاضر کی نفسیاتی تحقیقات کی رُو سے) وجدان کہا جاتا ہے۔ لیکن وجدان کی ماہیت کچھ بھی ہو یہ ظاہر ہے کہ یہ ملکہ بھی ادراک حقیقت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

نابغہ | جس شخص میں وجدانی کیفیت زیادہ شدت سے رونما ہوا اسے نابغہ (GENIUS) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ نابغہ میں یہ خصوصیات کس طرح اس انتہا تک پہنچتی ہیں: یہ معمہ بھی دنیائے سائنس میں ہنوز محتاج کلید ہے۔ علمائے علم الحیات (BIOLOGIST) ایسے لوگوں کے دماغ کی کھوپڑیاں لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان کے بھیجے کے خلیات (CELLS) کی ساخت اور امتزاج کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ حضرات جب ابھی تک یہی معلوم نہیں کر سکے کہ انسان میں خود فکری صلاحیت (INTELLECT) کہاں سے آتی ہے یا کس طرح پیدا ہوتی ہے تو یہ نابغہ کی خصوصی صلاحیت کی کنہ و ماہیت کے متعلق حتیٰ طور پر کیا کہہ سکیں گے؟ وہ اس وقت تک اس سلسلہ میں جو کچھ کہہ سکے ہیں فقط اتنا ہے کہ یہ ایک ”فجائی ارتقاء“ (EMERGENT EVOLUTION) ہے جو میکا نیکی سلسلہ ارتقاء کے حدود سے باہر ہے۔

تیس سال کے گہرے تجربہ نے اس امر کے لئے بین ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر مخلوط نسل کے انسانوں کے اندر اس قسم کے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جن کے متواتر خصائص (اپنے آباء و اجداد سے) بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ ان افراد کو (MUTANTS) یا (SPORTS) کہا جاتا ہے۔

(THE NATURE OF LIVING MATTER; BY L. HOG BEN)

لے یہ (SPORTS) صرف نوع انسانی ہی میں پیدا نہیں ہوتے بلکہ نباتات اور حیوانات میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ عام طور پر ایک پھول کے بیج سے ایک ہی قسم کے پھول پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسی بیج سے ایک الگ قسم کا پھول پیدا ہو جائے اسے SPORT کہتے ہیں۔ اور ارباب ذوق اس کی تلاش میں رہتے ہیں۔

پروفیسر (TAYLOR) اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

ان تمام اسباب و علل کا جن سے کوئی شے وجود پذیر ہوتی ہے، ہر ممکن محاسبہ کر لینے کے بعد بھی یہ حقیقت باقی رہ جاتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ شے اپنے نشو و نما کے بعد ایک ایسی خصوصیت کی مظہر بن جائے جو ان عناصر میں کہیں بھی نہ ہو جن سے اس شے نے ترکیب پائی تھی۔ یہ خصوصیت ایسی ہوتی ہے کہ ان تمام عناصر کی خصوصیات کا علم حاصل ہو جانے کے بعد بھی اس زوالی خصوصیت کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

(EVOLUTION IN THE LIGHT OF MODERN KNOWLEDGE)

(C. LLOYD MORGAN) اس باب میں لکھتا ہے۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ جس چیز کو تم فجائی EMERGENT کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا؟ تو اس کا مختصر جواب فقط اتنا ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے۔ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں، تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ ان کی خصوصیات کے متعلق ان کے ظہور پذیر ہونے سے پیشتر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

(EMERGENT EVOLUTION)

”فجائی ارتقا“ کے نظریہ اور اس کی تائید میں محسوس شواہد و نظائر نے کائنات کے متعلق ہیکائی تصور کی بنیادیں تک ہلا دی ہیں۔ اس مقام تحریر پہنچ کر اس حقیقت کے اعتراف کئے بغیر بن نہیں پڑتی کہ علت و معلول کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے مستثنیات آتے ہیں جنہیں صرف دست قدرت ظہور میں لاسکتا ہے۔

(SEMUEL)

ماہرین علم الحیات کی اس بے بسی کے پیش نظر اب علم النفس نے اس موضوع کو اپنی مڑگان کاوش و خدنگ تحقیق کا ہدف قرار دے لیا ہے۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ یہ خصوصیت درحقیقت وجدان ہی کی افراطی شکل ہے۔ جب ہم وجدان کے متعلق یقینی نقطہ تک پہنچ جائیں گے تو نابغہ کی خصوصیات کا مسئلہ بھی خود بخود حل ہو جائے گا۔

لیکن ان علوم کی تحقیقات کس نتیجہ پر پہنچیں، جس مقصد کے لئے ہم نے اس بحث کو چھیڑا ہے، وہ واضح ہے۔ یعنی یہ کہ ادراک حقیقت ایک نابغہ کے بس کی بھی بات نہیں۔ بلکہ نابغہ بے چارہ تو اس

باب میں عمومی ارباب فکر کے مقابلہ میں بڑی (DISADVANTAGEOUS POSITION) میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے خاص فن میں تو نابغہ ہوتا ہے لیکن زندگی کے دوسرے گوشوں میں بالکل کوراجالاکہ جسے "حقیقت" کا علم ہوا اسے ہر شعبہ حیات میں "نابغہ" ہونا چاہیئے، اس لئے کہ حقیقت ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے جسے مختلف حصوں میں بانٹا نہیں جاسکتا۔ جسے حقیقت کا علم ہوا اس کی یہ کیفیت نہیں سکتی کہ وہ زندگی کی کسی ایک شاخ پر توکل سرسبد ہو اور اس کی باقی شاخیں خزاں دیدہ ہوں۔ اصل یہ ہے کہ نابغہ کی نشوونما ایک طرفہ (LOP-SIDED) ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی زندگی میں اعتدال اور توازن نہیں ہوتا۔



نابغہ تو ایک طرف رہا، مختلف علوم (SCIENCES) بھی حقیقت کے ایک ایک رخ ہی کو دیکھتے ہیں اور جب وہ اسی اصول کے مطابق انسان کا مطالعہ کرتے ہیں تو اسے ایک مشین سمجھ کر اس کے الگ الگ پرزوں کے متعلق تحقیق کرتے ہیں۔ مشین کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کے مختلف پرزوں کو جوڑنے سے مشین مکمل ہو جاتی ہے لیکن انسانی زندگی کی یہ کیفیت نہیں۔ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ آپ سیرت کردار جذبات و عواطف، میلانات و رجحانات کا الگ الگ مطالعہ کریں اور پھر اس کے حاصل جمع کا نام فرد رکھ لیں۔ وہ فرد ان کے حاصل جمع سے مرکب نہیں ہوگا۔ انسانی ذات منفرد حقیقت کا نام ہے اور منفرد حقیقت نہ اجزائیں بٹ سکتی ہے اور نہ ہی اجزا کو یک جا کرنے سے وجود میں آسکتی ہے۔ علم ہی علم کہلائے گا جو ان کو تمام (MAN AS A WHOLE) کو دیکھے اور سمجھے۔ نابغہ کہ جس کی صلاحیتوں کی نشوونما صرف ایک طرفہ ہوتی ہے اس قابل ہی نہیں ہوتا کہ وہ انسان کا مطالعہ بنیاد پر کے یا حقیقت کے متعلق کاملہ علم حاصل کر سکے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، نبوغ و حقیقت وجدان ہی کی شدت کا نام ہے اور جب وجدان خود ادراک حقیقت نہیں کر سکتا تو نابغہ کے لئے یہ کیسے ممکن ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک نابغہ کی برق رفتار صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے لیکن وہ کاروان انسانیت کا راہ نمائیں بن سکتا۔



اس سے بھی آگے بڑھتے تو غیر استدلالی علم کا ایک اور میدان سامنے آتا ہے۔ یہ وہ میدان ہے

جس میں قوتِ خیال یا ارادہ (یا قوتِ نفس) کے مظاہر دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں اسے دنیاۓ تصوف کہا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ تصوف سے ذہن ایک خاص منظم ادارہ (SYSTEMISED INSTITUTION) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اس لئے بہتر ہے کہ ہم اسے

تصوف

اصطلاحی نام سے نہ پکاریں۔ انگریزی میں اسے (MYSTICISM) باطنیت کہا جاتا ہے۔ لیکن کسی اور مناسب لفظ کے فقدان کی وجہ سے ان کے ہاں باطنیت کا دامن نبوت کو بھی اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ اس لئے اس لفظ (MYSTICISM) سے ایک غلط فہمی کا اندیشہ ہے (اور یہ اندیشہ مزعومہ نہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جن حضرات نے ان امور کا مطالعہ صرف انگریزی زبان کی وساطت سے کیا ہے وہ تصوف اور نبوت کے خصائص و کوائف اور احوال و ظروف میں فرق نہیں کرتے۔ اور اس طرح ایک عجیب چکر میں اُبھے رہتے ہیں)۔ تصوف دراصل ”گیان دھیان“ کی دنیا ہے جس کا تعلق قوتِ نفس کے شواہد و مظاہر سے ہوتا ہے۔ سہولتِ بیان کی خاطر (بنا برمجوری) ہم اسے ”باطنیت“ کے لفظ سے تعبیر کریں گے۔ تاریخِ انسانی کے کسی دور پر نگاہ ڈالئے۔ اس علم کے مظاہر ہر ملک اور ہر زمانہ میں دکھائی دیں گے۔ لہٰذا علمی اعتبار سے دیکھتے تو قوتِ ارادی کے ابتدائی مراحل ”خود ایمائیت“ (AUTO SUGGESTION) سے لے کر اس کے آخری مراحل تک ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جبلت اور وجدان کے متعلق ہم نے دیکھا ہے کہ وہ وراثت یا ماحول کا نتیجہ ہیں۔ کسب و ہنر کو ان میں کچھ دخل نہیں۔ لیکن باطنیت ایک اکتسابی فن ہے۔ چیلہ اپنے گرو سے، مرید اپنے پیر سے، شاگرد اپنے استاد سے، اس فن کی باقاعدہ تحصیل کرتا اور مختلف قواعد و ضوابط کے ماتحت ریاضتوں اور مشقتوں سے اس قوت میں

یہ اکتسابی فن ہے

اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ریاضتیں اور مشقتیں انسان کی قوتِ ارادی (WILL POWER) یا ارتکازِ نفس (CONCENTRATION OF MIND) میں اضافہ کرتی ہیں جس سے اس کے

لے چونکہ اس وقت اس موضوع پر خالص علمی اور تاریخی اعتبار سے گفتگو ہو رہی ہے اس لئے اسے عقائد کے چشمہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔

لے یورپ اور امریکہ میں اس کے لئے باقاعدہ درسگاہیں (INSTITUTIONS) کھلی ہوئی ہیں۔

عامل سے اس قسم کے غیر معمولی کارنامے ظہور میں آتے ہیں جنہیں ہمارے ہاں روحانیت کے کرشمے یا کرامات سمجھا جاتا ہے لیکن مغرب میں اسے پیناٹزم کہا جاتا ہے اور اسے ایک سائنس کے طور پر سیکھا جاتا ہے۔ اور ہسپتالوں میں اس سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق درحقیقت علم النفس سے ہے۔ یورپ کا علم النفس (PSYCHOLOGY) بنوڑ اپنے عہد طفولیت میں ہے۔ اگرچہ عہد حاضر میں اس کے جلیل القدر ائمہ ہو گزرے (اور موجود) ہیں۔ بایں ہمہ ان کے ہاں انسانی نفس کی کیفیات، اس کے تاثرات و ماحریات، اقسام و مدارج اور طبقات و اطوار کے متعلق تو بحثیں ہوتی ہیں لیکن خود نفس انسانی کے متعلق انہیں بھی کچھ معلوم نہیں کہ یہ ہے کیا؟ باقی رہے ”اربابِ حال“ (خواہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں) وہ خود حیرت کی وادیوں میں گم ہیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ

کا نزا کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اس لئے نفس کی کنہ و حقیقت کے خیال کو چھوڑ کر دیکھنا یہ چاہیئے کہ یہ علم ہمارے اس سوال کا حل بنا سکتا ہے جو اس بحث کا مرکز ہے؟

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، حقیقت، کُلّی وحدت ہے اور ناقابل تقسیم۔ اس لئے جس آنکھ کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو، زمان و مکان کے بعد و فصل کے باوجود، اس کا نتیجہ مستخرج ہر مقام پر ایک ہونا چاہیئے۔ لیکن آپ تاریخ کے ادراک کو الٹ کر دیکھئے، یا اپنے دور پر نگاہ ڈال کر آپ دیکھیں گے کہ مدعیان کشف کے تجرباتی نتائج ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ (WILLIAM JAMES)

اپنی مشہور کتاب (THE VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE) میں اس موضوع پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

لے اکثر اوقات یہ اختلافات جزئی نہیں بلکہ اصولی ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں وحدت وجود (ابن عربیؒ) اور وحدت شہود (امام سرہندیؒ) کے نظریات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے ان میں باہمی توافق و تطابق کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں؟ پھر یہ چیز بھی عجیب ہے کہ اس دنیا کا تعلق یکسر وارداتِ قلب سے ہے لیکن اس موضوع پر بحث فلسفیانہ کی جاتی ہے۔ یہ لوگ عقل کی تنقیص خود عقلی دلائل سے کرتے ہیں!

ان لوگوں کے خوابوں اور پیغاموں میں بعض بے حد حماقت آمیز ہوتے ہیں۔ ان کے عالم وجد و مستی کے ماجریات میں سے بعض انسانی اعمال و سیرت کے لئے کسی نفع کا موجب نہیں ہوتے۔ لہذا انہیں خدائی پیغامات وغیرہ کہنا تو ایک طرف وہ اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ انہیں کوئی اہمیت دی جائے..... علاوہ بریں، باطنیت کا فن ایک انفرادی چیز ہے اور اس کے نتائج ایسے متضاد و متباہن کہ انہیں "عالم گیر سند" کی حیثیت حاصل ہی نہیں ہو سکتی۔

کشف حجت نہیں | اسی لئے خود اہل تصوف کے ہاں بھی کسی کا کشف کسی دوسرے کے لئے سند و حجت قرار نہیں پاسکتا۔ حتیٰ کہ خود صاحب کشف کے لئے بھی نہیں۔ اس لئے کہ اس حقیقت کے پرکھنے کے لئے اس کے اپنے پاس بھی کوئی معیار نہیں ہوتا کہ وہ کشف کن میلانات و عواطف اور رجحانات، و دساوس کا نتیجہ ہے۔ "رحمانی الہام" کے ساتھ "شیطانی الہام" ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ علم النفس، بالخصوص علم تحلیل نفسی (PSYCHO ANALYSIS) نے اس باب میں مفید خدمات انجام دی ہیں۔ وہ نفس انسانی کے امیال و عواطف کا تجزیہ کر کے بتاتا ہے کہ فلاں قسم کے خواب یا مکاشفہ کی اساس کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک تو یہ فن ہنوز اپنے عہد طفولیت میں ہے۔ دوسرے اس کی بنیاد میں بعض اینٹیں ایسی غلط رکھی گئی ہیں جن سے اس کی عمارت کے بعض گوشے کبھی قابل اعتماد نہیں قرار پاسکتے۔ بالخصوص ڈاکٹر فرائد کا یہ نظریہ کہ تمام نفسی رجحانات و محرکات کا سرچشمہ عام طور پر (کسی نہ کسی شکل میں) جنسی تحریک (SEX IMPULSE) ہے اس لئے یہ حقیقت ابھی تک اپنی جگہ پر ہے کہ اگر باب کشف کے دعاوی کے پرکھنے کا کوئی معیار اس فن میں موجود نہیں اس لئے متضاد و متباہن نتائج کے حامل سب اپنی اپنی جگہ حقیقت کے مدعی ہیں اور کوئی ان کی تکذیب و تردید نہیں کر سکتا۔ اگر ایک اس کی تردید کرتا ہے تو دوسرا اس کی تائید کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر انہوں نے باہمی صلح جوئی کی شکل یہ پیدا کی ہے کہ سب دعاوی اپنی اپنی جگہ برحق ہیں، فرق صرف اظہار بیان میں ہے اس مقصد کے لئے (جنمنا ایک گھاٹ بہیرے جیسی) سطحی شاعرانہ تشبیہات و استعارات سے عوام کے بہلاوے کا سامان مہیا کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان مختلف مسالک و مشارب کا بدقت نظر مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ ان میں باہمی اختلاف، طرق و اسالیب کا نہیں بلکہ اصل و حقیقت

کلبے۔ پھر مشکل یہ ہے کہ اس باب میں رد و قبول (بلکہ حق و باطل) کا معیار "کرامات" قرار پا چکا ہے۔ اور یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ ان چیزوں کے لئے نہ تطہیر فکر کی شرط ہوتی ہے نہ تصحیح اعمال کی۔ (جیسا کہ کہا جا چکا ہے) یہ قوتِ ارادی کے مظاہر ہوتے ہیں جسے فنی حیثیت سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مشکل اندر مشکل یہ کہ (ان لوگوں سے قطع نظر جو اس قسم کی "شعبہ بازیوں" حصولِ مفاد کی خاطر ویدہ و دانستہ دکھاتے ہیں) بعض لوگ نفس کے دھوکے میں رہتے ہیں اور اس قوتِ خیال کو روحانی ترقی (اور قربِ الہی) سمجھ کر حقیقت شناسی کے مدعی بن بیٹھتے ہیں اور انہیں اس بات کا احساس تک بھی نہیں ہوتا کہ جسے وہ گلستاں سمجھے ہیں فریبِ رنگ و بو کے سوا کچھ نہیں۔ انہیں اس مغالطہ سے نکالنا یا دوسروں کو اس فریب میں مبتلا ہونے سے باز رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ ان ہی لوگوں کے متعلق (WILLIAM JAMES) لکھتا ہے۔

یہ مسئلہ کہ ایسے تجربات و پیغامات جو درحقیقت منجانب اللہ تھے اور وہ جنہیں شیطان نے وضع کر دکھایا تھا اور جن سے بچارے مذہب پرست لوگ پہلے سے بھی زیادہ جہنم کے عذاب کے مستحق بن گئے۔ ان دونوں میں کس طرح تمیز کی جاسکے۔ عیسائی تصوف کی تاریخ میں لایسکل رہا ہے۔

(THE VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE)

ایک عیسائیت ہی پر کیا موقوف ہے؟ یہ مسئلہ ہر مذہب کی باطنیت (تصوف) میں ہزار مشکلات کا موجب بنا رہا (اور بنا ہوا) ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے "القائے رحمانی" اور "القائے شیطانی" میں تمیز و تفریق بڑی مشکل ہے جس کی وجہ سے شیطنت، بڑے بڑے مقدس نقابوں میں ہیزن ایمان دہوش بنے رہتی ہے۔ اور اس رہزنی میں فریبِ کاروں کے علاوہ فریبِ خوردگان کا بھی کچھ کم حصہ نہیں ہوتا۔

لیکن اگر قطع نظر ان لوگوں کے جو ویدہ و دانستہ متکاری اور فریب کاری کرتے ہیں۔ یا نادانستہ بتلائے خدع و فریب رہتے ہیں، ان لوگوں کو بھی لیا جائے جو سچ مچ وارداتِ قلب سے لذت آشنا

لے "کرامات" تو بہت پرست سادھوؤں، سنیا سیوں سے بھی سرزد ہو جاتی ہیں۔

ہوتے ہیں تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ ان لوگوں کی یہ لذت آشنائی اپنی ذات کے لئے ہوتی ہے۔ یعنی یہ تجربہ، یکسر انفرادی (INDIVIDUAL) ہوتا ہے ان لوگوں کے پاس نوع انسانی کے لئے کوئی پیغام نہیں ہوتا۔ وہ ان کے فکر و عمل کی دنیا میں کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتے ان کے نزدیک ”تزکیہ نفس“ مقصود بالذات ہے۔ حالانکہ تزکیہ نفس نہ بجائے خویش منزل ہو سکتا ہے نہ مقصود ہے۔ اور اک حقیقت سے مفہوم یہ ہے کہ اس سوال کا حل بتایا جائے جو دنیا سے انسانیت کے لئے موجب ہزار غلش و اضطراب بنے چلا آ رہا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص خاص نظم و ضبط اور ریاضتوں اور مشقتوں سے اپنے دل کی دنیا میں کچھ کیفیتیں اور لذتیں محسوس کرنے لگ جاتا ہے تو اس سے انسانیت کو کیا فائدہ ہے؟ ایسا شخص اپنے تجربہ کی خلوت گاہوں سے باہر بھی آئے گا تو زیادہ سے زیادہ یہی کر سکے گا کہ کسی دوسرے کو ان طرق و مقامات کا پتہ بتا دے جن سے وہ بھی اس کی طرح اسی قسم کی کیف و مستی سے لذت آشنا ہو جائے۔ لیکن اس صورت میں بھی یہ تجربہ انفرادی ہی رہا۔ اس انفرادیت کو رہبانیت کہتے ہیں جس نے دنیا میں کبھی کوئی انقلاب نہیں برپا کیا۔ انفرادیت کبھی نوع انسانی کے مسائل کا حل نہیں بتا سکتی یہی وجہ ہے کہ جن مذاہب نے اسے اور اک حقیقت کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے انہیں مسائل حیات کے حل کے لئے دوسری راہیں اختیار کرنی پڑی ہیں۔ یہی غلطی آگے چل کر دین اور دنیا (روح اور مادہ) کی ثنویت (DUALISM) کا موجب بن گئی جس سے نظام انسانی میں فساد ہی فساد برپا ہو گیا۔ استحکام خودی، ترکش خواہشات و قطع علائق سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ متصادم و متعارض قوتوں سے کشمکش اور ان پر غلبہ و استیلا سے حاصل ہوتا ہے۔ شمشیر کی تاب و برنگی کا راز نیام کی خلوت گاہوں میں نہیں بلکہ فسان کی شعلہ بازیوں میں ہے۔ اپنے پر ضبط و قابو اس لئے ضروری ہے کہ اس مومنانہ استغناء سے دنیا کی بڑی سے بڑی طاغوتی قوتوں کو مغلوب و مغلوب کر دیا جائے۔ نہ اس لئے کہ خود ایک گوشہ انزوا میں بیٹھ کر انہیں ہر قسم کی سرکشی و بے باکی کے لئے کھلا چھوڑ دیا جائے بقائے نفس کے لئے اگر صفات خداوندی کا پر تو ضروری ہے تو ضربِ کلیمی کا جلال بھی تو خدائے قہار و جبار کی صفت کا عکس ہے (اور یہ

لے ”تزکیہ“ کے معنی نشوونما کے ہیں۔ لیکن یہ حضرات ”نفس کشی“ کو تزکیہ سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

ظاہر ہے کہ خدا کی قہارت و جباریت (معاذ اللہ) کسی مستبد قوت کی قہرمانیت نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی درپردہ اس کی ربوبیت ہی کا تقاضا ہوتا ہے۔ لہذا جہاں فقط طبیعیات کی خارجی دنیا کو مرکز نگاہ بنالینا غلط ہے۔ وہاں صرف نفس کی داخلی دنیا کو خارج سے متعلق سمجھ لینا بھی صحیح نہیں۔ نفس کا ارتقا۔ ان دونوں کے صحیح امتزاج سے ہوتا ہے۔ روح اور مادہ (داخلی اور خارجی دنیا) کی ثنویت قرآنی مسلک نہیں۔ جو اسلوب فکر ان میں سے صرف ایک کو سامنے رکھتا ہے عجمی ہے اسی کے لئے علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

بہ چشمے خلوت خود را بہ بیند بہ چشمے جلوت خود را بہ بیند
اگر یک چشم بر بند گناہ ہے است اگر باہر دو بیند شرط را ہے است

ان تصریحات سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ باطنیت (MYSTICISM) کا طریق بھی حقیقت گئی کے ادراک کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ جن شاہراہوں میں اس قدر غلط فہمیوں اور ابلہ فریبوں، وساوس نفس کی رنگ آمیزیوں اور وسیع کاریوں کے کھلے کھلے امکانات موجود ہوں۔ جہاں خضر اور راہزن میں تیز ہی نہ ہو سکتی ہو، انہیں حقیقت عظمیٰ کی منزل تک پہنچانے کا قابل اعتماد طریق کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ عالم محسوسات (دنیا ئے سانس) میں اگر آج کوئی قدم غلط اٹھتا ہے تو کل کی مزید تحقیقات اس غلطی کی تردید کر دیتی ہیں۔ لیکن باطنیت کی دنیا میں ایسے ایسے نگاہ فریب مناظر آتے ہیں کہ ان میں جذب ہو کر انسان کو احساس تک بھی نہیں ہونے پاتا کہ وہ جس راستہ پر گامزن ہے وہ ہلاکت اور بربادی کے کن عمیق گڑھوں کی طرف لئے جا رہا ہے۔



نگہ بازگشت | اب آگے بڑھئے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ راستہ کی دشوار آزاری سے آپ کا رہرو فکر شاید تکان محسوس کر رہا ہو۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ اگلی منزل تک پہنچنے سے پہلے ذرا سٹالیا جائے۔ فرصت کے ان لمحات میں قطع کردہ منزل پر نگاہ بازگشت ڈالئے اور عالم تصویر میں دیکھئے کہ ہم کہاں سے چل کر کہاں پہنچ گئے ہیں۔

ہمارا آغاز سفر اس مقام سے ہوا تھا کہ انسان کے سامنے ایک سوال ہے جس کے حل کی تلاش میں ہمیشہ حیران و سرگرداں رہا ہے۔ اس سوال کا حل حقیقت ادراک کے بغیر ممکن نہیں۔ اس ادراک کا ذریعہ علم ہے۔ علم کی دنیا میں ہمارے سامنے سب سے پہلے عالم محسوسات آتا ہے جہاں عقل استدلال

کے راستے، جزئیات سے کلیات تک پہنچتی ہے۔ عقل کا بھی جی چاہتا ہے کہ وہ حقیقت کا ادراک کرے۔ لیکن حقیقت، لامتناہی ہے اور استدلال کا دائرہ قنابیت سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لئے کئی حقیقت کا ادراک، عقل کے بس کی بات نہیں۔ عقل کے مختلف دوائر میں وحدت حقیقت، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ملتی ہے۔ اس کے ذریعے وحدت پر تمام احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری منزل علم غیر استدلالی ہے جس میں سب سے پہلے جبلت (INSTINCT) یا ضمیر (CONSCIENCE) کا مقام سامنے آتا ہے۔ ضمیر، وراثت اور ماحول وغیرہ کے خارجی اثرات سے اس درجہ متاثر ہوتی ہے کہ یہ حق و باطل کی تمیز کا ذریعہ قرار ہی نہیں پاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ضمیر کی آواز کبھی ایک نتیجہ پر نہیں پہنچتی۔

ضمیر کے بعد وجدان (INTUITION) کی وادی سامنے آتی ہے۔ جس میں سب سے وسیع اور وقع میدان نابغہ کی تخلیق کا ہے۔ وجدان، شدتِ ذوق کا نام ہے اور ذوق کا اختلاف ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ! اس لئے ذوق (وجدان) کو بھی حق و باطل کی تمیز کا معیار نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک نابغہ (GENIUS) اپنے فن کے انتہائے کمال پر ہوتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ کمال، اس کی سیرت پر بھی اسی طرح اثر انداز ہو۔ اس لئے نابغہ، انسانوں کی دنیا میں کوئی انقلاب نہیں پیدا کر سکتا۔ لہذا وجدان بھی ادراک حقیقت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

اس کے بعد باطنیت (MYSTICISM) کا میدان سامنے آتا ہے۔ اگرچہ اس کے نتائج غیر استدلالی دنیا سے متعلق ہیں لیکن یہ فن اکتسابی ہے اور قوتِ ارادی کے پختہ اور مرکز کرنے کا ذریعہ۔ اس میں ارباب کشف کے نتائج ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوتے ہیں۔ اس لئے ضمیر اور وجدان کی طرح یہ علم بھی حقیقت کے ادراک سے قاصر ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس راستے میں حق و باطل کی تمیز بڑی مشکل ہے۔ اس لئے اس میں ضلالت و غوایت کے امکانات اور راہوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ پھر یہ بھی کہ اس میں صاحب تجربہ کا نتیجہ یکسر انفرادی ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ عام دنیائے انسانیت کے لئے کوئی پیغام اپنے اندر نہیں رکھتا اور اسی لئے ہماری فکر و تہذیب کی دنیا میں کسی انقلاب کا موجب نہیں بن سکتا۔

یہاں تک پہنچنے کے بعد ہم سئلے بیٹھے تھے۔

آخری مقام

اب آگے بڑھتے اور تاریخ کے اوراق کو ایک مرتبہ پھر لٹتے۔ اب ہمارے سامنے مدعیانِ حقیقت کا ایک ایسا گروہ آتا ہے جن میں وہ تمام خصوصیاتِ حسنہ بھی بھی موجود ہیں جو متذکرہ سابقہ گروہوں کے انسانوں میں جھلک رہی تھیں لیکن ان کے علاوہ ایک خصوصیت کبریٰ ایسی بھی ہے جو اور کہیں نہیں مل سکی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایک ایسے دور میں جبکہ لطافتِ فکر و نظر اور لطافتِ کردار و عمل کا کوئی نشان تک نہ ملتا ہو۔ انسانی تصورات و معتقدات کی دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہے جس پر ابلیس و ہر کے عساکرِ ضلالت اور شیاطینِ عصر کے جنودِ بطلت مسلط نہ ہو چکے ہوں۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ ہو جس میں ایمان و یقین کی جگہ شکوک و ظنون اور نصوصِ صریحہ و حجج بالغہ کی جگہ تلبیس و تحریف نے نہ لے لی ہو۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر فساد ہی فساد دکھائی دیتا ہو۔ شرپنہ انسانیت اپنے تمام مدارج و معارج کھو کر تنزل و تسفل کے عمیق جہنم میں گر چکا ہو۔ ایسے وقت میں جبکہ کشف و ابرازِ حقیقت کے لئے نفس و آفاق کے کسی گوشے میں شعاعِ ہدایت و سعادت نہ دکھائی دیتی ہو۔ ظلمت و غوایت کے اس مرکز میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ماحول اور وراثت کے ان اصول و ضوابط کے ماتحت جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اس بچہ کو دہی کچھ ہونا چاہیے جو اس کا گروہ پیش ہے۔ لیکن دیکھنے والی نگاہیں دیکھتی ہیں کہ وہ اپنے خاندان اور ماحول سے بالکل الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ وہ ان تمام غلط نظریاتِ حیات سے جو مہلک جراثیم کی طرح، فضا کی پہنائیوں میں غیر محسوس طور پر پھیلے ہوئے ہیں، محترز و متنفر دکھائی دیتا ہے۔ وہ بچپن ہی میں اس غلط روشِ کہن سے جس پر اس کے آباء و اجداد ایک زمانہ سے چلے آ رہے ہیں اور جنہیں قدامت پرستی کی سند نے تحقیق و تفتیش اور تنقید و تنقیب کی حد سے بالاتر قرار دے رکھا ہے، تبریٰ اور بیزاری کا اعلان کرتا ہے۔ وہ برائے پر غائرانہ نگاہ ڈالتا اور ہر چیز کو محتجہ سانس نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی نگاہِ بصیرت انعکاسی شعاعوں (X-RAYS) کی طرح، تمام نظر فریب پردوں سے گزر کر حق و باطل میں تمیز کر لیتی ہے۔ وہ عقل و دانش میں بھی ایسا ممتاز ہوتا ہے کہ قبیلہ اور خاندان کے سن رسیدہ بزرگ بڑے بڑے اہم معاملات کے تصفیہ کے لئے اس سے استصواب رائے کرتے اور اسے حکم قرار دیتے ہیں۔ بایں ہمہ، نہ اسے عقلِ جلیلہ جو کسی مغالطہ میں رکھتی ہے نہ ضمیر کی آواز اسے دھوکا دیتی ہے اس کی پیدائش ایک نابغہ (GENIUS) کی طرح ہوتی ہے جس کے متعلق ہم گذشتہ صفحات میں تفصیلاً بحث کر چکے ہیں، لیکن ایک عام نابغہ کے خلاف وہ ہندی سیرت کے اس معراجِ کبریٰ پر تبسم فشاں ہوتا ہے

جو مکارم اخلاق کا معیار قرار پاتی ہے۔ اس کی یہ سیرت نہایت متوازن اور اس کی زندگی پورے پورے اعتدال کی مظہر ہوتی ہے۔ وہ اس ماحول میں جس میں سلب و نہب ایک اصول زندگی اور لوٹ کھسوٹ کا عام انداز حیات ہوتا ہے۔ سارے علاقہ میں "الامین" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اور بڑی سے بڑی امانت اس اعتماد اور بھروسے سے اس کے سپرد کر دی جاتی ہے جس طرح انسان اپنا راز اپنے دل سے کہہ دیتا ہے۔ اور اس کی دیانت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب وہی لوگ اسے اس قدر امین جانتے ہیں۔ اس جرم کی پاداش میں اسے قتل کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ انہیں حق کی طرف کیوں دعوت دیتا ہے اور ایک اندھیری رات میں اس کے مکان پر گھیرا ڈال دیتے ہیں تو اس "امین محصور" کو رات بھر یہ فکر غلطاں و بیچاں رکھتی ہے کہ اگر میں یہاں سے چپکے سے نکل گیا تو ان کی امانتیں جو میرے پاس ہیں انہیں کس کے سپرد کر کے جاؤں گا۔ اس کی صداقت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ جب اپنی قوم کو حق و انصاف کی طرف سب سے پہلی دعوت دیتا ہے تو ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر ان سے کہتا ہے کہ کہو! اگر میں کہوں کہ اس پہاڑی کے اس پار دشمن کا ایک عظیم شکر ہے جو تمہاری بستیوں پر حملہ کرنے کے لئے بڑھے چلا آ رہا ہے تو میری بات کو صحیح مانو گے یا غلط۔ تو سب بیک زبان پکار اٹھتے ہیں کہ ہم غلط کیوں مانیں گے تم نے آج تک کبھی جھوٹ ہی نہیں بولا! اس کے کیر کڑ کی پختگی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ مخالفت کے طوفان میں جب دشمن کی طرف سے یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اپنی صداقت کا کوئی ثبوت پیش کرو تو وہ نہایت بلند آہنگی سے بیباکانہ کہہ دیتا ہے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِمْ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (۱۰/۶۶) "میں نے اس سے پیشتر تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے نہیں جان سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا؟" کیسا عظیم الشان ہے یہ دعویٰ! اور پھر دعوے بھی کس جگہ؟ دشمنوں کے هجوم میں لیکن بلندی سیرت کا جلال ایسا صاعقہ لگن ہے کہ تمام مخالفتوں کے باوجود اس دعوے کے خلاف کسی گوشے سے کوئی دھیمی سی آواز بھی تو نہیں اٹھتی؟ یہی نہیں کہ اس کے سامنے مروت اور حجاب کی بنا پر کوئی کچھ نہیں کہتا بلکہ اس کی غیبت میں بھی ایک حرف اس کی سیرت کے خلاف کسی کی زبان تک نہیں آتا۔ وہ نہایت سادگی اور اطمینان

لے اوسفیان ہرقل کے دربار میں جاتا ہے کہ اُسے اس نئے داعی انقلاب کے خلاف بھرکائے اور اس سے مدد لے لے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اور بظاہر کوئی بات اس کے لئے وجہ تشویش نہیں ہوتی۔ لیکن دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ وہ کسی اہم مسئلہ کے حل کی تلاش میں حیران و سرگرداں رہتا ہے (وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ) ۵ (۹۳/۴)۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی عظیم المرتبت فکر و خیال ہے جو اس کے قلب کی گہرائیوں میں پہلو بدل رہا ہے۔ لیکن ہنوز آب و تاب سے موزوں نہیں ہو سکا۔ لیکن حیرت یہ کہ اسے خود بھی علم نہیں ہوتا کہ یہ فکر و خیال کیا ہے اور اس کا قلب کن انکشافات و تجلیات کا مہبط بننے والا ہے؟ (مَا كُنْتُ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ) (۴۲/۵۲)۔ حتیٰ کہ وہ وقت آجاتا ہے جب حقیقت تماماً و کمالاً اپنے آپ کو اس منتخب و برگزیدہ شخصیت پر جسے اس غرض و مقصد کے لئے تیار کیا جا رہا تھا، منکشف (REVEAL) کر دیتی ہے۔ حیات (LIFE) کے تمام سرسبز راز اس پر کھل جاتے ہیں اور وہ قلب کائنات کی انتہائی گہرائیوں میں اتر کر اس سوال کا حل اپنے سامنے پاتا ہے جس تلاش میں انسان یوں مضطرب و بیتاب چلا آ رہا تھا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

حیات کائنات وجدانی طور پر اپنے تقاضوں کو محسوس کرتی ہے اور نازک اوقات پر اپنا
نُخ آپ متعین کر لیتی ہے اسی کو ہم مذہب کی زبان میں وحی نبوت کہتے ہیں۔

(خطبات، ص ۱۴)

مقام نبوت | یہ ہے مقام نبوت، مغربی دنیا چونکہ مقام نبوت سے پورے طور پر آشنا نہیں اس لئے ان کے ہاں اس کے لئے (PROPHET) کا لفظ آتا ہے جو یقیناً اس

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) کہ اس اٹھنے والے ”شعلے“ کو دبائے، ہر قل پوچھتا ہے کہ اس شخص نے تمہارے اندر زندگی بسر کی ہے اور وہ تمہیں میں سے ایک ہے۔ کہو کہ اس کی زندگی کس رنج سے گزری ہے؟ غور کیجئے! حضورؐ سامنے نہیں۔ آپ کا کوئی طرفدار بھی وہاں موجود نہیں جس سے جھجک پیدا ہو جائے۔ مقصد پیش نظر ہر قل کو مشتعل کرنا ہے۔ اس کی حمایت حاصل کرنے کا بڑا عمدہ موقع ہے۔ لیکن حضورؐ کی بلندی سیرت کا یہ رعب ہے کہ وہ ایک لفظ بھی حضورؐ کے خلاف زبان تک نہیں لاسکا اور کہا تو اتنا ہی کہا کہ بس ایک دعوت کے علاوہ اس کی زندگی میں کوئی چیز قابلِ اعتراض نہیں۔

لے یکے در یکے آدم نگر از من چھٹی پر سی منور اندہ طبیعت می غلہ موزوں شود روزے
چنان موزوں شود! ای پیش پا افتادہ مضمونے کو یزداد را دل از تاثیر او پر خون شود روزے

مقام کی صحیح تعبیر نہیں کر سکتا۔ اس سے ذہن پیشگوئیوں (PROPHECIES) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس میں کہانت کا تصور لازمی طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک نبی، وحی کے عطا فرمودہ علم کی حدود تک غیب کی باتوں سے بھی واقفیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ مقام نبوت کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس مقام کی صحیح تعبیر وحی کے تصور ہی سے ہو سکتی ہے۔ چونکہ وحی کا تعلق (غیر استدلالی دنیا) سے ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے یہ اور وجدان (INTUITION) کے دوسرے تجربے (مثلاً باطنیت (MYSTICISM) وغیرہ ایک شق میں آ سکتے ہیں۔ لیکن اتنی سی مشارکت و مشابہت کے علاوہ ان میں اور کوئی چیز مشترک نہیں ہوتی۔ وحی اپنی دنیا کا الگ اور منفرد تجربہ ہے جس کی مثال و نظیر کسی اور تجربے میں نہیں مل سکتی۔ باطنیت کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ

(i) وہ الکسانی فن ہے۔

(ii) اس میں دھوکا اور فریب انسان کو مغالطے میں رکھ سکتا ہے۔

(iii) اور وہ ایک یکسر انفرادی تجربہ ہے جسے انسانی ہمدستی اجتماعیہ کے مسائل سے کچھ تعلق نہیں۔ اس کے برعکس نبوت یکسر وہی ہوتی ہے جس میں کسب و ہنر کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ پھر نبوت ایک حتمی اور یقینی ذریعہ علم ہے جس میں فریب و مغالطہ تو ایک طرف، ظن و قیاس تک کو بھی دخل نہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ وہ حقیقت کو تماماً و کمالاً پاکر انسانیت کے معراج کبریٰ پر پہنچ جاتا ہے جہاں انسان کائنات اور خدا کا صحیح اور اصلی تعلق اس کے دل کی گہرائیوں پر بے نقاب ہو جاتا ہے۔ پھر بے بڑی چیز یہ کہ اس کا یہ تجربہ انفرادی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اس عظیم النظیر تجربہ کے بعد دنیا سے انسانیت کی طرف لوٹتا ہے اور ایک عظیم الشان قیامت در آغوش انقلاب افریں پیغام کا داعی بن کر ان کے فکر و عمل کی سوئی بستیوں میں صور اسرافیل

لے تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی۔

یہ اسی سے ”روح اور مادہ“ کی ثنویت ٹوٹ کر ان میں باہمی توافق و امتزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ ”پیدا“ کیا ہو جاتا ہے؛ بلکہ ان کی اصل و بنیاد کی یگانگت سامنے آ جاتی ہے اور یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ روح جب محسوس و مرئی پیکر میں اپنا نمود چاہتی ہے تو اسے مادہ کہتے ہیں۔

بھونکتا ہے اور اس طرح اپنے غیر متزلزل ایمان (جو آنکھوں دیکھی حقیقت پر مبنی ہوتا ہے) اور بے پناہ عمل سے (جو اس ایمان کا محسوس مظاہرہ ہوتا ہے) ذہنوں کے تصورات نگاہوں کے زاویئے اشیا کی اقدار فکر و نظر کے اسلوب غرضیکہ نفس و آفاق کی دنیا کے نقشے بدل دیتا ہے۔ علامہ اقبال اس حقیقت کی تہنیں کے لئے اپنے پانچویں خطبہ کو ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں۔

”محمد عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ میں اگر اس مقام تک پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ لوٹتا۔ یہ الفاظ ایک بہت بڑے مسلمان صوفی بزرگ (حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوف کے لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے۔ جو ایک فقرہ کے اندر شعورِ نبوت اور تصوف کے لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجرّد گاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوع انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانہ کے طوفان پر تسلط پاکر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد و مظالم کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجرّد گاہ آخری مقام ہوتی ہے لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس کی آنکھ نے دیکھا ہے وہ ایک جتنی جاگتی دنیا کے پیکر میں تشکل ہو جائے نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لئے ایک صاحبِ دجی کے ”تجربہ“ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسان کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی رو سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔ (خطبات، ص ۱۱۱)

دعوائے نبوت پر کھنے کا یہ استنتاجی طریق (PRAGMATIC TEST) ہے جس سے دجی کی صداقت کے ساتھ ساتھ یہ حیثیت بھی سامنے آ جاتی ہے کہ ایک نبی کی بعثت نابغہ (GENIUS) کی طرح محض اتفاقی نہیں ہوتی بلکہ وہ نظام کائنات کے عظیم الشان مقصد اور تدبیر کے سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہوتی

ہے جو ٹھیک اپنے وقت پر ایک خاص مقصد کو پورا کرنے کے لئے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس کے لئے علامہ مقصدِ عظیم کے لئے اقبالؒ کے ان الفاظ کو ایک مرتبہ پھر سامنے لے آئیے جنہیں پیچھے درج کیا جا چکا ہے کہ ”حیات کائنات و ہر انی طور پر اپنے تقاضوں

کو محسوس کرتی ہے اور نازک اوقات پر اپنا رخ آپ متعین کر لیتی ہے۔ اسی کو مذہب کی زبان میں وحیِ نبوتؐ کہا جاتا ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ (EDDINGTON) کی پیش کردہ تصریحات کے مطابق، دنیائے سائنس میں ہم اشیاء کی حقیقت سے باخبر نہیں ہو سکتے۔ فقط ان اشارات (SYMBOLS) سے آشنا ہو سکتے ہیں جو ہمارے حواس ہمارے ذہن پر مرسم کرتے ہیں۔ لیکن جب حقیقت اپنے آپ کو اس طرح منکشف کرتی ہے تو اس (وحی) کی روشنی میں اشیاء کی حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہے۔ ایڈنگٹن لکھتا ہے :-

قوت، توانائی، ابعاد، یہ سب اشارات (SYMBOLS) کی دنیا سے متعلق ہیں یہی وہ تصورات ہیں جن سے ہم نے طبیعیات کی خارجی دنیا کی تخلیق کی ہے۔ ان کے علاوہ ہمارے پاس اور تصورات ہیں کون سے؟ (لیکن) طبیعیات کی دنیا کے اسباب و ذرائع ختم کر چکنے کے بعد جب ہم اپنے شعور کی دنیا کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچتے ہیں، وہ دنیا جہاں سے ہماری ذات کا اعلان ہوتا ہے۔ وہاں ہم ایک نئے منظر میں داخل ہوتے ہیں اور خود اپنی ذات سے اشارات (SYMBOLS) لے کر ایک نئی دنیا کی تخلیق کرتے ہیں جس بنیاد (ماوراء المادہ) روحانیت پر ہوتی ہے۔“

(SCIENCE AND THE UN-SEEN WORLD)

نبی اس نئی دنیا کی تخلیق کرتا ہے اور پھر اس کی وحی کی روشنی سے مکتسب اور مستنیر ہونے والے افراد ان اشیاء کی حقیقت و اہمیت سے بہرہ یاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اس ”ماوی دنیا“ کی بنیاد خالص ”روحانیت“ پر قرار پا جاتی ہے جس سے نگاہوں کے زاویے بدل جاتے ہیں۔

۔ چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

لے قرآن کی رُو سے یہ مقام صرف نبی کو حاصل ہوتا ہے۔ غیر نبی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

ایک پیغام | ہم ضمیر و وجدان اور باطنیت کی دنیا میں دیکھ چکے ہیں کہ ان تجارب کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ ضمیر کی آواز مختلف مقامات میں مختلف ہے۔ وجدان (ذوق) کا باہمی تباہی و تخالف ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ باطنیت کے "کشفی" نتائج میں واضح تضاد ہوتا ہے لیکن نبوت کی دنیا میں ہر صاحبِ تجربہ کے نتائج اساساً اور اصولاً ایک ہوتے ہیں۔ ان میں کہیں، کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ زمان و مکان کا بُعد بھی اس پر کچھ اثر نہیں کر سکتا اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک پر حقیقت نماؤں و کمالات اپنا انکشاف کرتی ہے۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک کا تجربہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک، دوسرے کی تائید و تصدیق کرتا ہے اور اپنے دعوے کی صداقت تسلیم کرانے کے ساتھ ہی اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ اس سے پہلے جس قدر نبی گزرے ہیں وہ بھی اسی حقیقت کے بیان کرنے والے تھے۔



دجی کی حقیقت ہمارے سامنے آگئی۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم عام طور پر دجی کی ماہیت کو (جو کمزور غیر استدلالی دنیا سے متعلق ہے) عقل یعنی استدلالی علم کی رُو سے سمجھنا چاہتے ہیں اور جب عقل اپنی تنہا ہیت سے آگے نہیں بڑھ سکتی تو بجائے اس کے کہ اس کی محدودیت کا اعتراف کیا جائے دجی کے متعلق ظنون و شکوک پیدا کر لئے جاتے ہیں۔ دجی تو خیر بہت بلند چیز ہے، ہماری حالت تو یہ ہے کہ وجدان کی معمولی کیفیات کو بھی استدلال کی رُو سے نہ سمجھ سکتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں۔ لوہے کی چند تاروں کو مضرب سے جنبش دی جاتی ہے جس سے فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ ارتعاش ہمارے دل کی دنیا میں جذب و مستی کی ایک ایسی والہانہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے جسے نہ عقل کی رُو ہم خود سمجھ سکتے ہیں نہ کسی کو بتا سکتے ہیں کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوتا ہے؛ لہذا یہ اصول ہی غلط ہے کہ جس چیز کو ہم عقلاً نہ سمجھ سکیں اس کے وجود سے انکار کر دیا جائے۔ جن لوگوں میں موسیقی کا ذوق (EAR FOR MUSIC) نہیں ہوتا، انہیں قیامت تک سمجھ میں نہیں آ سکتا کہ تاروں کے اس ارتعاش یا گلے کے چند سروں سے ہوتا کیا ہے کہ جو لوگ اس طرح سر دھننے لگ جاتے ہیں جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ علمائے نفس انسانی کی کیفیات و ماحریات اور امیال و عواطف سے بحث کرتے ہیں اور ان ہی مباحث پر ان کے پورے علم کی عمارت قائم

ہو رہی ہے لیکن آج تک کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بالآخر نفسِ انسانی ہے کیا؟ طبیعیات کی دنیا میں دیکھنے ایتھر کے وجود کے سب قائل ہیں۔ اس کے خواص و کوائف اور مشاہد و مظاہر ہر ایک کی زبان پر ہیں لیکن ایتھر کی ماہیت کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ بحرا میں کہ ایک مجہول الکیف توانائی ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ وحی از قبیل ایتھر وغیرہ ہے۔ مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ یہ اصول کہ جس چیز کی ماہیت ہم عقلاً دریافت نہیں کر سکتے اس کے وجود سے انکار کر دیا جائے درست نہیں ایسے لوگوں کے متعلق (PASCAL) کہتا ہے۔

”ناقابلِ ادراک!“

لیکن اگر تم کسی چیز کو نہیں سمجھ سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں
کہ اس کا وجود ہی نہیں۔“

(QUOTED BY HUXLEY IN “RELIGION WITHOUT REVELATION”)

اور تو اور اب تو سائنس بھی وحی کے امکانات کی تردید نہیں کرتی (SAMUEL) لکھتا ہے:-
سائنس بیرونی دنیا سے آنے والے مستند پیغامات کے امکان کو خارج نہیں کرتی۔
لیکن چونکہ وہ خود اپنے دائرہ کے اندر نظریات کے رد و قبول کے معاملہ میں بھی بہت محتاط
واقع ہوئی ہے اس لئے وہ ان دائرہ سے متعلق نظریات کو جو اس کی حدود سے باہر ہیں
مسترد یا قبول کرنے میں اس سے بھی زیادہ احتیاط برتے گی۔

وحی اور سائنس | لہذا وحی کے متعلق اب سائنس کی روش، احتیاط کی روش ہے کھلے ہوئے
انکار کی نہیں۔ زمانہ کو اور آگے بڑھنے دیجئے۔ رفتہ رفتہ یہ احتیاط ہم دوش
اقرار ہو جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی اور عقل (یعنی مذہب و سائنس) کے تصادم کی داستانیں علم

لے وجدانی دنیا سے متعلق سب سے لطیف علم، علمِ نفسیات ہے۔ لیکن وحی کی ماہیت علمِ نفس کی رو سے بھی دریافت
نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ علمِ تحلیل نفسی کے مشہور عالم (JUNG) اس چیز کا کھلے کھلے الفاظ میں اعتراف کرتا ہے۔

(دیکھتے خطبات صفحہ ۱۸۰)

انسانی کے عہد طفولیت کی یادگار ہیں۔ وحی کبھی علم و عقل کی نقیض نہیں ہو سکتی۔ سائنس (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) ادراک حقیقت کا ناقص یا جزئی طریقہ ہے۔ اور وحی کامل و مکمل۔ علامہ اقبالؒ اس فرق کے متعلق لکھتے ہیں۔

جسے ہم سائنس کہتے ہیں وہ حقیقت کا کئی اور منظم مشاہدہ نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت کے مختلف گوشوں کے مشاہدات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایک مکمل تجربہ کے ٹکڑے جو اکٹھے کرنے سے فٹ نہیں بیٹھتے۔ علم فطرت (NATURAL SCIENCE) مادہ، زندگی اور شعور سے بحث کرتا ہے۔ لیکن آپ جو یہی سوال کریں کہ مادہ، زندگی اور شعور کا باہمی تعلق کیسا ہے؟ تو آپ کے سامنے وہ علوم آتے جہاں کے جو ان مختلف حصص سے متعلق ہیں۔ لیکن ان علوم کو یکجا کر دینے سے بھی آپ کے سوال کا مکمل جواب نہیں مل سکے گا۔ (خطبات صفحہ ۴۰)

دوسرے مقام پر ہے۔

سائنس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مطالعہ کے لئے حقیقت کے بعض مخصوص پہلوؤں کو منتخب کرے اور باقیوں کو خارج کر دے۔ سائنس کا یہ دعویٰ بے دلیل عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ حقیقت کے جن گوشوں کو اس نے منتخب کر لیا ہے۔ وہی گوشے مطالعہ کے قابل ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان ایک مکانی پہلو (SPATIAL ASPECT) بھی ہے لیکن انسان کا صرف یہی پہلو تو نہیں۔ اس کے دوسرے پہلو بھی ہیں..... جنہیں سائنس کو لازماً اپنے دائرہ تحقیق سے خارج کرنا ہو گا۔ اس لئے کہ ان کے سمجھنے کے لئے ان سے الگ ذرائع کی ضرورت ہے جو سائنس کے ہاں مستعمل ہیں۔ (خطبات ص ۷۱)

اس حقیقت کو پروفیسر ایڈنگٹن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

ہم اس امر کا اعتراف کر چکے ہیں کہ طبیعیات کی دنیا حقیقت کا صرف ایک جزوی سا گوشہ ہے (اب سوال یہ ہے کہ) ہم حقیقت کے دوسرے گوشے کے متعلق کس طرح بحث کریں؟ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس دوسرے حصے کا ہم سے ایسا واسطہ نہیں جیسا طبیعیات سے متعلق حصہ کا ہے۔ ہمارا شعور احساس مقصد اور اقدار سے بھی اسی طرح مرتب ہوتا ہے جس طرح حسی نقوش سے۔ ہم حسی نقوش (SENSE IMPRESSION)

کا تتبع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ ہیں اس خارجی دنیا میں لے جاتے ہیں جس کا تعلق سائنس سے ہے۔ اسی طرح جب ہم اپنی ذات کے دوسرے عناصر کا اتباع کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہیں زمان و مکان کی دنیا سے کہیں الگ لے جاتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ سائنس حقیقت کے صرف ایک گوشے سے بحث کرتی ہے۔ اس لئے اس کا دائرہ محدود ہے۔ لیکن اس کے برعکس دین (وحی) حقیقت کو تمام احوالاً دیکھتا ہے۔ اس لئے اس کُل کے اندر دنیا سے سائنس کا ہر ذرہ خود بخود شامل ہوتا ہے۔

لہذا مذہب کے لئے حقیقت کے جزئی علم، (یعنی سائنس) سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔

(خطبات ۴۰)

علاوہ بریں، ایک اور جہت سے بھی دین، سائنس کی دنیا سے آگے نکل جاتا ہے۔ سائنس کا مقصد فقط اتنا ہوتا ہے کہ وہ اشیاء کے متعلق تصور (CONCEPTION) قائم کر سکے (اس کی تفصیل شروع میں گزر چکی ہے) اس کے برعکس

دین محض تصور سے مطمئن نہیں ہو جاتا۔ وہ جس شے کی تلاش میں نکلتا ہے چاہتا ہے کہ اس کے متعلق گہرا علم حاصل کرے اور اس سے ربط و ضبط بھی پیدا کرے۔

(خطبات ۴۱)

سائنس صرف معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ لیکن وحی کا مقصد یہ ہے کہ حقیقت کے متعلق نہ صرف معلومات بہم پہنچائے بلکہ یہ بھی کہ انسان کی ذات کی اس طرح نشوونما ہوتی جائے کہ اس میں (علیٰ حد بشریت) صفات خداوندی منعکس ہوں۔ سائنس معلومات کے ذریعے تسخیر فطرت کے امکانات میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ لیکن وحی کی وساطت سے انسانی خودی حدود نا آشنا ہو جاتی ہے۔

لے وحی کے امکان بلکہ اس کی ناگزیر ضرورت کے متعلق دورِ حاضر کے سائنسدانوں اور مفکرین کی مزید شہادات کے لئے سلسلہ معارف القرآن کی آئندہ کڑی انسان نے کیا سوچا؟ کا مطالعہ کیجئے۔ اس میں انسانی فکر کے مختلف گوشوں کی تاریخ آگئی ہے اور اس کا آخری باب دجی سے متعلق ہے۔

وحی اور رہبانیت | جب طبیعیات کی دنیا، خود وحی (دین) کے دائرہ کے اندر شامل ہے تو رہبانیت کا مسلک اپنی علی الحقیقت نہیں قرار پاسکتا۔ رہبانیت کی

تعلیم درحقیقت روح اور مادہ کی ثنویت (DUALISM) کے غلط نظریہ پر مبنی ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ انسانی خودی کا ارتقاء اس کی ”داخلی دنیا“ کی تہذیب و تنظیم سے وابستہ ہے۔ خارجی دنیا کی قوتوں سے اس کا کچھ تعلق نہیں لیکن وحی کا ارشاد ہے کہ اس نظریہ کا اتنا حصہ درست ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس اضافہ کی بھی ضرورت ہے کہ انسان کے اندر جس ”داخلی دنیا“ کا انکشاف ہوتا ہے وہ مادہ کی خارجی دنیا کی حریف نہیں ہوتی بلکہ وہ تو مادی دنیا کے رگ و پے میں جذب ہوتی ہے۔ اس لئے خودی کا استحکام مادی دنیا کی قوتوں کے ترک سے نہیں بلکہ داخلی دنیا اور خارجی دنیا کی باہمی تطبیق و توفیق سے ہوگا (خطبات ص ۹)۔ وحی ”انسان کے اس بلند شعور کو بیدار کرتی ہے جس سے اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا اور کائنات سے کیا تعلق ہے؟“ (خطبات ص ۱۵)۔ جب انسان اس تعلق کو صحیح معنوں میں سمجھ لیتا ہے تو اس کی رُو سے ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جس میں یہ تمام قوتیں اس مقصد کے برے کار لانے میں صرف ہوتی ہیں جو حیات کے سرچشمہ کا تقاضا ہے۔ اس طرح ”اس کا ماتہ اللہ کا ماتہ“ ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں۔

خدا کی تمام مخلوق میں انسان ہی اس قابل ہے کہ وہ شعوری طور پر اپنے خالق کی حیات تخلیقی میں شرکت کر سکے اس میں یہ جوہر ودیعت کیا گیا ہے کہ یہ ایک بہتر دنیا کا تصور کر سکے اور جو کچھ موجود ہے اسے وہ کچھ بنادے جو اسے ہونا چاہیے۔ (خطبات ص ۴)

مقصود و مطلوب | جو کچھ موجود ہے (WHAT IS) اسے کیا ہونا چاہیے؟ (WHAT OUGHT TO BE) اس کا تعین اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ انسان کائنات کی

مختلف اشیاء کی حقیقت معلوم کر سکے۔ اور ایسا ہونا وحی کی روشنی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لئے کہ اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہیں جس سے حقیقت کا ادراک کئی ہو سکے۔ یہی وہ روشنی ہے جس سے انسان ’قلب کائنات کی گہرائیوں پر اتر کر اس کی تمام وسعتوں پر چھا جاتا ہے۔ اس مقام پر سب سے پہلے اسے اپنی

لہ رہبانیت درحقیقت کشمکش حیات سے گریز و فرار کی راہ ہے (تفصیل ”خلاصہ مبحث“ میں دیکھئے)

لَا وَمَا رَمَيْتُ إِذْ رَمَيْتُ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى (۸/۱۷)

ذات کے اثبات کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس طرح اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ "دنیا فی الحقیقت وہی ثابت (REAL) ہے جسے اپنے اثبات کا براہ راست شعور ہے (خطبات ص ۶۸)۔ اس سے انسان اپنے آپ کو بہ حیثیت انسان پہچانتا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی کے تمام گوشے جگمگا اٹھتے ہیں۔ اس طرح وحی اس کی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی راہ نمائی کرتی ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ:-

مذہب کسی ایک شعبہ زندگی کا نام نہیں۔ یہ نہ تو محض خیال ہے نہ محض احساس نہ محض عمل۔

(خطبات ص ۶)

بلکہ یہ انسان کا تمام تر جہان ہے۔

بقائے نفس کا راز | ایک مرتبہ عنوان زیر نظر کا پہلا صفحہ پھر اٹھنے۔ آپ دیکھیں گے کہ انسانی خودی (EGO) حیات جاوید کی آرزو مند تھی۔ وہ اپنا استہلاک نہیں چاہتی تھی۔ وہ فنا کے تصور سے خوف کھاتی تھی۔ ابلیس نے اسے شجرۃ الخلد کی طرف اشارہ کیا اور یوں اسے یہ سمجھایا کہ بقا کا مسئلہ حسی (استدلالی) علوم کے ذریعے حل ہو سکتا ہے اور انسان اپنی اولاد کی وساطت سے ہمیشہ زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کے برعکس ندائے آسمانی نے کہا کہ یہ گمراہی کی طرف دعوت ہے۔ فنا کی طرف بلاول ہے۔ بقا کا راز کچھ اور ہے۔

فَمَنْ شِيعَ هَذَا يَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۲۸) اگر تباہی و بربادی کے خوف سے مامون ہونا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریق ہے کہ "میری طرف سے بھیجی ہوئی ہدایت" کے مطابق زندگی بسر کرو یہ تمہیں سلامتی کے گھر کی طرف لے جائے گی۔ يَهْدِيْ بِهٖ اللّٰهُ مَنْ اَشْتَبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ (۵/۱۶)۔ تاریخ انسانیت پر نگاہ ڈالنے وہ ایک داستان نظر آئے گی اسی کشمکش پیہم کی کہ نشید کامرانی، استدلالی علوم (تنہا عقل انسان) سے فردوس گوش ہو سکتی ہے یا اس کے لئے وحی خداوندی کی ندائے جمال بھی ضروری ہے۔ مدعیانِ علم استدلالی نے کیا کیا؟ سب سے پہلے تنہا عقل کی رُو سے یہ فیصلہ کیا کہ نوع انسانی کے سامنے مسئلہ (PROBLEM) ہے کیا؟ اور پھر اس مسئلہ کا حل بھی عقل انسانی سے تلاش کرنا چاہا۔ آپ دیکھیں گے کہ علم استدلالی نے انسان کے مسئلہ کو اس کی طبیعیاتی زندگی سے آگے دیکھا ہی نہیں اس لئے کہ علم استدلالی خود متناہی ہے اور اس کی نگاہ متناہیت کی حدود سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔ اس نے انسان کو انسان کی حیثیت سے پہچانا ہی نہیں۔ اس لئے اس نے جو نظام بھی قائم کیا وہ انسانی ذات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے غلش و اضطراب کا جہنم بن کر مسلط ہو گیا۔ اس کے برعکس وحی کی روشنی نے اس کی راہ نمائی اس راستے کی طرف کر دی جو حسن و توازن کو ساتھ لئے ہوئے اسے اس جنت کی طرف لے جائے جس کی بہاریں خزاں نا آشنا اور جس کی شاواہیاں افسردگی نا دیدہ ہیں۔ (جَنَّتُ نَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَوْثَارُ خُلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا)۔

باب دوم

گذشتہ صفحات میں ہم نے علم انسانی کے مختلف ذرائع اور اس کے حدود و قیود اور لزومات و تضمینات کے متعلق فکری طریق سے بحث کی ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پس منظر میں قرآنی تصریحات کا بھی مطالعہ کیا جائے اور استنتاجی طریق (PRAGMATIC TEST) کی رو سے اس کی پیش کردہ تعلیم کو جانچا جائے۔ باب اقل میں سب سے پہلے عقل (یا علم استدلالی) سے بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کے لئے عقل کس قدر شرف و عزت کا باعث ہے اور قرآن کریم اس کی اہمیت پر کس قدر زور دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہ عقل کا اپنا دائرہ اثر و نفوذ اور حیطہ تحقیق و کشفیت ہے جس سے آگے یہ بڑھ نہیں سکتی اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ یہ وحی کا دامن پکڑ لے اسی کی روشنی میں **باندازِ دیگر** زندگی کی مسافت طے کرے یعنی وحی اور عقل کا وہی تعلق ہو جو سورج کی روشنی اور انسانی آنکھ کا تعلق ہے۔ جس طرح سورج کی روشنی کے بغیر انسانی آنکھ کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کے پاس دیدہ بینا نہ ہو تو اس کے لئے سورج کی روشنی کا ہونا اور نہ ہونا بھی کچھ فرق نہیں پیدا کرتا۔ لہذا شاہراہِ زندگی پر گامزن ہونے کے لئے انسانی عقل اور وحی کی روشنی دونوں کی ضرورت لاینفک ہے۔

قرآن اور عقل | قرآن کریم کو شہِ موع سے اخیر تک دیکھئے، ہر صفحہ پر عقل و بصیرت کی طرف دعوت نظر آئے گی۔ قرآن کریم کا مخاطب ہی عقل و دانش

لے اسی طرح ضمیر و وجدان اور باطنیت کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو وحی کے سایہ عاطفت میں لے آئیں جب ضمیر و وجدان وحی کی پیدا کردہ فضا میں پرورش پائیں گے تو ان کے فیصلے وحی کی روشنی میں ہوں گے۔ اسی طرح جب نفس کی قوتیں اس نظام کے عملی قیام میں صرف ہوں گی جو وحی کا منشا ہے تو پھر کشمکش حیات سے فرار کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ انسان کی تمام داخلی اور خارجی قوتیں وحی کے تابع ہوں اور اس کے عطا فرمودہ ضابطہ حیات کو ایک جیتے جاگتے نظامِ زندگی کی صورت میں تشکیل کرنے میں صرف کی جائیں۔

سے ہے۔ وہ حق و صداقت سے انکار کرنے والوں کے خلاف سب سے بڑا الزام ہی عائد کرتا ہے کہ وہ عقل و فہم سے کام نہیں لیتے۔ صُمُّ بُكْمٌ عُمًیٰ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۝ (۲/۱۷۱)۔ وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ یکسر اندھیرے میں ہیں۔

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا صُمُّوْا بُكْمٌ بِیَ الظُّلُمٰتِ ۚ مَنْ يَشَاۤءِ اللّٰهُ
يُضِلِّهُ ۚ وَ مَنْ يَشَاۤءِ يَجْعَلْهُ عَلٰی صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ ۝ (۶/۳۹)

اور جن لوگوں نے ہمارے قوانین کو جھٹلایا، تو ان کا حال ایسا ہو گیا ہے گویا بہرے گونگے تاریکیوں میں گم ہوں! سو جو شخص غلط راستوں پر چلنا چاہے، خدا کا قانون یہ ہے کہ وہ بھٹکا ہوا ہے گا اور جو سیدھے راستے پر چلنا چاہے (وہ کامیابوں کی طرف بڑھ جائے گا)۔ یہی خدا کا قانون ہے۔ وہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو بدترین خلاق قرار دیتا ہے۔

اِنَّ شَعۡرَ الدَّآۤءِبِ عِنۡدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیۡنَ لَا یَعْقِلُوۡنَ ۝ (۲۴/۴۶)
یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے بدتر حیوان وہ (انسان) ہیں جو بہرے گونگے ہو گئے، جو کچھ سمجھتے ہی نہیں!

وہ کہتا ہے کہ ایسے لوگ انسان نہیں ڈھور ڈنگر ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گزرے کہ حیوانات (مجبوراً ہی) اپنی جبلت پر تو قائم رہتے ہیں۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنۡسِ عَلَیۡ لَہُمۡ قُلُوۡبٌ
لَّا یَفْقَہُوۡنَ بِہَا ۚ وَ لَہُمۡ اَعۡیُنٌ لَّا یُبْصِرُوۡنَ بِہَا ۚ وَ لَہُمۡ اُذُنٌ
لَّا یَسْمَعُوۡنَ بِہَا ۚ اُولٰٓئِکَ کَاۡلَا نِعْمًاۤ اٰتٰی ہُمۡ اَصَلُّ ۚ اُولٰٓئِکَ ہُمُ
الْغٰفِلُوۡنَ ۝ (۷/۱۷۹)

اور کتنے ہی شہری اور بدوی لوگ ہیں جن کا انداز زیست بتا دیتا ہے کہ وہ جہنمی ہیں۔ (یعنی قانونِ مکافات کی رو سے ان کا ٹھکانا جہنم ہونے والا ہے اس لئے کہ ان کے پاس عقل ہے مگر اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں، مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے پاس کان ہیں، مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ (عقل و بصیرت کا استعمال کھو کر) چار پاؤں کی طرح ہو گئے۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ کھو گئے ایسے ہی لوگ ہیں جو یک قلم غفلت میں ڈوب

گئے ہیں۔

قرآن اپنی دعوت کو علی وجہ البصیرت پیش کرتا ہے۔ اندھی عقیدت کی بنا پر نہیں منواتا۔

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ قَفْ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي ۖ وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (۱۲/۱۰۸)

(اے پیغمبر! تم کہہ دو میری راہ تو یہ ہے کہ میں تمہیں جو خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو وہ دعوت علی وجہ البصیرت دیتا ہوں۔ اور (اس راہ میں) جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے ان کا مسلک بھی یہی ہوگا۔ اللہ اس سے بہت بلند ہے کہ اسے جہالت اور بے علمی کے زور سے منوایا جائے) نہ ہی وہ ایسا ہے کہ اس کے ساتھ کسی اور قوت کو شریک کیا جائے۔

اس لئے وہ ضد اور انکار کرنے والوں سے کہتا ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلیل دہران لاؤ۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا..... (۱۱/۱۴۹)

جن لوگوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا ہے وہ کہیں گے کہ اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہ کرتے اور نہ کسی چیز کو اپنے خیال کے مطابق حرام ٹھہراتے، سو (دیکھو) اسی طرح ان لوگوں نے بھی (سجائی کو) جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں یہاں تک کہ (بالآخر) ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا۔ (اے پیغمبر! تم کہو کیا تمہارے پاس (اس بارہ میں) کوئی علم و یقین ہے۔ جسے ہمارے سامنے پیش کر سکتے ہو؟ (اگر ہے تو پیش کر دو) اصل یہ ہے کہ تم پیروی میں کر رہے ہو مگر محض دہم و گمان کی۔ اور تمہارا یہ دعویٰ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مجھے بوجھ باتیں بناتے ہو!

لیکن دلیل ایسی جو حق و یقین پر مبنی ہو۔ ظن و قیاس پر اس کا مدار نہ ہو۔ کیونکہ حقیقت کے مقابلہ میں ظن و تخمین کا کچھ کام نہیں۔

وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ يَتْلِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ۖ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۚ (۵۳/۲۸)

اور (دیکھو) انہیں حقیقت کے متعلق کچھ بھی علم نہیں ہے۔ وہ محض ظن و قیاس کی پیروی کر

رہے ہیں اور بلاشبہ حق کے مقابلہ میں ظن و تخمین (کے گھوڑے دوڑانا) کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتا۔
 اسی لئے اس نے حکم دے دیا ہے کہ بلا علم و یقین کسی چیز کی پیروی مت کرو۔
 وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ
 كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُورًا ۝ (۱۷/۳۶)
 اور دیکھو، جس بات کا تمہیں علم و یقین نہیں اس کے پیچھے نہ لگا کرو۔ یاد رکھو، کان، آنکھ،
 قلب ان سب کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

اس لئے کہ میرا خداوندی میں اندھا اور آنکھوں والا، بہرہ اور سننے والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔
 مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصْمَىٰ وَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصْمَىٰ وَالْأَعْمَىٰ هَلْ
 يَسْتَوِينَ مَثَلًا ۖ خَلَا تَذَكُّرُونَ ۝ (۱۱/۲۴)
 ان دو فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے اندھا بہرا اور دیکھنے سننے والا۔ پھر بتلاؤ کیا دونوں
 برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے؟

قرآن کریم نے علم و عقل پر کس قدر زور دیا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے جس کا تفصیلی تذکرہ کسی آئندہ جلد
 میں آئے گا لیکن متذکرہ صدر اجمالی اشارات سے اس حقیقت کی ایک جھلک سی ضرور سامنے آگئی ہوگی۔
 ان حقائق کی روشنی میں کون دیدہ در کہہ سکتا ہے کہ اسلام علم و عقل کا مخالف ہے اس لئے تو اس
 زمانہ میں عقل و بصیرت کی عظمت کو دنیا کے سامنے پیش کیا جب دنیا جہالت اور توہم پرستی کو انسانیت
 کے لئے مایہ ناز سمجھا کرتی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کریم ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ عقل کا اپنا دائرہ ہے
 اور اس کی فضیلت و افادیت اسی دائرہ کے اندر ہے اس دائرہ

عقل کا دائرہ محدود ہے

سے آگے اس کے لئے دجی کی قندیل آسمانی کی راہ منائی کی
 ضرورت ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ آنکھ کی قوت کو بڑھانے کے لئے خارجی امداد کی ضرورت
 ہے۔ اندھیرے میں آنکھ بالکل نہیں دیکھ سکتی۔ تھوڑی سی روشنی (جو خارج سے آتی ہے) قوت بینائی کو بڑھا
 دیتی ہے۔ جوں جوں روشنی تیز ہوتی جائے حد نگاہ وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر اگر اس
 روشنی کے ساتھ دور بین بھی ہو تو ان حدود کی وسعت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جو چیزیں تنہا آنکھ کو
 کبھی نظر نہیں آ سکتیں وہ خوردبین اور دوربین کی مدد سے کھلی کھلی اور نکھری نکھری سامنے آ جاتی ہیں۔ اسی

طرح قوتِ سماعت کے حدود، آلاتِ مکبر الصوت (LOUD SPEAKERS) سے وسیع سے وسیع تر ہو جاتے ہیں جس طرح خارجی اثرات سے ان ذوائعِ احساس کی حدود وسیع ہو جاتی ہیں اسی طرح قوتِ فکر کی حدود بھی وحی کی روشنی سے کشادہ دامن ہو جاتی ہیں۔ تنہا عقلِ ظن و تخمین کی وادیوں میں محو حیرت سرگرداں رہتی ہے۔ لیکن وحی کی روشنی میں یقین کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے کہ وحی علمِ یقین ہے اور دلیلِ محکم!

عقل اور وحی | ہم نے کہا یہ ہے کہ وحی کی روشنی میں (i) عقل کی حدود بہت زیادہ وسیع ہو جاتی ہیں۔ اور (ii) وہ ظن و تخمین کی وادیوں میں بھٹکنے کے بجائے علمِ یقین کے محکم نقطہ پر پہنچ جاتی ہے۔ وحی انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے لئے اصول متعین کرتی ہے اور پھر عقل سے کہتی ہے کہ وہ ان اصولوں کی جزئیات متعین کرے اور ان کی تنفیذ و ترویج کے لئے اسباب و ذرائع تلاش کرے۔ مثلاً وحی کا ارشاد ہے کہ سود حرام ہے۔ اب عقل کا کام یہ ہے کہ وہ ایسا نظامِ معاشی وضع کرے جس میں سود کے بغیر کاروبار چل سکے۔ ظاہر ہے کہ جب دنیا میں ایسے بین الاقوامی نظامِ معاشی رائج ہوں جن کی بنیاد سود پر ہوں تو ان کے علی الرغم ایک ایسا نظام وضع کرنا جو اپنی اساس و بنیاد میں ان تمام نظامہائے معاشی سے مختلف ہو، لیکن اس کے باوجود دنیا میں نہایت آسانی سے رائج بھی ہو سکے، کارے باشد۔ سوچئے کہ ایسا نظام وضع کرنے کے لئے عقل کی حدود میں کس قدر کشادگی اور اس کی بنیادوں میں کس درجہ وسعت پیدا ہو جائے گی۔

بھریہ بھی دیکھئے کہ اگر عقل کے سامنے کوئی خاص اصول متعین نہ ہو تو اس کا جہاں جی چاہے گارک کر بیٹھ جائے گی اور اسی نقطہ کو منزل قرار دے دے گی۔ آپ کے پاس کوئی معیار نہ ہو گا جس کی رُو سے آپ یہ کہہ سکیں کہ عقل مقامِ مقصود تک نہیں پہنچی۔ راستہ میں ہی تھک کر بیٹھ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اقوامِ جنہوں نے نہا عقل کی رُو سے حیاتِ اجتماعیہ کے قوانین وضع کئے ان کی حالت یہ رہی (اور آج بھی یہی حالت ہے) کہ عقل نے جس مقام کو منزل کہہ دیا، وہ اسے منزل سمجھ کر بیٹھ گئے۔ لیکن تھوڑے سے عرصہ کے بعد مزید تجربات و مشاہدات یا یوں کہیے کہ داعیاتِ حیات نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ جس مقام کو منزل سمجھ لیا گیا تھا وہ منزل نہ تھا۔ یہ صرف فریبِ عقل تھا کہ اس نے اپنی خستگی و داماندگی کو منزل کی غلط تعبیر میں چھپا دیا۔ لیکن اگر انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے لئے اس کے اصول متعین ہوں (یعنی

منزل کا تعین پہلے کر دیا گیا ہو) تو عقل جیلہ جو آپ کو کبھی فریب نہ دے سکے گی۔ اس لئے کہ آپ جب تک منزل تک نہ پہنچ جائیں گے اسے چین نہ لینے دیں گے۔ اس لئے اسے ظن و قیاس کے بجائے علم یقین تک پہنچنا لازمی ہوگا۔ مثلاً آپ کسی بچے کو حساب کا سوال حل کرنے کے لئے دیتے ہیں اگر آپ نے اسہن کا صحیح جواب متعین کر کے اس کے سامنے نہیں رکھ دیا تو وہ جو جواب نکالے گا اسے صحیح تصور کر کے مطمئن ہو کر بیٹھ جائے گا۔ لیکن اگر آپ نے اس کا جواب متعین کر کے دے دیا ہے تو وہ اپنی عقل کو کبھی اطمینان سے نہیں بیٹھنے دے گا جب تک وہ اس جواب تک نہ پہنچ جائے جو آپ نے متعین کر کے دے دیا ہے یہی صورت عقل کی ہے۔ آپ اس کے سامنے اصولی قوانین نہ رکھتے تو وہ ہر مقام پر کہہ دے گی کہ صحیح جواب یہی ہے اور اس پر قناعت کر کے بیٹھ جائے گی۔ لیکن اگر اس کے سامنے اصولی قوانین موجود ہیں تو اسے طوعاً و کرہاً وہاں تک پہنچنا پڑے گا۔ اس طرح عقل ظن و تخمین کے فریب راہ کے بجائے علم و یقین کے صحیح مقام محمود تک پہنچ جائے گی عقل کی راہ نمائی اور عشق کی راہ نمائی میں یہی فرق ہے۔

ہر دو بہ منزلے رواں ہر دو امیر کار رواں عقل بہ جیلہ می برد عشق بر دکشاں کشاں

عشق زیادہ اور دخیمہ شش جہات را دست دراز می کند تا بہ طناب کہکشاں

یہ ہے وحی اور عقل کا تعلق یعنی وحی عقل کی حدود کو وسیع تر کرنے اور اس کے ظن و تخمین کو حتم و یقین میں تبدیل کرنے کے لئے ہے۔ جیسے روشنی آنکھ کی وسعتوں کو وسیع تر کرنے اور اس کے نتائج کو ظن و تخمین سے مبتدل بہ یقین کرنے کے لئے ہے۔ لیکن ہمارے ہاں جس طرح اور معاملات میں افراط و تفریط کی راہیں اختیار کی جاتی ہیں اور مسلک اعتدال و اقتصاد پر کبھی قائم نہیں رہا جاتا عقل کے معاملہ میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ایک طرف اگر محسوسات کی خوگر مغرب زدہ ذہنیتیں عقل سے آگے کسی اور سرچشمہ علم کو تسلیم ہی نہیں کرتیں تو دوسری طرف وہ ذہنیتیں بھی موجود ہیں جو عقل کی اس درجہ تنقیص و تذلیل کرتی ہیں گویا یہ نوع انسانی پر اللہ کا غضب

عقل کی تحقیر غلطی ہے

اور اس کی لعنت ہے اور اس سے بچنا انتہائی تقدس و توریع کی نشانی اور تماشا یہ کہ یہ لوگ اپنے دعوے کے ثبوت میں دلیل یہ لاتے ہیں کہ دیکھئے خود مغرب کے عقل پرست بھی سائنس کی محدودیت اور عقل کی ناقصیت کے قائل ہیں۔ حالانکہ عقل و سائنس کی محدودیت اور شے ہے اور اس کا قابل مذمت قرار دیا جانا اور شے۔ سائنس ماورائے مادہ اپنی تحقیقات کو نہیں بڑھا سکتی یہ اس کی محدودیت ہے۔ لیکن اپنے دائرہ کے اندر اس

کی علمی کاوشیں یقیناً سزاوارت حسین و تبریک ہیں۔ عقل کا دائرہ استدلال کی دنیا ہے۔ وہ اس سے آگے وحی کی دنیا میں قدم نہیں رکھ سکتی۔ یہ اس کی ناقصیت ہے۔ لیکن اس سے ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ اسے اس کے اپنے دائرہ کے اندر بھی قابل نفرت قرار دے دیا جائے۔ وحی ان دوائر کی حدود متعین کر کے ہر شے کو اس کی اصل پوزیشن عطا کر دیتی ہے۔ یہی ارباب حق و اعتدال کا مسلک ہے جن کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ
..... رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا ۖ سُبْحَنَكَ فَقِنَا عَذَابَ

النَّارِ ۝ (۱۹۰-۱۸۹/۳)

یقیناً تخلیقِ ارض و سما اور اختلافِ لیل و نہار میں ارباب دانش و بینش کے لئے (بڑی بڑی) نشانیاں ہیں۔ وہ (ارباب دانش) جو کھڑے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے) قوانینِ خداوندی کو ہر وقت اپنے سامنے رکھتے ہیں اور تخلیقِ ارض و سموات میں خود و فکر کرتے رہتے ہیں اور کامل تحقیق و تدقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ نظام کائنات تخریبِ نتائج کے لئے نہیں پیدا کر دیا۔ تیری ذات (اس سے بلند اور پاک ہے) کہ کائنات کا انجام تخریب ہو جو ایسا سمجھتا ہے اس کی سعی و عمل کی کمیتیاں مجلس کر رہ جاتی ہیں) اے ہمارے نشوونما دینے والے تو ہمیں اس قسم کے انجام سے محفوظ رکھنا۔

یہ ہیں وہ منازلِ جہاں استدلال اور وحی جنی عقل و عشق آپس میں بغلگیر ہوتے ہیں یا یوں کہئے کہ عشق (ایمان یا دجی کا وسیع دائرہ) عقل کے چھوٹے دائرہ کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ اور عقل اپنے فیصلوں کو عشق کی بارگاہ میں پیش کر کے سندِ حقیقت حاصل کرتی جاتی ہے جس کے بغیر اس کی قیمت کچھ بھی نہیں اس لئے کہ

ہزار بار نکو تر مستاع بے بصری
زدانشے کہ دل اور انہی کنت تصدیق

اس کے بعد ایک اور چیز ہمارے سامنے آتی ہے۔ باب اول میں بتایا جا چکا ہے کہ اس قلبِ مطہر

حقیقت منکشف ہوتی ہے | پر جسے اس عظیم الشان راز کائنات کی امانت گاہ بنانا مقصود ہوتا ہے حقیقت اپنے آپ کو منکشف کر دیتی ہے۔

قوانین فطرت کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں موجود ہوتے ہیں۔ انسان اپنے علم، مطالعہ، تجربہ اور مشاہدہ سے ان قوانین کو (DISCOVER) کرتا ہے۔ یعنی ان پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھا کر انہیں بے نقاب کر دیتا ہے اور یوں وہ قوانین ”غیب“ سے مشہود ہو جاتے ہیں۔ یہ انکشافات انسانی کسبِ ہنر کا نتیجہ ہیں۔ جوں جوں انسان اپنے علم اور مشاہدات میں ترقی کرتا جاتا ہے فطرت کی مضمّن قوانین بے نقاب ہوتی چلی جاتی ہیں۔

لیکن وحی کی یہ کیفیت نہیں۔ اس میں صاحبِ وحی مضمّن حقیقت پر سے خود پردے نہیں اٹھاتا۔ وہ ایسا کر نہیں سکتا۔ بلکہ حقیقت خود اپنے آپ کو اس پر منکشف کر دیتی ہے اور وہ ایسا صاحبِ وحی کے سوا کسی اور کے ساتھ نہیں کرتی۔ یہ وجہ ہے کہ وحی نہ انسانی کسبِ ہنر کا نتیجہ ہوتی ہے اور نہ ہی غیر انسانی کوئی انسان اس میں شریک ہو سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، وحی نبی کی اپنی داخلی قوتوں کا نتیجہ نہیں ہوتی۔

وہ اس پر خارج سے نازل ہوتی ہے۔ یہ ہے انسانی فکر اور وحی میں بنیادی فرق۔ وحی کی خصوصیت اس کی (OBJECTIVITY) ہوتی ہے۔ اسے قرآنی اصطلاح میں ”تنزیل“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وحی کی خارجیت | آپ قرآن کریم کو شروع سے آخر تک دیکھ جائیے ہر مقام پر وحی کی خارجیت پر زور دیا گیا اور اسے غیر مبہم الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔ یعنی وحی کا خدا کی طرف سے نزول ہوتا ہے۔

تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ (۳۶/۵)
خدا کے رحیم کی طرف سے منزل۔

اور

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۝ (۱-۲/۳۹)

(اور دیکھو) یہ کتاب اس خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو بڑے غلبہ اور حکمت والا ہے۔ (اے پیغمبر اسلام!) ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب (قرآن) سچائی کے ساتھ اتاری ہے۔ تم اپنے

نظام زندگی کو خدا کے لئے خالص رکھتے ہوئے صرف اس کے قوانین کی اطاعت و
فرماں پذیری اختیار کرو (اور بس!)

اسے جبریل امین لے کر نازل ہوئے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجَبْرِئِيلِ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ
مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ (۲/۹۷)
(اے پیغمبر اسلام!) جو جبریل کے دشمن ہوں ان سے کہہ دو کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو جبریل نے
اس کے حکم سے تمہارے قلب میں اتارا ہے اور یہ ان تمام صداقتوں کو سچ کر کے دکھائے گا
جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں اس میں نوع انسانی کے لئے ہدایت ہے اور ان لوگوں
کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں (فلاح و کامیابی کی) بشارت۔

اللہ تعالیٰ کی ذات جہت اور سمت کی تمام نسبتوں سے پاک ہے۔ اس لئے نزول وحی سے مراد یہ نہیں کہ کوئی شے
سچ مچ اوپر کی سمت سے نیچے کی سمت کو آتی ہے۔ خدا تو رگ جان سے بھی قریب ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۚ وَ
نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۝ (۵۰/۱۶)

اور بلاشبہ ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور جو کچھ اس کا نفس (اس کے دل میں) دوسو
ڈالتا ہے ہم انہیں بھی خوب خوب جانتے ہیں (ہم اس سے کچھ دُور تھوڑا ہی ہیں) ہم تو اس
کی رگ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔ (اس لئے اس کا ظاہر و باطن سرورِ علانیہ
کچھ بھی ہم سے چھپا نہیں رہ سکتا)۔

لے خدا کے متعلق 'اوپر کی سمت' کا تصور کچھ اس طرح انسان کے قلب کی گہرائیوں میں راسخ ہو چکا ہے کہ خدا کے نام کے
ساتھ ہی انگلی اوپر کو اٹھ جاتی ہے حتیٰ کہ اگر زبان سے کچھ نہ کہا جائے اور محض انگلی یا آنکھ سے اوپر کی طرف اشارہ کر دیا جا
تو بھی مخاطب سمجھ لیتا ہے کہ مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کی علو مرتبت کا تقاضا تھا کہ اس کے لئے بلند یوں کا تصوّر
ذہن میں قائم ہوتا۔ لیکن اس سے مقصود یہ نہیں کہ وہ سچ مچ کہیں اوپر کی سمت میں جا گزیں ہے۔

سُبْحَانَ اللَّهِ تَعَالَى عَمَّا يُصِفُونَ ۝

اس لئے وحی کی خارجیت سے اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ ذہن انسانی کی پیداوار نہیں، اور نہ ہی اس میں صاحبِ وحی کے کسب و ہنر کو کوئی دخل ہے۔

ابھی کہ بابِ اوّل میں لکھا جا چکا ہے۔ وحی اگر کسب و ہنر سے حاصل کی جاسکے تو جس ماحول میں رسول پیدا ہوتا، پرورش پاتا، بڑھتا،

پھولتا، پھلتا ہے اس ماحول میں اور لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔ اگر ایک انسان میں اکتسابِ حصولِ وحی کا امکان ہو تو دوسرے انسانوں میں بھی اس کا امکان ہو سکتا ہے۔ لیکن وحی اکتسابی چیز نہیں ہے۔ ایسی وہی ہے کہ اس منصبِ جلیلہ کے لئے اُسی ماحول میں سے مشیتِ خداوندی ایک خاص برگزیدہ ذات کا انتخاب کرتی ہے اور اس کے قلبِ مطہر کو وحی کی روشنی کا جیٹ بناتی ہے۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا ذُوْنَ النَّاسِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ بَصِيْرٌ ۝ (۲۲/۷۵)

اللہ نے ملائکہ میں سے بعض کو پیام رسانی کے لئے منتخب کر لیا۔ اسی طرح بعض انسانوں کو بھی بلاشبہ اللہ ہی سننے والا دیکھنے والا ہے!

حضرت یونسؑ کے متعلق ارشاد ہے۔

فَاَجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۶۸/۵۰)

چنانچہ یونسؑ کو اس کے پروردگار نے منتخب کر لیا اور اسے نیک کردار لوگوں میں سے بنا دیا (جو نبوت و رسالت کی صلاحیت رکھتے ہوں)۔

حضرت موسیٰؑ کے متعلق فرمایا۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۚ (۲۰/۴۱)

اور (دیکھ لے موسیٰ!) تجھے میں نے اپنی ذات کے لئے (آسمانی ہدایات اور نبی اسرائیل کی راہ نمائی کے لئے جو ایک مقصدِ الہی ہے) چن لیا ہے۔

رسول جب پیغامِ وحی کی تبلیغ کرتا ہے تو اس کے گرد و پیش کے لوگوں کو حیرت ہوتی ہے اس لئے کہ وہ ایسی باتیں کہتا ہے جن کی انہیں قطعاً اس سے توقع نہیں ہوتی وہ اسے اپنے میں سے ہی ایک سمجھتے اور اس سے اسی قسم کی امتیاز و ابستہ رکھتے ہیں۔ لیکن وہ نزولِ وحی کے ساتھ ہی کسی اور دنیا کی باتیں کرنے

لکھا ہے۔ جب حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو اس شرک سے روکا جو ان کے آباؤ اجداد سے ان میں متواتر چلا آ رہا تھا تو وہ فرط حیرت سے پکار اٹھے کہ

قَالُوا يٰصَلِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَذَا أَتَنْهَانَا أَنْ نَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَ إِنَّا لَفِي شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ۝ (۱۱/۶۳)
لوگوں نے کہا ”اے صالح! پہلے تو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی امیدیں تجھ سے وابستہ تھیں۔ پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ ان معبودوں کی اطاعت کریں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں (یہ کیسی بات ہے؟) ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہمارے دل میں اترتی نہیں۔

یہ موہبت کبریٰ نسبی اور قومی بھی نہیں ہوتی۔ حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ جلیلہ کے ضمن میں فرمایا:
وَ اِذْ اَبْسَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ کَاثِمٰتٍ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عٰہِدِیْ الظَّالِمِیْنَ ۝ (۲/۱۲۳)

اور (پھر غور کرو) وہ واقعہ جب ابراہیمؑ کو اس کے پروردگار نے مختلف قوانین کے ذریعے اسے زندگی کے مختلف مراحل میں گردش دی تھی اور اس نے ہر قانون کی پوری پوری اطاعت کی تھی۔ جب ایسا ہوا تو خدا نے فرمایا ”اے ابراہیم! میں تجھے نوع انسانی کا امام بنانے والا ہوں“ ابراہیمؑ نے عرض کیا جو لوگ میری نسل سے ہوں گے (ان کی نسبت کیا حکم ہے؟) ارشاد ہوا ”جو ظلم و معصیت کی راہ اختیار کریں“ تو ان کا میرے عہد میں کوئی حصہ نہیں!“

وحی صرف مشیت پر مبنی ہے | وحی اللہ کی رحمت ہے جو صرف مشیت پر مبنی ہوتی ہے۔

وَ لَا الْمَشْرِکِیْنَ اَنْ یُنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِنْ خَیْرِ مِّنْ رَبِّکُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۝ (۲/۱۰۵)

اہل کتاب میں جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے وہ اور مشرکین مکہ دونوں نہیں چاہتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر خیر و برکت (یعنی وحی الہی) نازل ہو۔ (اور اس لئے

وہ طرح طرح کے شکوک پیدا کر کے ہمیں اتباعِ حق سے باز رکھنا چاہتے ہیں، لیکن اللہ کا قانون اس بارے میں انسانی خواہشوں کا پابند نہیں ہو سکتا۔ وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے جُن لیتا ہے۔ اور وہ بڑا فضل رکھنے والا ہے!

اس کا علم صرف اللہ کی ذات ہی کو ہوتا ہے کہ اس منصبِ گرامی کے لئے کس ذاتِ اقدس کو منتخب کیا جائے گا۔

اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۚ (۶/۱۲۵)
 اللہ ہی اس بات کو بہتر جاننے والا ہے کہ منصبِ رسالت کس کو سپرد کرے۔

سورہ نمل میں ہے۔

يُنْزِلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ
 أَنْ أَنْذِرُوا أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُونِ ۚ (۱۶/۲)
 وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس غرض کے لئے جُن لیتا ہے کہ اپنے حکم سے ملائکہ وحی کے ساتھ اس پر بھیجے اور اسے حکم دے کہ لوگوں کو اس حقیقت سے خبردار کر دو
 ”میرے سوا کوئی معبود (قابلِ اطاعت و فرمانبرداری) نہیں ہے۔ لہذا میرے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرو۔“

سورہ مومن میں ہے۔

رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ۚ (۳۰/۱۵)
 اور (دیکھو وہ ہی) بلند مرتبوں والا اور صاحبِ عرش (حکومت) ہے (اس کے سوا کسی کی بادشاہت نہیں) وہ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے الروح (یعنی وحی) بھیجتا ہے۔ تاکہ وہ (خدا کے) سامنے ہونے کے دن سے (لوگوں کو) آگاہ کرے۔

چونکہ یہ موہبت مشیت پر مبنی ہے اس لئے اگر مشیت اسے سلب کر لینا چاہے تو اسے کوئی واپس نہیں لاسکتا ہے۔

وَلَمَنْ يَشَأْ لَنُذِهِبْ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لَمْ لَا نَجْعِدْ

لَا تَكِبْ بِهِ عَلَيْنَا ذِكْرًا ۝ (۱۷/۸۶)

اور (اے پیغمبر!) جو کچھ ہم نے تجھ پر وحی کی ہے، اگر ہم چاہیں تو اسے سلب کر لیں۔ پھر تجھے کوئی نہ ملے جو اس کے لئے ہم پر دکالت چلائے۔

اس اختصاص و اعتبار کی تو یہ حالت ہے کہ، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، خود رسول کو بھی رسالت سے پہلے اس کا علم نہیں ہوتا کہ وہ اس منصبِ جلیل کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔

خالص موہبت

حضرت موسیٰ جب اپنے اہل خانہ کے لئے آگ کی تلاش میں نکلے ہیں تو انہیں دُور سے ایک شعلہ نور دکھائی دیا۔ انہوں نے اسے آگ ہی کا شعلہ سمجھا اور نہایت سادگی سے اس کی طرف پلکے قریب پہنچے تو خطرہ قدس سے آواز آئی۔

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ ۝ (۲۰/۱۳)

اور دیکھ! میں نے تجھے (رسالت کے لئے) چُن لیا ہے۔ پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اسے کان لگا کر سن!

خود وہ ذاتِ اعلم الناس، معلم الحکماء، (فدا الہی و اُمّی)، جو شرف و رشدِ انسانیت کے معراجِ کبریٰ پر فائز اور علم و عقل کے افقِ اعلیٰ پر جلوہ ریز تھی اسے بھی وحی سے پہلے اس کا علم نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں۔

وَ كَذَلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُوْرًا تَهْدِيْ بِهٖ مِّنْ تَشَاۗءٍ مِّنْ عِبَادِنَا ۚ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِيْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ (۲۲/۵۲)

اور (دیکھ! اے پیغمبرِ اسلام!) اسی طرح ہم نے تیری طرف بھی اپنے حکم سے الروح (وحی الہی) بھیجی (ورنہ اس سے پہلے تو قطعاً نا آشنا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کسے کہتے ہیں؛ مگر ہم نے اس (الروح یعنی قرآن) کو ایک نور بنا دیا جس کے ذریعہ سے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں اپنے قانونِ ہدایت کے مطابق رہنمائی کر دیتے ہیں۔ اور اسی کے ذریعہ سے تو بھی (اے پیغمبر! لوگوں کو) سیدھے راستے کی طرف رہبری کر رہا ہے۔

نہ جانتے ہی تھے اور نہ ہی اس کی توقع تھی کہ آپ کو نبوت مل جائے گی۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُو أَن يُلْقَى إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ
فَلَا تَكُونَنَّ ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ ۚ (۲۸/۸۶)

اور (دیکھ اے پیغمبر!) تجھے کوئی امید نہیں تھی کہ تیری طرف الکتب (یعنی قرآن) بھیجی جائے گی۔
مکرمہ تو صرف تیرے پروردگار کی (تجھ پر) رحمت تھی کہ اس منصبِ جلیل کے لئے اس
نے تجھے چن لیا۔ تو یاد رکھ! ایسا کبھی نہ ہو کہ تُو نافرمان لوگوں کا مددگار بن جائے۔

وحی سے پہلے نہ لکھنا جانتے ہیں نہ پڑھنا۔ لیکن مہبط اس نور کے بنائے جا رہے ہیں جس سے اکتسابِ
ضیاء کرنے والے ساری دنیا میں علم و حکمت کے امام تسلیم کئے جائیں۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِّن قَبْلِهِ مِّن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذَا
أَرْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ۝ (۲۹/۲۸)

اور (دیکھ اے پیغمبر!) تُو نہ تو اس (قرآن) سے پہلے کوئی کتاب پڑھتا تھا۔ نہ ہی اپنے ہاتھ
سے کچھ لکھتا تھا جس کی بنا پر یہ یہودہ لوگ شک کر سکتے ہوں (پھر ان کا یہ بلا وجہ

شک و شبہ کس لئے ہے؟)
اسی لئے گرد و پیش کے لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ یہ تو ہم میں سے ایک آدمی تھا۔ اس پر وحی کس طرح آنے
لگ گئی!

أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَن أَوْحَيْنَا إِلَى رَجُلٍ مِّنْهُمْ أَن أَنذِرِ النَّاسَ
وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِندَ رَبِّهِمْ ۚ قَالَ
الْكَافِرُونَ إِنَّ هَذَا لَسِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ (۱۰/۲) : (۳۸/۲)

کیا لوگوں کو اس بات پر اچنبھا ہوا کہ ان ہی میں سے ایک آدمی پر ہم نے وحی بھیجی؟ اس
بات کی وحی کہ لوگوں کو (انکار و بد عملی کے نتائج سے) خبردار کر دے اور ایمان والوں کو
خوشخبری دے دے کہ پروردگار کے حضور ان کے لئے اچھا مقام ہے؟ کافر دل نے کہا۔ بلاشبہ
یہ شخص کھٹا ہوا جھوٹا ہے!

اسی لئے یہ لوگ جو حقیقتِ وحی سے ناواقف تھے کہتے تھے کہ خدا ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا؟
وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ ۚ

كَذَلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ
قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝ (۲/۱۱۸)

اور جو لوگ وحی کی حقیقت سے بے خبر ہیں وہ کہتے ہیں (اگر یہ تعلیم خدا کی طرف سے ہے تو کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ خدا ہم سے براہ راست بات چیت کرے یا اپنی کوئی (عجیب و غریب) نشانی ہی بھیج دے، تو دیکھو گمراہی و جہالت کی) جیسی بات یہ کہہ رہے ہیں، ٹھیک ٹھیک ایسی ہی بات ان لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اس بارے میں پہلوں اور پچھلوں سب کے دل ایک ہی طرح کے ہوتے (بہر حال) اگر یہ لوگ نشانیوں ہی کے طلبگار ہیں اور نشانیوں کی پہچان رکھتے ہیں، تو دیکھ لیں) ہم نے ان لوگوں کے لئے جو اے والے ہیں کتنی ہی نشانیاں نمایاں کر دی ہیں۔

یہ انتخاب کیسے ہوتا ہے؟ لیکن اعتبار رسالت اور اصطفاً وحی کے معنی نہیں کہ (معاذ اللہ) یہ انتخاب کیسے ہوتا ہے؟ معاذ اللہ! یونہی جس راہ چلتے پر نظر ٹک گئی اسی کو اس منصب کے لئے چُن لیا۔ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جب قوت عقل و فکر کے لئے مشیت خداوندی نے انسان کا انتخاب کیا ہے تو اس آب و گل کے میوے کو کس قدر ارتقائی منازل طے کرانے کے بعد اس جوہر کے قابل بنایا گیا تو جس برگزیدہ ہستی کو وحی جیسی مہبت عظمیٰ کے لئے منتخب کرنا اور اس کے قلب منور کو کائنات کے اسرار و رموز کا امین بنانا ہو وہ شرف انسانیت کے کس مقام بلند پر جلوہ فرما ہوگا۔ سورہ صٰح میں حضرات انبیاء کرامؑ کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔

وَ كُلٌّ مِنْ الْأَخْيَارِ ۝ (۲۸/۲۸)

اور وہ سب بہترین افراد نسل انسانی میں سے تھے۔

وہ تمام کے تمام برگزیدہ کائنات اور خیر ترین مخلوق تھے اور جو بہر خلق عظیم کے مظہر (وَ اِنَّكَ لَعَلٰی خَلْقٍ عَظِيْمٍ ۲۸/۲)۔ لہذا اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے کہ جس ذات کو آخر الامر منصب نبوت پر فائز کرنا مقصود ہوتا ہے اس کی تربیت کس طرح شروع ہی سے "خدا کی زیر نگرانی" ہوتی ہے اور کن کن مراحل سے گزار کر اسے مقام نبوت تک لایا جاتا ہے۔ سورہ طٰہ میں سرگزشت حضرت موسیٰؑ کا مطالعہ کیجئے۔ بات (۲۸) سے شروع ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کن حالات ہوئی کن حالات میں

وہ فرعون کے محلات میں پہنچے۔ وہاں ان کی تربیت کس طرح ہوئی۔ پھر کس طرح انہیں محلات کی زندگی سے نکال کر مدین کی شبانی کی طرف بھیجا گیا۔ وہاں کن کن صبر آزمائے مراحل سے گزارا گیا۔ ان تمام منازل مراحل کی تفصیل کے بعد ارشاد ہے کہ *ثُمَّ جَعَلْنَا عَلَى قَدْرِئِمُوسٰی (۲۰/۴۰) ”اے موسیٰ! ان تمام مراحل کے طے کرنے کے بعد کہیں جا کر تو ہمارے پیمانے پر پورا اُترا۔“ وَاصْطَنَعْنَاكَ لِنَفْسِنِی (۲۰/۴۱)* اس طرح نبی کو مقام نبوت کے لئے تیار کیا جاتا ہے لیکن اسے خود کچھ علم نہیں ہوتا کہ اس کی اس طرح تربیت کس مقصد کے لئے ہو رہی ہے۔

اس سے واضح ہے کہ نبوت کسب دہن سے نہیں ملتی یعنی یہ نہیں کہ ایک شخص کسی خاص طریقے پر چل کر اور خاص انداز کی ریاضتیں کر کے نبوت حاصل کر سکتا ہے۔ اسی انداز سے دنیا کے اور علوم تو حاصل کئے جاسکتے ہیں لیکن نبوت کا علم حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علم نبوت کشف و وجدان وغیرہ سے بھی یکسر الگ ہے یعنی ان دونوں میں صرف درجہ (DEGREE) کا فرق نہیں بلکہ دونوں کی نوعیتیں بالکل مختلف ہیں۔ یہ فرق کمیت (QUANTITATIVE) نہیں بلکہ کیفیت کا (QUALITATIVE) ہے۔ نبوت کی مثال دنیا کے کسی اور علم میں نہیں مل سکتی۔ نبوت اپنی مثال آپ ہے۔ یہ علم انسان کے اپنے اندر کے کسی مکہ کی بڑھی ہوئی شکل کا نام نہیں۔ یہ کوئی چیز ہی الگ ہے جسے غیر از نبی سمجھ ہی نہیں سکتا۔



اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے جس شخصیت کو نبوت کے منصب جلیلہ کے لئے منتخب کیا جانا مقصود ہوتا ہے، نگہ فطرت شروع ہی سے اس کی نگرانی و نگہبانی کرتی ہے اور وحی کا نزول اس پر خارج سے ہوتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ نبی میں ذاتی صلاحیتیں کوئی نہیں ہوتیں۔ وہ (معاذ اللہ) ایک ریڈیو کا سیٹ ہوتا ہے جس کے ذریعے دجی کی آواز براڈ کاسٹ کی جاتی ہے۔ بالکل نہیں۔ نبی اپنی سیرت اور کیریٹر کے اعتبار سے بلند ترین مقام پر ہوتا ہے۔ اور خدا سے دجی پانے کے بعد جو عظیم انقلاب وہ دنیا کے انسانیت میں برپا کرتا ہے وہ سب (دجی کی روشنی میں) اس کی ذاتی صلاحیتوں کا رہن منت ہوتا ہے۔ (تفصیل اس اجمال کی ”رسالت“ کے عنوان میں سامنے آئے گی)۔



ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ دجی کے پرکھنے کا ایک بڑا معیار اشتناجی طریق (PRAGMATIC TEST)

استنباحی طریق | ہے۔ اب اس گوشہ کی طرف آئیے۔ چونکہ (جیسا کہ آئندہ چل کرتاریخی شواہد و نظائر سے بتایا جائے گا) دنیا میں وحی کا مستند اور غیر محترف صحیفہ صرف قرآن کریم ہے۔ اس لئے اس باب میں قرآن کریم ہی کی تعلیم پیش کی جائے گی (اور حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں جہاں بھی وحی کی روشنی آئی تھی اس کی تعلیم اس آسا و بنیاد اُوی تھی جو قرآن کریم کے اندر ہے۔ وحی کی تعلیم میں اصولی طور پر کوئی فرق ہو ہی نہیں سکتا۔ فرق اس وقت پڑتا ہے جب وحی کی تعلیم میں تحریف انسانی رد و بدل کر دے) پھر اس تعلیم میں سے بھی چند اصولی باتیں پیش کی جاسکیں گی۔ اس لئے کہ اس کی تفصیل کے لئے معارف القرآن کی تمام کی تمام جلدیں وقف ہیں اور اس کے بعد بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکے گا کہ اس کی تعلیم مکمل ہو گئی ہے۔

آپ تاریخ کے اوراق کو چھٹی صدی عیسوی تک پیچھے لٹے اور یہ دیکھئے کہ اس زمانہ میں تمام دنیا میں انسانی ہیئت اجتماعیہ کی حالت کیا تھی؟ اس عہد میں ایران، یونان، مصر اور روم تہذیب و تمدن کے بڑے بڑے مراکز تھے۔ سب سے پہلے عقائد کی طرف آئیے تو آپ دیکھیں گے کہ اس وقت فکر و نظر کے تمام گوشوں پر کسی نہ کسی شکل میں شرک مستولی تھا۔ اور یہ عقیدہ جہلا کی توہم پرستی تک محدود نہ تھا بلکہ بڑے بڑے ارباب حکمت و بصیرت اس "ظلم عظیم" کی تاریکیوں میں مبتلا دکھائی دیتے تھے۔ حکمت یونان علم و آگہی کی سب سے درخشندہ مثال نظر آتی ہے۔ لیکن سقراط نے اپنے مقدمہ عدالت میں اس امر کا اعتراف کیا کہ وہ چاند اور سورج کو دیوتا مانتا ہے۔

(PLATO'S APOLOGY) آج چونکہ ہمارے سامنے بالعموم توحید کی صحیح عظمت نہیں ہے اس لئے ہم شرک کو محض ایک عقیدہ کی بجٹ تصور کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ بغور دیکھیں تو شرک

لے اس کے لئے دیکھئے میری تالیف "مذہب عالم کی آسمانی کتابیں"۔
لے اس کے متعلق چند ضمنی اشارات آدم کے عنوان میں بھی گزر چکے ہیں۔ اس لئے ان کے اعادہ کی ضرورت نہ تھی لیکن اس مقام پر چونکہ ذہن کو ایک اور نتیجہ کی طرف منتقل کرنا مقصود ہے اس لئے اس تکرار کو رد کر دیا گیا ہے۔

مرا معنی تازہ مدعا است

اگر گفت را باز گویم رواست

و توحید صرف علم کلام کے مسائل نہیں۔ بلکہ ان کا تعلق براہ راست زندگی کے اصولی اور بنیادی مباحث سے ہے۔ غور کیجئے کہ جب انسان اپنے ہاتھ کی تراشیدہ مصنوعات یا مظاہر فطرت کے سامنے جھک جائے تو اس میں شرف انسانیت کا شائبہ تک بھی باقی رہ سکتا ہے؛ دنیا میں جن قوموں کے حصّہ میں سرفرازی آتی ہے انہیں سب سے پہلے قامت انسانیت HUMAN STATURE عطا ہوتی ہے جس کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے سے کمتر یا اپنے برابر کسی کے سامنے نہ جھکے۔ اس جھکنے کے معنی صرف یہ نہیں کہ پتھر یا مٹی کی کسی مورتی کے سامنے نہ جھکے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون بھی صرف ایک خدا کا تسلیم کرے۔ جس طرح کائنات میں صرف ایک قانون نافذ العمل ہے اور وہ خدا کا قانون ہے (جسے قانون فطرت کہا جاتا ہے) اسی طرح انسانی معاشرہ میں بھی صرف خدا کا قانون نافذ العمل ہونا چاہیے جو وحی کے ذریعے ملتا ہے اگر کسی انسان نے کسی اور انسان کا یا اپنا خود ساختہ قانون اپنے لئے واجب الطاعت سمجھ لیا تو یہ شرکِ عظیم ہے۔

عقائد کے بعد ہیئت اجتماعیہ کی طرف آئیے تو نظامِ حکومت میں ملوکیت ایک مسلم آئین تھا اور اس کے خلاف کہیں کوئی آواز بلند نہیں ہوتی تھی۔ اس کی مخالفت میں آواز اٹھانا تو ایک طرف اس نے کچھ ایسے تقدس کی صورت اختیار کر رکھی تھی کہ اسے "آسمانی حق" (DIVINE RIGHT) تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس سے آگے بڑھتے تو پیشوائیت (PRIESTHOOD)

کی زنجیریں، قلب و دماغ کے ہر گوشے کو چاروں طرف سے جکڑے ہوئے تھیں۔ عمرانی زندگی میں انسانوں کی طبقاتی تقسیم پیدائش کی رو سے کی جاتی تھی۔ ذاتوں اور گوتوں کی ان آہنی دیواروں کی شکست و ریخت کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ رنگ و نسل اور ملک و وطن کی حدود نے نوع انسانی کو ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ احترامِ آدمیت کا معیارِ آدمیت کے بجائے مختلف اصناف و انتسابات قرار پا چکے تھے۔ انسان بہ حیثیت انسان کہیں پہچانا نہیں جاتا تھا بلکہ ملک و نسب اور شعبہ قبائل کی رو سے اس کے حقوق و واجبات کا تعین ہوتا تھا۔ انسان کے عہدِ جہالت میں "اپنے قبیلہ میں

لے اس کے ترجمہ کے لئے ہمیں کوئی موزوں لفظ نہیں مل سکا۔ اس لئے اسے کہیں پیشوائیت اور کہیں برہنیت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاں کہیں یہ الفاظ آئیں۔ آپ ان کے مفہوم پر نگاہ رکھیں۔

چوری کو جرم اور دوسرے قبیلہ میں قابل ستائش عمل قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ تخصیص وادی جہالت سے آگے بڑھ کر میدان تہذیب میں بھی اصول حیات بن چکی تھی۔ چنانچہ ”روما کے قانون کی رو سے اپنے ملک کی حدود سے باہر کے انسانوں کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حدود سلطنت کے اندر آزاد انسان کے حقوق شہریت اور ان سے متعلق مفاد حاصل ہوتے تھے۔ لیکن ان حدود سے باہر تمام انسان وحشی اور دشمن سمجھے جاتے تھے (SAMUEL; P-210)۔ معاشی نظام کی طرف آئیے تو سرمایہ داری ایسا ہی مسلم آئین تھا جیسے لوکیت۔ انہی غیر فطری نظام ہائے زندگی کی ایک شاخ غلامی کی لعنت تھی جو انسانی ہیبت و احترام کا ایک لاینفک جزو قرار پا چکی تھی۔ ارسطو کے ہاں ستر غلام تھے اور وہ غلامی کے جواز میں ستر دلائل دیا کرتا تھا۔ غرضیکہ اس زمانہ کی مہذب دنیا کی تاریخ کے کسی گوشے پر نگاہ ڈالتے۔ ہر طرف آئین زندگی ایسا ہی تھا۔ اس آئین حیات کے خلاف زبان تک حرف شکایت آنا تو کجا، دل کی گہرائیوں میں بھی کہیں تنگی اور گرانی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ گویا اس پنج زندگی کو عین ”فطرت انسانی“ کے مطابق سمجھ لیا گیا تھا۔ غور کیجئے کہ اس فضا میں، عرب کی جاہل اور وحشی سرزمین سے ایک شخص اٹھتا ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اسے دہی کچھ ہونا چاہیے تھا جو اس کے گرد و پیش کے انسان تھے اور اگر اس کی ذہنی سطح کو اس کے گرد و پیش کے انسانوں سے ممتاز بھی تصور کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اسے اس زمانے کی مہذب دنیا کا ایک مردانا قرار دیا جاسکے گا۔ اور اُس زمانہ کی مہذب دنیا کی جو حالت تھی اُس کا ذکر اوپر آچکا ہے لیکن وہ شخص اٹھتا ہے اور اُس آئین حیات کے ایک ایک گوشے کے خلاف جسے اُس زمانہ کی تہذیب و مذہب اور علم و دانش نے عین مطابق فطرت قرار دے رکھا تھا علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ وہ ایک ایسے انقلاب کا داعی بن کر متعارف ہوتا ہے جس میں اس آئین کہن کی بنیادیں تک اکھیر کر رکھ دی جائیں۔ وہ لوکیت کو خدا کی بدترین لعنت قرار دیتا ہے، تو ہم پرستی کو خلاف شرف انسانیت ٹھہراتا اور (PRIESTHOOD) کو فریبِ نفس کا ”مقدس“ نقاب بتاتا ہے۔ ذاتِ پات کی تقسیم کو طاغوتی قوتوں کا استبداد گردانتا ہے۔ سرمایہ داری کا نظام اس کے نزدیک ایک ایسا جہدام ہے جس نے جدید انسان کو مہلک جراثیم سے بھر رکھا ہے۔ غلامی کے تصور سے اس کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ قومیت پرستی (NATIONALISM) کے متعلق اس کا اعلان ہے کہ اس سے انسان خوشنود درندوں کی صورت اختیار

کر لیتا ہے۔ وہ اٹھتا ہے اور ساری دنیا کو پکار کر کہتا ہے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا اور بندے کا تعلق براہ راست ہے۔ اس کے لئے برہنیت (PRIESTHOOD) کے کسی درمیانی واسطہ کی ضرورت نہیں، وہ اعلان کرتا ہے کہ انسانی شرف و سعادت اور تعظیم و تکریم کا معیار اس کا گیر کثر اور اعمال ہیں۔ جن کی بنیاد ایمان پر ہے۔ پیدائش سے کسی انسان کو دوسرے پر کوئی فوقیت و افضلیت حاصل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سرمایہ داری بجز این نیست کہ بعض انسانوں نے قوت فراہم کر کے کمزور و ناتواں انسانوں کے حقوق کو غصب کر رکھا ہے۔ اس لئے تقاضائے عدل و انصاف یہی ہے کہ ان غصب شدہ حقوق کو ان غاصبوں کے ہاتھوں سے چھین کر ان کے اصل حقداروں تک پہنچا دیا جائے۔ وہ معاشی نظام (ECONOMIC SYSTEM) میں احتکار و اکتناز کو سنگین جرم قرار دیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ دولت کی گردش (CIRCULATION OF MONEY) اس انداز سے نہیں ہونی چاہیے کہ وہ صرف ایک خاص طبقہ کے اندر ہی پھرتی رہے۔ وہ کہتا ہے کہ آدمی کا آدمی ہونا اس کے لئے وجہ احترام ہے۔ اس لئے انسانوں کے اندر غلامی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تمام قبائلی اور قومی عصیتوں کو توڑ کر اس انقلابِ عظیم کا اعلان کرتا ہے کہ تمام نوعِ انسانی اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے اس لئے تمام رُوسے زمین کے انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد اور ایک شجرِ بلند و بالا کی شاخیں ہیں۔ نسل، رنگ، زبان، وطن کی غیر فطری دیواروں سے ان میں تفریق و تمیز پیدا کرنا جسدِ انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے۔ غرضیکہ انسانی (الفردی و اجتماعی) زندگی کے تمام غیر فطری آئین و وساتیر کے خلاف اعلان کرتا ہے اور صرف اعلان ہی نہیں کرتا بلکہ عملی طور پر انقلاب پیدا کر کے دکھا دیتا ہے کہ صحیح مقامِ زندگی کیا ہے؛ انسانوں کی داخلی اور خارجی دنیا میں اس کی طرف سے پیدا کردہ یہ انقلابِ عظیم مبنی ہوتا ہے اس انکشافِ حقیقت پر جس کی رُوسے وہ روحِ کائنات کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب کر وحدتِ حیات کے اصل الاصول کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے (خَلَقْنَاكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ) حقیقت یہ ہے کہ وحدتِ حیات کی اصل عظیم کا انکشاف ہی وہ محیر العقول انقلاب ہے

وحدتِ حیات کا تصور جس نے انسانی فکر و نظر کے تمام غلط زاویوں کو بدل دیا اور جس کی رُوسے انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل جدید صحیح خطوط پر وجود کو ش ہوئی۔ قرآن کی طرف سے

پیش کردہ یہ تصور فی الحقیقت دنیائے قدیم و جدید میں ایک حد فاصل ہے۔ یہاں سے نظام انسانیت کے دھارے کا رخ دوسری طرف منتقل ہو گیا جس نے نسل اور وطن کی غیر فطری حدود کو توڑ کر شعور انسانی میں عالمگیریت کا تصور بیدار کر دیا۔ قرآن کریم نے اپنے پہلے فقرہ میں اس عظیم المرتبت حقیقت کو واضح کر دیا کہ جس خدا کی یہ تعلیم ہے کہ وہ (رب العالمین) تمام اقوام و ملل کا نشوونما دینے والا ہے اس لئے اس نظام میں قومی عصبیت اور جماعتی رجحانات کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ اس کا مخاطب ”انسان“ ہے۔ انسانوں کا کوئی خاص گروہ نہیں ہے۔ قرآن کریم ذِکْرِی لِلْعَالَمِیْنَ ۵ (۶/۹۰) تمام اقوام عالم کے لئے ضابطہ حیات ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ یہ کتاب ہدایت نوع انسانی کے لئے نصاب زندگی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا

فِي الصُّدُورِ ۚ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۵ (۱۰/۵۷)

اے نوع انسانی! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک ایسی چیز آگئی ہے

جو مو عظت ہے دل کی تمام بیماریوں کے لئے شفا ہے، اور ہدایت اور رحمت ہے ان

تمام لوگوں کے لئے جو (اس پر) یقین رکھتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ جو نظام تمدن و سیاست عقل انسانی کی رُو سے مرتب ہو گا اس میں شعوری اور غیر شعوری طور پر کسی نہ کسی طرف جھکاؤ ضرور ہو گا۔ انسان کے سینے میں جب تک وھڑکنے والا دل ہے وہ کبھی جذبات کے میلان سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اور جذبات کا تقاضا ہے کہ وہ امیال و عواطف کی رنگینی قبول کر لیں۔ لیکن وحی کا سرچشمہ ان تمام میلانات و رجحانات سے پاک و بلند ہے اس لئے اس کے نزدیک تمام انسان یکساں ہیں۔ بقول اقبالؒ:

سو خود بیند نہ بیند سود غیر

عقل خود ہیں غافل از یہود غیر

در زکاءش سود و بیہود ہمہ

وحی حق بینند سود ہمہ

”بینند سود ہمہ“ کے معنی میں رب العالمین یعنی ربوبیت عامہ۔ ربوبیت سے مراد یہ ہے کہ ہر فرد کے اندر جس قدر مضمحل صلاحیتیں ہیں ان سب کی نشوونما (ربوبیت) اس طرح ہوتی چلی جائے کہ وہ اپنی تکمیل تک پہنچ جائیں۔ یہی وہ معاشرہ ہے جسے قرآن قائم کرنا چاہتا ہے۔ یعنی اس معاشرہ جس میں ہر فرد انسانہ کی صلاحیتیں مکمل نشوونما پالیں۔ اس کے معنی تکمیل ذات یا انفرادیت ہے۔ اس کو (DEVELOPMENT)

(OF SELF) کہا جاتا ہے یہی قرآن کی بنیادی تعلیم ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس نظام میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں ہوتا (جس طرح ایک قمقمہ اپنی روشنی اور حرارت کے لئے کسی دوسرے قمقمہ کا محتاج نہیں ہوتا)۔ بقول علامہ اقبالؒ اس نظام کی خصوصیت **انفرادی زندگی** یہ ہوتی ہے کہ

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتہ ہشدرم میں این است و بس

لیکن یہ نظام اس سے ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ انفرادی نشوونما کے یہ معنی نہیں کہ ہر فرد دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جائے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح افراد کی یہ صلاحیتیں ایک اجتماعی معاشروں کے اندر تکمیل پذیر ہوتی ہیں اسی طرح اس اجتماعی معاشرہ کی تشکیل بھی انہی افراد کے اجتماع و استلاف سے ہوتی ہے۔ اس نظام میں افراد اپنی تمام صلاحیتوں کو ہیئت اجتماعیہ کے استحکام کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح نو و حیات اجتماعی شکل میں قوی سے قوی تر ہوتی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی افراد (کی خودی) میں بھی پختگی اور استواری آتی جاتی ہے اور یوں ایک ایسا دائرہ قائم ہو جاتا ہے جس میں یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون کس کے زور پر آگے بڑھ رہا ہے۔ انفرادیت اور اجتماعیت کچھ اس طرح باہم گریہوست ہوتی ہے جس طرح جسم انسانی اور اس کے اندر خلیات حیات (LIFE CELLS) پورے جسم کا قیام خلیات کی زندگی پر ہے اور خلیات کی زندگی منحصر ہے جسم کی زندگی پر جسم خلیات کو قوت عطا کرتا ہے اور خلیات جسم کو دونوں کے وجود الگ الگ بھی ہیں اور دونوں مل کر ایک بھی۔ یا ایک اور مثال میں یوں سمجھئے جیسے ایک (FLY WHEEL) مشین کے پرزوں کو حرکت دیتا ہے اور مشین کے پرزے پھر اس (FLY WHEEL) کو گھماتے ہیں اور یوں باہمی تعاون و تناصر ہلکا نظم و ضبط کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے جسے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

زندگی انجمن آرار و ننگہ دار خود است

ایکہ در قافلہ بے ہمہ شو باہمہ رو

افراد کے ایغوجب اس نظام کے ماتحت اجتماعیت کی شکل اختیار کرتے ہیں تو چونکہ ان کی منفرد خصوصیات میں مماثلت ہوتی ہے اس لئے اس مماثلت و مشابہت سے ان میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور اس

ہم آہنگی سے ایسی فضا وجود میں آجاتی ہے جس میں ان (EGOS) کی پرورش کا سامان ہوتا ہے۔ اس فضا میں ہر شخص کو اس کی مضر صلاحیتوں کی نشوونما کا پورا پورا موقع ملتا ہے [تفصیل ان امور کی میری تصنیف ”نظام ربوبیت“ میں ملے گی۔]

اس نظام میں ہر معاملہ اصول پر مبنی ہوتا ہے اور اس کا فیصلہ ایک خاص قاعدے **میزان عدل** اور قانون کے ماتحت عمل میں آتا ہے جس میں نہ کسی کی رعایت ہوتی ہے نہ کسی پر زیادتی۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ (۵۷/۲۵)

ہم نے اپنے پیغمبروں کو یقیناً واضح دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ (آسمانی) کتابیں اور میزان (عدل) بھی اتاری (تاکہ وہ احکام الہی کے مطابق کامل انصاف اور عدل کے ساتھ لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کر سکیں اور) تاکہ لوگ انصاف کو قائم کر سکیں اور (ساتھ ہی) ہم نے لوہے کو (پیدا کیا) تاکہ جس میں بڑی طاقت اور لوگوں کے لئے بہت سی منفعتیں ہیں (یہ تمام چیزیں خدا نے اس لئے بھیجیں تاکہ دنیا میں امن و سلامتی کا دور دورہ ہو جائے) اور اس طرح یہ دیکھا جاسکے کہ کون لوگ اُس (کے نظام کی) اس کے نتائج دیکھے بغیر امداد کرتے ہیں۔ (اور کون لوگ نہیں کرتے؟) بلاشبہ (خدا کا نظام ان لوگوں کی امداد کا محتاج نہیں ہے) وہ بڑی قوت اور غلبہ والا ہے۔

آیات بالا پر غور کیجئے کہ سلسلہ رشد و ہدایت ”قانون اور میزان“ وغیرہ سے مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ نوع انسانی میں عدل قائم رکھا جاسکے (لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ) اس لئے قرآن کریم کا نصب العین تمام نوع انسانی کی فلاح و بہبود ہے وَ أَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمَا كُنْتُ فِي الْأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ (زمین میں وہی باقی رہتا ہے جو نوع انسانی کے لئے نفع رساں ہو) اور یہی وہ بلند بالا نصب العین ہے جسے انسانیت کا نصب العین قرار پانا زیب دیتا ہے اور جس پر درحقیقت تمام

اعمال کی بنیاد رکھی جانی چاہیے (SAMUEL) اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے :-
 نصب العین، فلاحِ نوع انسانی ہے۔ اور فلاح کا انحصار کسی ایک ہی چیز پر نہیں.....
 اس فلاح میں روحانی، اخلاقی، مادی، اجتماعی، انفرادی سب ہی قسم کے اجزاء آجاتے
 ہیں۔ یہ ہے حقیقی بھلائی جس کی تلاش انسان کا فریضہ ہے۔

یعنی ایسا انصاف زندگی جس کا مطمح نگاہ تمام نوع انسانی کا مفاد ہو اور مفاد بھی کسی ایک شعبہ زندگی کا
 نہیں بلکہ پوری کی پوری زندگی کا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم، عدل و انصاف کے معاملہ میں اپنے
 اور پرانے، یگانے اور بیگانے کی کوئی تمیز و تفریق روا نہیں رکھتا۔ حتیٰ کہ اس کا ارشاد ہے کہ وَكَأَنَّ
 يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ ٓأَلَّا تَعْدِلُوا ۖ اِعْدِلُوا قَدْ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی
 (۵/۸۸) کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے انصاف نہ کرو۔ ہمیشہ انصاف کرو
 کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔ اس سے اندازہ فرمایا جائے کہ وحی کی روشنی میں متعین کردہ نظام زندگی میں
 انسانی مساوات کس بلند مقام تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس عمارت کی بنیاد وحدت خالق اور
 وحدت حیات کا عظیم النظیر اصول ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن انسانوں کی تقسیم کفر و ایمان
 کی رُو سے کرتا ہے۔ لیکن اس تفریق میں ظلم و استبداد کا خاتمہ تک نہیں۔ اس تقسیم سے مراد یہ ہے
 کہ جو انسان نظام زندگی کو مذکورہ صدر اصول کی بنا پر مشکل کرنا چاہتے ہیں، وہ ایک جماعت کے فرد ہیں۔
 اور جو اس کے خلاف انسانوں کے خود ساختہ اصولوں کے ماتحت نظام حیات مرتب کرنا چاہتے ہیں۔
 وہ دوسری جماعت کے افراد۔ اور ظاہر ہے کہ فکر و عمل کے ایسے بنیادی اور طاساسی اختلاف کی بنا پر
 تفریق و تمیز ضروری ہے۔ لیکن (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) اس تفریق و تمیز میں بھی بے انصافی کسی
 صورت میں روا نہیں رکھی جاسکتی۔ انسانیت کے بنیادی حقوق، مومن و کافر، دونوں کے لئے یکساں ہونگے۔
 (تفصیل اپنے مقام پر آئے گی)۔ اسلام نے وحدت فکر و عمل کی احساس و بنیاد پر اس حقیقی اخوت و
 مساوات کی فلک بوس عمارت قائم کی جسے دیکھ کر غیروں تک نے اعتراف کر لیا کہ فی الحقیقت مساوات
 اسی کا نام ہے۔ عیسائیت خود مساوات و مواخات کی مدعی ہے۔ لیکن اسلامی مساوات اور عیسائیت

کی مساوات کے فرق کے متعلق ایک عیسائی مشنری کی زبان سے سنئے۔ (DR. MAUDE ROYDEN) اپنی کتاب
 (THE PROBLEM OF PALESTINE) میں لکھتی ہیں :-

مذہب کے مذہب نے سب سے پہلے اس حقیقی جمہوریت کا اعلان کیا جس کا تصور ذہن انسانی میں آسکتا تھا۔ اس کا خدا ایسی بلند عظمتوں کا مالک ہے جس کے سامنے دنیا کی ہر قسم کی تفریق و تقسیم بالکل مٹ جاتی ہے حتیٰ کہ تفریق رنگ و نسل کی گہری خلیج بھی ناپید ہو جاتی ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح مسلمانوں میں بھی معاشرتی طبقات موجود ہیں۔ لیکن اساسی (یعنی روحانی) طور پر سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ یہ بنیادی روحانی مساوات اس قسم کی افسانوی مساوات نہیں جیسی عام طور پر عیسائیوں کے ہاں پائی جاتی ہے۔ یہ مساوات مسلم ہے اور حقیقی۔ مختلف اقوام میں اسلام کی عالمگیر اشاعت کی یہی وجہ ہے۔ یہی چیز افریقہ میں آج اس کی قوت کا راز ہے۔ جہاں عیسائی مشنری اس مساوات کی (مکام) تبلیغ کرتے رہتے ہیں جس کا امتیازی نشان سفید اور سیاہ رنگ کی نمایاں تفریق کی صورت میں ہر جگہ سامنے رہتا ہے۔ یہ صرف مسلمان ہی ہے جو دیکھتا ہے کہ سفید بھورے اور کالے رنگ کے باوجود وہ ہر جگہ بھائی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی اخوت کا راز رنگ پر نہیں مذہب پر ہے۔

اور یہ آج گئے گزرے زمانہ میں حالت ہے جبکہ اسلام کی تعلیم قصہ ماضی بن کر رہ چکی ہے کہ یہ تصورات کسی صورت میں بھی ذہن انسانی کی تخلیق ہو سکتے تھے؟ اور یہ تصورات حیات پیش کس زمانہ میں کئے گئے؟ اُس زمانہ میں جب ساری دنیا میں ایسے تصورات قائم تھے جو اساسی طور پر ان کے یکسر مختلف تھے۔

دنیا وہیں آرہی ہے! اب اس سے ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ دنیا نے ان انقلابی تصورات زندگی کی مخالفت کی اور جی بھر کر مخالفت کی لیکن اس کے بعد اس تیرہ سو برس میں ہو کیا؟ یہ ہم سے نہیں خود ان مخالفین سے پوچھئے! انسان کھوکریں کھا کھا کر آہستہ آہستہ بتدریج بغیر نام لئے ان ہی تصورات حیات کی طرف بڑھ رہا ہے جن کی اس نے اس قدر مخالفت کی تھی۔ اس کی حالت یہ ہے کہ وہ تنہا عقل کے زور پر ایک نظام قائم کرتا ہے۔ لیکن اس کے ہاتھوں تنگ آکر اسے خود ہی تھوڑا پھوڑا دیتا ہے۔ اس شکست و ریخت میں اسے بڑی بڑی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں لیکن جب انسانیت آگ اور خون کی اس ہولی سے نکلتی ہے تو اس کا قدم اسی

نظام کی طرف اٹھتا ہے جس کی آواز چھٹی صدی عیسوی کی تاریکیوں میں سرزمین عرب سے بلند ہوئی تھی! انقلابِ فرانس پر غور کیجئے۔ اس نے کس طرح ملوکیت کے تصور کو باطل قرار دے دیا چنانچہ آج سلاطین کے ”آسمانی حقوق“ کا تصور عہدِ جہالت کی یادگار قرار دیا جاتا ہے۔ (SAMUEL) عیسائیت پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

اس نے سلاطین کے آسمانی حقوق کے عقیدہ کی تائید کی۔ اس لئے یورپ کی تاریخ میں اس عقیدہ نے جس قدر برائیاں پھیلائیں ان کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔

ملوکیت کے ساتھ ہی برہنیت (PRIESTHOOD) کے ”آسمانی حقوق“ کا تصور بھی رفتہ رفتہ ٹٹتا چلا جا رہا ہے۔ سموئیل لکھتا ہے کہ ”جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے۔ برہنیت کا عقیدہ معاشرتی ترقی کے راستے میں ایک سنگِ گراں بن کر حائل رہا ہے۔“ غلامی (SLAVERY) کا وجود (قریب قریب) مٹ چکا ہے۔ گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد دنیا کے معاشی نظام میں جو انقلاب واقع ہوا ہے وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ قومیت پرستی (NATIONALISM) کو تہذیبِ حاضرہ کا معرکہ آرا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن موجودہ جنگ (دوسری عالمی جنگ) میں اس کے خلاف جو کچھ دلوں کی دنیا میں اٹھ رہا ہے اس کے مظاہرے آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں۔ اقبالؒ نے کہا تھا۔

فطرتِ زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر

رہی ہے۔ (دیباچہ: پیامِ مشرق)

اس نئے آدم اور نئی دنیا کی تعمیر کے دھندلکے سے خلکے آئے دن خاکِ مغرب کے ذرات سے اُبھر کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ امریکہ کا مشہور سیاستدان ’مسٹر ونڈل ولکی (WENDELL WILKY) ساری دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا وہ دلوں کی اس تبدیلی کا آئینہ دار ہے جو اس باب میں دنیا کے انسانیت میں کروٹیں لے رہی ہے۔ اس نے لکھا تھا۔

اس سے قصد یہ ہے کہ اگرچہ ہماری نشوونما جنگِ عظیم سے شروع ہو گئی تھی۔ لیکن ہم اپنی

قومیت پرستی کے عہدِ طفولیت سے نکل کر جس میں تمام معاملات گھریلو قسم کے متصور ہوتے

تھے۔ اب ایک بالغ قوم کی حیثیت اختیار کر رہے ہیں جس کے پیشِ نظر بین الاقوامی مسائل

(ONE WORLD; P-133)

اور تمام دنیا کا تصور ہے۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے بیگانگت اور بیگانگت کا معیار رنگ و نسل نہیں بلکہ وحدتِ فکر و عمل ہے۔ مسٹر و لکی اس باب میں لکھتا ہے۔

میں بار و گردِ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس کٹ مکش میں یہ دیکھنے کے لئے کہ کون کون سے لوگ حریف اور کون کون سے حلیف ہیں معیار رنگ اور نسل نہیں۔ (ایضاً ص ۱۲۵)

اور فوراً آگے چل کر۔

اس جنگ کے بعد امریکہ کو تین راستوں میں سے کوئی ایک اختیار کرنا ہوگا۔ (i) تنگ

قومیت پرستی جس سے لامحالہ یہ مراد ہے کہ ہم آخر الامر اپنی آزادی بھی کھو بیٹھیں۔ یا

(ii) بین الاقوامی استعاریت جس سے مطلب کسی دوسری قوم کی آزادی کی قربانی ہے اور یا

(iii) ایک ایسی دنیا کی تخلیق جس میں ہر نسل اور ہر قوم کے لئے (نشو و ارتقا کے) یکساں مواقع

موجود ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اہل امریکہ بہت بڑی اکثریت سے اس آخری راستہ کو منتخب

کریں گے۔ (ایضاً ص ۱۲۴)

دیکھا آپ نے کہ دنیا کس طرح قومیت پرستی کی تاریک وادیوں سے نکل کر انسانیت کی ہمہ گیر وسعتوں کی طرف چلی آ رہی ہے؟

ان حقائق کو سامنے رکھتے اور سوچئے کہ دنیا علمی و عقلی ارتقاء کے ساتھ اس نظام کی طرف بڑھ

رہی ہے جو اُسے تیرہ سو برس پہلے دیا گیا تھا۔ یا اس کی مخالفت کر رہی ہے؟ آپ بلاشبہ ظن و تخمین

دیکھیں گے کہ دنیا غیر خدائی نظام زندگی کے ایک ایک شعبے کو آزمائش کے بعد ترک کئے جا رہی ہے اور یوں

بطریقہ استخراج (BY PROCESS OF ELLIMINATION) صحیح نظام زندگی کی طرف

کشاں کشاں چلی آ رہی ہے۔ اور اس طرح اس کی تمام دانش و بینش فی الحقیقت اس دائرۃ القلاب...

(علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے آستانِ عالیہ پر ٹھک رہی ہے جس نے انسانوں کی ہیئت، اجتماعیت کے

لئے ایسا نظام خداوندی پیش کیا جو عین انسانی ارتقاء کے مطابق ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس

نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ یہ نظام میرے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ علم الہی ہے۔ کیا اس

کے بعد بھی وحی کی صداقت کے متعلق کسی اور دلیل کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ اور پھر یہ کہ جب

اسی ذاتِ اقدس و اعظم کے دیئے ہوئے نظام کی کڑیوں کے متعلق آپ نے عقل و بصیرت کی

رُو سے دیکھ لیا۔ تجربہ اور مشاہدہ سے پرکھ لیا کہ وہ فی الواقعہ حقیقت پر مبنی ہے تو کیا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ اس تعلیم کا وہ حصہ جس پر دنیا ابھی عمل نہیں کر سکی غلط نہیں ہو سکتا۔ اس داعی انقلاب نے تیرہ سو برس پیشتر کہا تھا کہ اس تعلیم کو اس لئے نہ جھٹلاؤ کہ یہ ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ تو سرتاپا بصیرت و حکمت پر مبنی ہے۔ تمہاری علمی اور عقلی سطح ابھی اتنی بلند نہیں ہوئی کہ تم اس کا احاطہ کر سکو۔ چنانچہ جوں جوں انسان کی علمی و عقلی سطح بلند ہوتی گئی اس نے دیکھ لیا کہ یہ دعویٰ کس قدر سچا تھا۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے اس کے متعلق بھی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ عین مطابق علم و بصیرت ہے۔ لیکن ہمارے زمانہ کی علمی سطح ہنوز اتنی بلند نہیں ہوئی کہ اس کی صداقت کا ادراک کر سکے۔



اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ یورپ نے علمی و عقلی بنیاد پر قسماً آئی نظام حیات کے بعض اجزاء کو پرکھ کر دیکھ لیا ہے۔ لیکن عملی طور پر اس نظام کو بالکل قائم نہیں کیا۔ کہیں کہیں کھوڑا بہت مستعار لیا ہے۔ لیکن قرآنی نظام جزوں اور حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک مکمل نظام ہے جسے پورے کا پورا اختیار کرنا ضروری ہے۔

یورپ کا نظام اسلامی نظام نہیں

یہ ایک مشین ہے جس کا ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ کام دے رہا ہے۔ اس کے پرزوں کو نکال کر مختلف مشینوں میں لگا لینے سے اصل مشین کے نتائج کبھی مرتب نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے فرمایا: **فَاَدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً** یہ نظام پورے کا پورا اختیار کرنا ہو گا کہ حق و باطل میں اشتراک شرک ہے۔ قرآنی اور غیر شرآنی نظام کے اجزاء اکٹھے نہیں کیے جاسکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل معاملہ مختلف معاشرتی یا سیاسی قوانین و دساتیر کا نہیں بلکہ اس بنیاد کا ہے جس پر یہ تمام عمارت قائم ہوتی ہے۔ ادریہ بنیاد ہے اس حقیقت عظمیٰ کا اعتراف کہ صحیح نظام انسانیت کا قیام صرف اس تعلیم کی روشنی میں ممکن ہے جو حقیقتِ کلی کے ادراک پر

لے عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر یہ نظام ایسا ہی مبنی بر حقیقت تھا تو پھر یہ کھنسہ آگے کیوں نہ چلاؤ۔ رک کیوں گیا؟ اس کے متعلق اسی عنوان کے اخیر میں ”خلاصہ بحث“ ملاحظہ کیجئے۔

بنی ہو۔ اس تعلیم کا سرچشمہ وحی ہے اور اسی کا دوسرا نام ایمان باللہ۔ اگرچہ دورِ جدید کے مغربی محققین کائنات کے متعلق میکائیکی تصور کے ظلمتِ کدہ سے باہر آ رہے ہیں۔ لیکن ان کے سامنے ابھی تک اس خدائے حکیم و بصیر کا پورا پورا تصور نہیں آیا جسے وحی پیش کرتی ہے۔ گو اس کے دھندلے سے نقوش کہیں کہیں محسوس ہو رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ جب ابھی تک بنیاد ہی صحیح خط پر متشکل نہیں ہوئی تو اس پر قائم شدہ عمارت کو کس طرح صحیح تصور کر لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بساطِ سیاست میں مغرب کا نظام جمہوریت ہو یا معاشی دنیا میں آئین اشتراکیت یا اسی قسم کے دیگر قوانین و دساتیر انہیں کبھی اسلامی نظام قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اُن قوانین کے خلاف صدائے احتجاجی ہیں جن میں اس وقت تک انسانیت جکڑی چلی آرہی تھی۔ اور یہ آواز بلند ہوئی ہے اس اثر ہے جو قرآنی تعلیم نے غیر محسوس طور پر فضا میں پیدا کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں جو نظام زندگی آج قائم ہے وہ اس کے ہاتھوں بے حد نالاں ہے اور اسے تلاش ہے کسی ایسے نظام کی جو اس کے عالم سوز اضطراب کو مبدل بہ سکون کر دے۔ اور اس تلاش میں انہیں اس امر کا احساس ضرور ہو رہا ہے کہ اس نظام کی بنیاد صحیح مذہب ہی پر رکھی جاسکتی ہے۔ تنہا عقل پر نہیں۔

یورپ اور مذہب کی تلاش

سموئیل لکھتا ہے۔

دنیا یقیناً فوری طور پر مذہب کی محتاج ہے۔ انسان (ہمیشہ) درندوں کی طرح نہیں رہے گا کہ (ان کی زندگی کا مقصد) محض مادی ضروریات اور طبعی حوائج کی تسکین ہی ہو۔ روحانی جہد اس کی فطرت کی گہرائیوں میں ہے۔ یہ ذہنی یقین کہ دنیائے محسوس ہی (کائنات کی) آخری حد نہیں، ہمارے اندر (ہماری موجودہ نگ و تاز کے) بے معنی ہونے کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ ہمیں بہت سی ناقابل یقین باتوں پر ایمان لانے کے لئے کہا جاتا ہے لیکن یہ کہنا کہ کوئی چیز سرے سے ایسی ہے ہی نہیں جس پر ایمان لایا جائے۔ سب سے زیادہ ناقابل یقین بات ہوگی۔

اسی ایمان کا فقدان ہے جس کی وجہ سے دنیا آج اس طرح عدم طمانیت کی جہنم بن رہی ہے اور جس کی تلاش میں ہر نگہ دور رس مجنونانہ بے قرار پھر رہی ہے۔ بقول پروفیسر کوہن:،
جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ ان ایمان کے بغیر بھی رہ سکتا ہے اسے آج کے نوجوان

کی حالت کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جو مضطرانہ تلاش میں پھر رہے ہیں کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جس پر ایمان لایا جائے۔“

(THE CRISIS OF CIVILISATION)

یہ ایمان ہی کی شمع فروزاں ہے جو اس حقیقت کو انہماں پر بے نقاب کر دیتی ہے کہ زندگی امروز و فردا کے پیمانوں سے اپنے کی چیز نہیں۔ یہ ایک جوئے رواں ہے جس کے تسلسل و لامتناہیت کے سامنے کبکشاں بھی گمراہ ہے۔ پروفیسر جوڈاس باب میں لکھتا ہے:-

زندگی کے جادواں پیہم رواں عقیدہ ہی سے انسان میں امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی سے اس میں عدم کو وجود میں لانے اور دستور کو بے حجاب کرنے کا حوصلہ آتا ہے اور یہ جدوجہد کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے..... لیکن جب زندگی کی وسعتیں سکڑ کر محدود ہو گئیں۔ او اس آب و گل کی نیلی تلی دنیا کو اصلی حیات سمجھ لیا گیا تو پھر اعلیٰ قدروں پر ایمان کہاں۔

(ماخوذ از ماہنامہ کتاب لاہور)

یہ ایمان ہی ہے جو کسی نظام میں صحیح نتائج مرتب کرتا ہے۔ اچھے سے اچھا نظام بھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا تاؤ لگتی گلا اس کے ارباب جست و

ایمان اور سیرت

کشاو سے قلب و نگاہ کی پاکیزگی سے نہ چلا تیں۔ ایک نظام کو آپ حسابی قاعدے (MATHIMATICAL CALCULATIONS) سے جانچیں تو وہ نہایت عمدہ نتائج کا حامل دکھائی دے گا۔ لیکن عملی

دنیا میں اس کے نتائج ویسے مرتب نہ ہوں گے۔ اس لئے کہ اگر اس نظام کو مشینوں کے ذریعے نافذ کیا جائے تو اس پر خارجی موثرات اثر انداز نہیں ہوں گے۔ لیکن وہ مشینوں کی جگہ انسانی قلوب و اذہان کی جگہ سے نافذ ہوتا ہے۔ اس لئے جب تک اس نظام میں تطہیر فکر و نظر کی صلاحیت نہ ہوگی وہ عمدہ نتائج پیدا نہیں کر سکے گا۔ وحی کے ذریعے سے جو نظام مرتب ہوتا ہے اس کی بنیاد اس حقیقت عظمیٰ پر ہے کہ اس نظام کو چلانے والی جماعت کے لئے سیرت کی بلندی لاینفک ہے سیرت کی بلندی کے لئے بھی وہ کوئی خارجی ذرائع اختیار نہیں کرتا بلکہ خود اس نظام کے اندر یہ خوبی موجود ہوتی ہے کہ اس کے اتباع سے قلب و نظر میں از خود پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے بلکہ یوں کہتے کہ سب سے پہلے ہی چیز پیدا ہوتی ہے۔ باقی سب کچھ اس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وَ عَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لِيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ (۲۴/۵۵)۔ یعنی استخلاف فی الارض فطری نتیجہ ہوتا ہے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا اور یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر سیرت اور کیر کٹر کا قصرِ مشید استوار ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس نظام کے قیام سے انسان میں سیرت کی بلندی پیدا ہوتی ہے اور سیرت کی بلندی سے اس نظام میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور اس طرح یہ ایک ایسا دائرہ بن جاتا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام برکتیں اس کے اندر آ جاتی ہیں (جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ (۲/۱۳۳)۔ یہی وہ نظام ہے جس کی بنیاد ایمان پر ہوتی ہے۔ اور ایمان کے بغیر سیرت میں پختگی آ نہیں سکتی۔ بقول (HUXLEY) ”مذہبی احساس سیرت کے لئے لازمی بنیاد ہے“

(ESSAY IN PAPULAR SCIENCE)

اس نظام میں حُسنِ عمل اپنے زندہ نتائج کی بنا پر حوصلوں کی افزائش اور بہتوں کی بلندی کا موجب بنتا چلا جائے گا۔ اس سوسائٹی میں معیارِ عزت و فضیلت صرف تقویٰ ہوگا۔ یعنی یہ حقیقت کہ کون اپنی زندگی کو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگ رکھتا ہے اس معاشرہ میں ہر فرد دوسرے افراد کو کھوس تعمیری نتائج مرتب کرنے والے پروگرام پر عمل کرنے اور اس پر استقامت سے جے ربنے کی تلقین کرے گا۔ (وَتَوَّاصُوا بِالْحَقِّ وَتَوَّاصُوا بِالصَّبْرِ) بُرائی کو ہر جگہ اور ہر مقام پر بُرا اور اچھائی کو اچھا سمجھا جائے گا۔ اور اسی میں انسانیت کی فلاح و سعادت کا راز ہے (STUART MILL) لکھتا ہے۔

اگر عدل، صداقت اور احسان کے اصولوں کی تعلیم کو جلوت و غلوت میں عام نہ کیا جائے۔
اگر ان محاسن کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے اور ان کے برعکس معائب کو روکا نہ جائے تو
یقیناً نوعِ انسانی کی حالت ابتر ہو جائے۔

(NATURE : THE UTILITY OF RELIGION AND THEISM)

اور یہ اصول عدل و صداقت کسی خاص قوم اور ملک تک محدود نہیں رہیں گے۔ بلکہ ان کی وسعتیں تمام نوعِ انسانی کو اپنی آغوش میں لے لیں گی۔ وحی کی یہی تعلیم ہے اور آج زمانہ نے اپنے تقاضوں سے ہر صاحبِ فکر کو اسی نتیجہ پر پہنچایا ہے۔

پہلے پہل، مذہب نے انفرادی نجات پر زور دیا۔ پھر جب اجتماعی اخلاق کی اہمیت سامنے

آئی تو اس نے سوسائٹی کے لئے جدوجہد اور ایثار کی تاکید کی۔ لیکن اب جبکہ ایک بین الاقوامی ضابطہ اخلاق کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے تو مذہب کے لئے بھی ضروری ہے کہ اپنی توجہ کو اسی نقطہ پر مرکوز کرے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ تمام کلیسا مذہب کے ذریعے ایک عالمگیر اخوت کی تحریک چلائیں۔
(SAMUEL; P-238)

سیرت کا مدار ایمان پر ہے | ہم نے یہ بتایا ہے کہ ایمان سے انسانی سیرت میں بلندی اور پختگی پیدا ہوتی ہے۔ معاملات کی دنیا میں یہ ہو سکتا ہے کہ آپ بنا بر مصلحت، دیانتداری کو بہترین پالیسی (حکمت عملی) قرار دیں یا سوسائٹی میں عزت حاصل کرنے اور دنیا میں مقبولیت کی زندگی بسر کرنے کے لئے آپ راست بازی اور حسن معاملگی کی روش اختیار کریں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اس روش کو عقل و دانش کی رُوس سے بہتر خیال کریں۔ یا یہ کہ آپ طبعاً منکسر المزاج، متواضع، خلیق، رحمدل واقع ہوئے ہوں۔ یا صدقہ اور خیرات (دان اور پن) کے بعض کاموں کو نیکی کے کام تصور کر کے انہیں رسماً ادا کریں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی سیرت کی پختگی نہیں کہلا سکتی۔ حسن سیرت کا تعلق نہ عقلی فیصلوں سے ہے نہ رسمی اعمال و کردار سے۔ سیرت کی پختگی اور بلندی دل کی تبدیلی سے متعلق ہے۔ اس کی تمام عمارت قلب کی بنیادوں پر اٹھتی اور استوار ہوتی ہے۔ جب تک دل کی دنیا میں انقلاب نہیں پیدا ہوتا۔ جب تک نگاہ کے زاویے نہیں بدل جاتے اس وقت تک تطہیر فکر اور صحیح اعمال ممکن نہیں۔ اور تخمین دزنین سیرت، فکر و نظر کی تطہیر و تہذیب ہی کا نام ہے نہ عقلی فیصلوں کا۔

خود نے کہہ بھی دیا اَوَّالہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہی وجہ ہے کہ فلسفہ حسن سیرت کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ یعنی حسن سیرت کا تعلق استدلالی دنیا سے نہیں

لے چونکہ سمویل کے سامنے مذہب عیسائیت ہے اس لئے اس نے تدریجی مراحل کا ذکر کیا ہے جن کی رُوس سے وہ انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف آیا۔ اور اب اسے دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ بین الاقوامیت کی طرف توجہ کرے۔ لیکن دجی کی غیر محرف تعلیم (قرآن) نے تو پہلے دن سے ہی انسانوں کی عالمگیر برادری کا تصور پیش کیا ہے۔

عمل کی دنیا سے ہے جس کی بنیاد ایمان پر ہے SCHLUMBERGER کے الفاظ میں۔
 فلسفہ کی اصطلاحات انسانی جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکتیں۔ ان سے ہماری روح کی دنیا
 میں کوئی صدائے بازگشت نہیں اٹھتی کسی قسم کی گونج نہیں پیدا ہوتی۔ وہ ہمیں ایک خالص
 عقلی تصور سے ”زندہ خیال“ کی طرف نہیں لے جاتیں۔

ہم نفس سے متعلقہ بحث میں (گذشتہ ادراک میں) مبتلا چکے ہیں کہ جوں جوں انسانی ذات میں وسعت
 اور بلندی پیدا ہوتی جاتی ہے اس میں (حدِ بشریت کے اندر) امانے مطلق (خدا) کی صفات مرتسم
 ہوتی جاتی ہیں۔ اسی کا نام حسن سیرت ہے۔ جب تک قلب کی دنیا میں اس انداز سے تبدیلی واقع نہیں
 ہوتی، سیرت کا مدار عقلی فیصلوں پر رہتا ہے جن پر کبھی اعتمادِ کلی نہیں کیا جاسکتا۔ صفاتِ خداوندی کے
 انسانی ذات میں منعکس ہوتے چلے جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی تمام آرزوئیں اور تمنائیں اس
 کے میلانات و رجحانات اس کے محبوبات و مطلوبات اس کی خواہشات
حسن سیرت کیا ہے؟ | مقتضیاتِ سب اس چشمہ حسن و خیر سے ہم آہنگ ہوتے جاتے ہیں۔
 اس کا نام ہے سیرت کی بلندی اور پختگی۔ علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں:۔

مذہب کی آرزوئیں فلسفہ سے کہیں زیادہ بلند پرواز ہوتی ہیں۔ فلسفہ چیزوں کو عقلی طور پر دیکھتا
 ہے..... وہ حقیقت کو فاصلہ سے دیکھتا ہے، لیکن مذہب حقیقت سے قریبی تعلق پیدا
 کرتا ہے۔ ایک (یعنی فلسفہ) صرف نظریہ ہے۔ اور دوسرا (یعنی مذہب) جینا جاکتا تجربہ
 اور قربی اور گہرا تعلق اس گہرے تعلق کے حصول کے لئے خیال کو اپنی سطح سے بلند ہونا چاہیے
 اور یوں اپنے مقصود کو قلب کی اس کیفیت کی رو سے حاصل کرنا چاہیے جسے مذہب کی زبان
 میں دعا کہتے ہیں۔ دعا یعنی ان (گراں بہا) الفاظ میں سے ایک لفظ جو آخری وقت حضورؐ
 نبی اکرمؐ کی زبانِ اقدس پر تھے۔ (خطبات، ص ۵۸)

دُعا کا مفہوم | دُعا کیا ہے؟ سازِ فطرت کے نغمہ ازل سے ہم آہنگ ہونے کی حسین تمنا۔ عروس
 حقیقت کے حسن جہاں آرا و جاں نواز کی دل فریب رعنائیوں سے یک رنگی کی

لے ہم نے (PRAYER) کا ترجمہ دُعا کیا ہے۔

مچلتی ہوئی آرزو چکور کے سینے میں چاند کو اپنے سینے کے اندر سمو لینے کی لہکشاں گیر و فلک پہیا والہاں
 انگ۔ قلب پروانہ میں شمع فردزاں کے انداز و اسلوب جذب کر لینے کا وجد انگیز ورقص آفریں جوش
 و غروش۔ یعنی انسانی خودی کا اپنی تنہا بہت کو وسیع سے وسیع کرتے چلے جانے کا بیتابانہ دلولہ، اور
 اس دلولہ کی تسکین کے لئے قطرہ شبنم کی، سورج کی شعاعوں سے بازوئے شاہین کی حسن طلب بغور
 دیکھنے تو ایمان، دعا اور عمل تینوں ایک ہی شمع کی کرنیں اور ایک ہی پھول کی پنکھڑیاں ہیں۔ ایمان اس
 حقیقت کے اعتراف کا نام ہے کہ انسانی سیرت کی بلندی کا راز، نظام عالم کے مرکز و خوبی سے ہم آہنگی
 میں پوشیدہ ہے۔ دعا اس ہم آہنگی و یک رنگی کی شدید تڑپ ہے۔ اور عمل اس تڑپ کا زندہ مظاہرہ اور
 اس کے حصول کے لئے پیہم کوشش مشہور عالم نفسیات (ولیم جیمز) لکھتا ہے کہ:-
 سائنس جو جی میں آئے کرے۔ انسان رہتی دنیا تک، برابر دعا میں مشغول

رہے گا۔ (خطبات، ص ۸۴)

غرضیکہ وحی ایک ایسا نظام قائم کرتی ہے جس میں اس نظام کے متبعین کی سیرت ایک خاص قالب میں
 ڈھل جاتی ہے جو جلال و جمال، یعنی قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت کا ایک عجیب و غریب پیکر ہوتا
 ہے جس میں تسلیم و رضا اور غلبہ و تسلط کے متضاد عناصر کا حسین
نیٹشے کا فوق البشر | امتزاج نظام انسانیت کو نقطہ اعتدال پر رکھنے کا موجب بنتا ہے۔

آج یورپ جس عذاب میں گرفتار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے سامنے "فوق البشر" (SUPERMAN)
 کا وہ تصور ہے جو نیٹشے کی تعلیم کا پیدا کردہ ہے اور جس میں "اندھی قوت" خلاصہ مادی پیکروں میں ڈھلی
 ہوئی سامنے آتی ہے۔ نیٹشے کے "فوق البشر" کی خصوصیات کے متعلق A. H. J. NIGHT اپنی کتاب

(SOME ASPECT OF THE LIFE AND WORKS OF NIETZSCHE)

میں لکھتا ہے۔

(فوق البشر) اہم مقاصد کی خاطر اخلاقی پابندیوں سے آزاد، فعال، خلاق، ہر قسم کی زنجیریں
 کو توڑنے والا اور کسی کے حکم کو نہ ماننے والا۔ اس کے نزدیک زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی ہوگی۔
 ہر شے جو فوق اور قوت کی راہ میں حائل ہوگی فنا کر دی جائے گی۔ گناہ، جہنم، موت، ضمیر
 (کی آواز) کا خوف (دل سے) نکال دیا جائے گا۔ (اس کے نزدیک) کسی پر رحم کھانا، بیماری

یا خود غرضی کے مراد ہو گا۔ اس لئے کہ یہ چیز عمل کے راستے میں روڑا اٹکاتی ہے۔ اس کا

نصب العین یہ ہو گا کہ صلابت یعنی سختی (HARDNESS) دنیا میں بے بہائی کی ہے۔

اندازہ فرمائیے! جو تمدن مادہ پرستی کی اندھی قوتوں کے اس تصور پر اٹھے، اس کے نتائج کس قدر عالم سوز ہوں گے؟ جب تک قوت وحی کے تابع نہ ہو، دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔

ہم نے بات یہاں سے شروع کی تھی کہ وحی کی تعلیم کو پرکھنے کا طریق استنتاجی (PRAGMATIC) ہے۔ یعنی آپ اس کے نتائج سے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کی تعلیم کیسی ہے۔ اس باب میں اگر یہ دیکھنا ہو کہ قرآن وہ کونسا نظام زندگی پیش کرتا ہے جس کی مثل اور نظیر دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکتی اور اس نظام کے نتائج و ثمرات کیا ہوں گے؟ تو اس کے لئے میری تصنیف ”نظام ربوبیت“ دیکھئے جس میں قرآن کی بنیادی تعلیم اور اس کے خوشگوار نتائج کو واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہیں سے آپ کو اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا کہ اگر اسلام کا نظام ایسا ہی کامیاب اور خوشگوار نتائج کا حامل ہے تو وہ چند دن تک چل کر ختم کیوں ہو گیا۔ آگے کیوں نہ بڑھا۔

باب سوم

لفظ وحی کے لغوی معانی ہیں۔

(۱) خفی سا اشارہ جس میں تیزی بھی شامل ہو۔ یعنی تیز، خفی اشارہ۔

(۲) کتابت۔ یعنی لکھنا۔

(۳) حکم کرنا۔

(۴) کسی بات کا کسی کی طرف اس طرح پہنچانا کہ اسے اس کا علم ہو جائے خواہ اسے پہنچانے کی

کیفیت یا ذریعہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

لے چاہوں گے لئے دیکھئے میری لغات القرآن، باب (د۔ ح۔ ی)۔

یا خود غرضی کے مراد ہو گا۔ اس لئے کہ یہ چیز عمل کے راستے میں روڑا اٹکاتی ہے۔ (اس کا نصب العین یہ ہو گا کہ) صلابت یعنی سختی (HARDNESS) دنیا میں بے بہائی کی ہے۔ اندازہ فرمائیے! جو تمدن مادہ پرستی کی اندھی قوتوں کے اس تصور پر اٹھے، اس کے نتائج کس قدر عالم سوز ہوں گے؟ جب تک قوت وحی کے تابع نہ ہو، دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔ ہم نے بات یہاں سے شروع کی تھی کہ وحی کی تعلیم کو پرکھنے کا طریق استنتاجی (PRAGMATIC) ہے۔ یعنی آپ اس کے نتائج سے یہ دیکھ سکتے ہیں کہ اس کی تعلیم کیسی ہے۔ اس باب میں اگر یہ دیکھنا ہو کہ قرآن وہ کونسا نظام زندگی پیش کرتا ہے جس کی مثل اور نظیر دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکتی اور اس نظام کے نتائج و ثمرات کیا ہوں گے؟ تو اس کے لئے میری تصنیف ”نظام ربوبیت“ دیکھئے جس میں قرآن کی بنیادی تعلیم اور اس کے خوشگوار نتائج کو واضح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہیں سے آپ کو اس سوال کا جواب بھی مل جائے گا کہ اگر اسلام کا نظام ایسا ہی کامیاب اور خوشگوار نتائج کا حامل ہے تو وہ چند دن تک چل کر ختم کیوں ہو گیا۔ آگے کیوں نہ بڑھا۔

باب سوم

لفظ وحی کے لغوی معانی ہیں۔

(۱) خفی سا اشارہ جس میں تیزی بھی شامل ہو۔ یعنی تیز، خفی اشارہ۔

(۲) کتابت۔ یعنی لکھنا۔

(۳) حکم کرنا۔

(۴) کسی بات کا کسی کی طرف اس طرح پہنچانا کہ اسے اس کا علم ہو جائے خواہ اسے پہنچانے کی

کیفیت یا ذریعہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

لے چاہوں گے لئے دیکھئے میری لغات القرآن، باب (د۔ ح۔ ی)۔

لیکن اصطلاح میں اس کے معنی ہیں وہ علم جو خدا کی طرف سے کسی انسان کو براہ راست دیا جائے۔ اس کے حامل کو نبی کہتے ہیں۔ اور غیر از نبی اس میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ وحی کا یہ سلسلہ حضور خاتم النبیینؐ پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کسی کو خدا کی طرف سے براہ راست علم نہیں مل سکتا۔ جو اس کا دعویٰ کرتا ہے وہ درحقیقت نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشف والہام وغیرہ کے تصورات سب غیر قرآنی ہیں اور مہر نبوت کے توڑنے کے موجب۔ خدا کی طرف سے براہ راست علم ملنے کا ایک ہی نام تھا۔ وحی۔ اور وہ سلسلہ اب بند ہو چکا ہے۔

علاوہ بریں اشیائے کائنات کے اندر جو علم رکھ دیا گیا ہے اور جس کی رو سے وہ اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل اور اپنی اپنی جبلتی روش پر کامزن رہتی ہیں اسے بھی وحی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں وحی کا لفظ اپنے عام (لغوی) معانی میں بھی استعمال ہوا ہے اور خالص اصطلاحی معانی میں بھی۔ مثلاً حضرت زکریا علیہ السلام کے تذکرہ کے ضمن میں ہے کہ ان سے کہا گیا کہ وہ تین شب تک لوگوں سے ہم کلام نہ ہوں چنانچہ

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحَى إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۝ (۱۹/۱۱)

پھر وہ قربان گاہ سے نکلا اور اپنے لوگوں میں آیا (جو حسب معمول اس کا انتظار کر رہے تھے) اس نے (زبان نہ کھولی) اشارہ سے کہا ہمیشہ احکام خداوندی کی اتباع میں سرگوداں رہو۔

یہاں "وحی" کے معنی اشارہ کرنے کے ہیں۔ سورۃ العام میں ہے۔

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَاطِئِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا ۝ (۶/۱۱۳)

اور (اسے پیغمبر!) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے (جب اس کی دعوت کا ظہور ہوا تو) اپنوں اور بیگانوں میں سے بڑے بڑے لوگوں کو دشمن ٹھہرا دیا جو ایک دوسرے سے خوشنما باتوں کی سرگوشیاں کرتے تاکہ لوگوں کو فریب دیں۔

یہاں "وحی" کے معنی باہمی سرگوشیاں کرنا ہے۔ اس سے ذرا آگے ہے۔

وَإِنَّ الشَّيْطَانَ لِكُيُودُونَ إِلَىٰ أَهْلِ آلِهِمْ لِيُجَادِلُوهُمْ ۝ (۶/۱۲۲)

اور (دیکھو) شیاطین اپنے مددگاروں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے رہتے ہیں تاکہ تم سے کج بھنٹی کریں۔

یہاں وحی کے معنی وسوسہ اندازی کے ہیں۔ (یا حکم دینے کے)۔
یہ تو ہیں لفظ وحی کے لغوی معنی لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ ایک علم تو وہ ہے جسے انسان اپنی عقل و فکر سے حاصل کرتا ہے۔ اس علم کے دروازے ہر انسان کے لئے بقدر ظرف کھلے ہیں۔ لیکن دوسرا علم وہ ہے جسے عقل و فکر کی بنا پر خود حاصل نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ وحی سے (از خود) ملتا ہے جہاں سے اشیائے کائنات کو ان کی تخلیق ملتی ہے۔ یعنی اس کا سرچشمہ خدا کی مشیت ہے۔ یہ خدا کی طرف سے براہ راست ملتا ہے۔ کائنات کی ہر شے اسی علم کی بنا پر جو اس کے اندر داخل ہے اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل ہے۔ سورہ حشر میں ہے۔

فَقَضَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَادْخُلِي فِي كُلِّ
وحی کی قسمیں سَمَاءٍ أَمْرَهَا (۳۱/۱۲)

چنانچہ (تمہارے پروردگار نے) فضائی کڑوں کو متعدد بلندیوں (کی شکل) میں دو مقررہ دوروں میں منکمل کر دیا اور ہر کڑے کو اس کا علم دے دیا (وحی کر دیا) کہ اس کے ذمے کیا کام ہے۔
یہ وہ وحی ہے جس کی رو سے ان فضائی بلندیوں میں خدا کا امر تدبیری نافذ العمل ہے اور اس طرح ہر فضائی کڑہ اپنے فریضہ منقوضہ کی سرانجام دہی میں سرگرداں ہے۔ اسی طرح زمین کے متعلق ہے کہ وہ "قیامت" میں اپنے سرپرستہ رازوں کو اگل کر رکھ دے گی اور یہ بھی خدا کی وحی کے مطابق ہوگا۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۚ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحِي لَهَا (۸۹/۵)
(اور دیکھو) اس دن زمین تمام خبریں بیان کر دے گی۔ اس لئے کہ تیرے پروردگار نے اس کی وحی کی ہوگی۔

جنگ بدر کے سلسلہ میں ملائکہ کے متعلق فرمایا۔

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنْتِي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ
أَمْنُوا ط (۸/۱۲)

(اے پیغمبر!) یہ وہ وقت تھا کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں پر وحی کی تھی کہ میں تمہارے ساتھ

ہوں (یعنی میری مدد تمہارے ساتھ ہے) پس مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔
اسی طرح حیوانات اپنی جبلتی قوتوں سے جن امور کو سرانجام دیتے ہیں اس کے لئے بھی وحی کا لفظ استعمال
ہوا ہے۔ چنانچہ جہانِ فطرت کے بہترین ماہر فنِ تعمیر (ARCHITECT) یعنی شہد کی مکھی کے متعلق
ارشاد ہے۔

وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلٰی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوتًا
ذَاتِ مَفَازٍ ۚ فَتَجْعَلِیْنَ لِّہُمْ سُبُلًا یَّعْرِضُونَ ؕ (۱۶/۶۸)

اور دیکھو تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کر رکھی ہے کہ پہاڑوں میں
درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو اس غرض سے بلندی میں بنادی جاتی ہیں جھٹہ بنائے۔
اس وحی کو خدا کی طرف سے راہ نمائی (ہدایت) کہہ کر بھی پکارا گیا ہے۔ یعنی خدا نے ہر شے
کو اس کی تخلیق عطا کی اور پھر اس کے اندر یہ ملکہ بھی رکھ دیا کہ وہ کس رخ سے زندگی بسر
کرے۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ هَدٰیہٗ (۲/۵۰ نیز ۲۰/۵۰)
موسیٰ نے کہا: ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخش دی۔ پھر اس کی
(تکمیل تک پہنچنے کی) راہ نمائی کی۔

یہی وہ "راہ نمائی" ہے جس کی بنا پر آدم کی گھٹلی اپنی ارتقائی منازل طے کرتی کرتی خوش رنگ خوش ذائقہ
خوشبودار آدم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہی وہ "ہدایت" ہے جس سے بکری کا بچہ پیدا ہوتے ہی مل کے تھنوں
کی طرف پکتا ہے اور چڑیا کا بچہ دانے کے لئے منہ کھول دیتا ہے۔

انسانوں کی دنیا | یہاں تک تو کائنات کے ان گوشوں کا ذکر تھا جن میں انسان شامل نہیں ہے۔
یا اگر انسان شامل ہے تو صرف اس کے بچنے کی ابتدائی زندگی تک جس میں
وہ بھی دوسرے حیوانوں کی طرح فطری جبلت سے کام لیتا ہے۔ مثلاً پیدائش کے ساتھ ہی وہ بھی اپنی
خوراک کے لئے ماں کی چھاتیوں کی طرف ہمک کر جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد انسانی دنیا کا وہ گوشہ آتا ہے
جس میں یہ اپنی عقل و فرد سے کام لے کر چلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے اس گوشے میں اس کے اندر سے کوئی
راہ نمائی نہیں ملتی۔ یہاں وحی کا وہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے جو باقی حیوانات میں عمر بھر تک ان کے ساتھ رہتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کو اس امر میں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ محض اپنی عقل کی بنا پر جس طرح جی چاہے اپنے فیصلے آپ کر لیا کریں؟ ہم سابقہ اوراق میں دیکھ چکے ہیں کہ انسان کو اس طرح نہیں چھوڑا گیا بلکہ اُسے بھی خدا کی طرف سے راہ نمائی دی گئی ہے۔ لیکن اس راہ نمائی کا طریقہ بدل دیا گیا ہے۔ یہ فرزند آدم کے دل میں از خود نہیں ڈال دی گئی۔ اگر ایسا کر دیا جاتا تو انسان بھی حیوانات کی طرح مجبور ہوتا کہ وہ اپنی اس داخلی آواز پر آنکھیں بند کر کے چلتا رہتا۔ لیکن انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے اس لئے اس کی راہ نمائی کے لئے ایسا طریقہ اختیار کیا گیا جس سے اس کے اختیار و ارادے پر کوئی اثر نہ پڑے۔ یعنی اس کا جی چاہے تو یہ اس راہ نمائی کو اختیار کرے اور جی چاہے تو اس سے سرکشی برتے۔

اس راہ نمائی کے لئے طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ انسانوں میں سے بعض کو اس مقصدِ عظیم کے لئے چن لیا گیا اور انہیں وہ راہ نمائی دے دی گئی جس کے مطابق چلنے سے انسان اپنی زندگی کے منتہی تک پہنچ جائے۔ یہ راہ نمائی اس برگزیدہ انسان کو وحی کے ذریعے ملتی تھی اور اسے کہہ دیا جاتا تھا کہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچا دے۔ یعنی یہ وحی اسے بھی اسی طرح بلا کسب و ہنر ملتی تھی جس طرح کائنات کی دوسری چیزوں کو ملتی ہے۔ لیکن اس کے ذمے یہ فریضہ بھی عائد کر دیا جاتا تھا کہ وہ اس وحی پر خود بھی عمل کرے اور اسے دوسروں تک بھی پہنچائے جس شخص کو یہ وحی دی جاتی تھی اسے نبی یا رسول کہا جاتا ہے (ان الفاظ کا فرق ذرا آگے چل کر بتایا جائے گا)۔ اس میں کوئی غیر نبی شامل نہیں ہوتا۔ جو شخص کہتا ہے کہ مجھے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے سمجھ لیجئے کہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نبی اور رسول ہے۔

○
ہم کلامی کی صورتیں | اشرانِ کریم نے ان دونوں صورتوں کو ایک ہی جگہ بیان کیا ہے۔ جہاں فرمایا۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَآئِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ (۳۲/۵۱)

اور دیکھو! کسی انسان کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے ہم کلام ہو بجز ان صورتوں کے کہ (وہ رسولوں سے) وحی کے ذریعے بات کرے یا پردہ کے پیچھے سے (جیسے حضرت موسیٰ

کے ساتھ) اور (غیر انبیاء سے) اس طرح کہ ان تک اس کا رسول اس کے قانونِ مشیت کے مطابق وحی پہنچائے۔

پہلی قسم کی وحی کی شکل یہ ہے کہ ملائکہ کے ذریعے قلبِ نبوی پر خدا کے کلام کا الفت رہو۔
 قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلْجَبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ
 اللَّهِ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ۝
 (۲/۹۷ نیز ۱۹۲-۲۶/۱۹۲)

(اے پیغمبر! جبریل کا کون دشمن ہو سکتا ہے؟ یہ تو اللہ کا کلام ہے جو جبریل نے اللہ کے قانون کے مطابق تمہارے قلب میں اتارا ہے اور اس تعلیم کو سچ کر کے دکھانے کے لئے آیا ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے۔ اس میں انسان کے لئے ہدایت ہے اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں (فلاح و کامیابی کی) بشارت۔

دوسری قسم پر وہ کے پیچھے سے بذریعہ آواز کے جیسے حضرت موسیٰ کے ضمن میں فرمایا۔
 وَكَادَيْتُمُوهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبْتُمُوهُ نَجْحًا ۝ (۱۹/۵۲)
 ہم نے اسے کوہِ طور کی دہنی جانب سے پکارا اور (وحی کی) سرگوشیوں کے لئے اپنے سے قریب کیا۔

حضراتِ انبیاء کرام کو اس طرح خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی اور وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے تھے۔ اس کو رسالت کہتے ہیں۔

یہ ہے وہ وحی جس کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا
ہدایتِ آسمانی کا سلسلہ وحی
 جب انسان کو دنیا میں ہدایت کی ضرورت پیش آئی اور
 یہ سلسلہ منزل بہ منزل کارواں درکارواں آگے بڑھتا ہوا اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآنِ کریم میں محفوظ ہو گیا۔
 إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالتَّيِّمِينَ مِنْ بَعْدِهِ

لہٰذا چونکہ وحی رسالت ایک خالصۃً انفرادی تجربہ ہے جس سے نبی کے علاوہ اور کوئی لذت آشنا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم قطعاً نہیں جان سکتے کہ انکشافِ حقیقت کی ان مختلف صورتوں کی نوعیت و ماہیت کیا ہوتی ہے۔

وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اِبْرٰهِيْمَ..... وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيْمًا (۱۶۳-۱۶۵)

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوح پر اور ان نبیوں پر جو نوح کے بعد پیدا ہوئے بھیجی تھی۔ اور جس طرح ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اولاد یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر بھیجی اور داؤد کو زبور عطا فرمائی۔ نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم نے بیان کر دیا ہے، اور وہ جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا اور (اسی طرح) اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام کرنا ہوتا ہے۔ یہ تمام رسول (صحیح روش زندگی کے خوشگوار نتائج کی) خوشخبری دینے والے اور (انکارِ حق کے نتائج سے) آگاہ کرنے والے تھے (اور اس لئے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے اور نیک و بد بتلانے کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے سامنے پیش کر سکیں (یعنی یہ عذر کر سکیں کہ ہمیں راہِ حق کی طرف کسی نے دعوت نہیں دی تھی) اور خدا (اپنے کلاموں میں) سب پر غالب ہے اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

سورہ شوریٰ میں ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا اِلَيْكَ..... اَللّٰهُ يُجْتَنَّبُ اِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي اِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ ۝ (۲۲/۱۳) نیز (۲۲/۲)

اور (دیکھو) خدا نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی ہم نے تمہاری طرف وحی کی ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو (مع ان کے متبعین کے) حکم دیا تھا کہ دین کے نظام کو قائم رکھنا اور تفرقہ اندازی (کی لعنت سے) بچنا۔ (تاکہ) انبیاء کو یہی حکم دیا گیا تھا۔ کیونکہ اصول کے اعتبار سے مختلف انبیاء کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں۔ مگر مشرکین کو وہ بات جس کی طرف (اے پیغمبر اسلام!) تم نہیں بلا رہے ہو بڑی گراں گذر ہی ہے (شاید انہیں یہ ناگوار ہو رہا ہے کہ منصبِ نبوت سے ان میں سے کوئی سرفراز کیوں نہ کیا گیا) خدا اپنی طرف سے (منصبِ رسالت کے لئے) جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ اور پھر جو شخص انبیاء کی طرف آئی ہوئی ہدایت کے ذریعے خدا کی طرف رجوع کرتا ہے تو خدا اسے

زندگی کے منتہی تک لے جاتا ہے۔

حضرت نوحؑ کے متعلق فرمایا:-

فَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِ اَنْ اَصْنَعَ الْفُلَّكَ يَا عَيْنِنَا وَوَحَيْنَا..... (۲۳/۲۴)
پس ہم نے نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ”ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنا۔

سورۃ انبیاء میں حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ کے بعد فرمایا:-

وَوَهَبْنَا لَهُ اِسْحٰقَ ۚ وَ يَعْقُوبَ نَافِلَةً ۚ وَ كَلَّمَا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝
جَعَلْنٰهُمْ اٰيٰتٍ يَّتَذَكَّرْنَ ۚ بِاَمْرِنَا ۚ وَ اَوْحَيْنَا اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ
وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ ۚ وَ اٰتٰنَا الزَّكٰوةَ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ (۲۱/۴۳-۴۲)
اور پھر ہم نے اُسے (ایک فرزند) اسحاق عطا فرمایا اور مزید برآں (پوتا) یعقوب۔ ان سب کو
ہم نے صالح بنایا تھا۔ ہم نے انہیں (انسانوں کی) پیشوائی دی تھی۔ ہمارے حکم کے مطابق وہ
راہ دکھاتے تھے۔ ہم نے ان پر وحی بھیجی کہ ہر طرح کے بھلائی کے کام انجام دیں۔ نیز نظام
صلوٰۃ قائم کریں اور نوح انسانی کی نشوونما کا انتظام کریں۔ چنانچہ وہ سب ہمارے قوانین
کی اطاعت میں سرگرم عمل رہتے تھے۔

حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا کہ اپنے بھائی (حضرت ہارونؑ) کو ساتھ لے کر فرعون کے دربار میں جاؤ اور وہاں دعوت
کلمی کا اعلان کرو کہ

اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَا اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ كَذَّبَ وَ تَوَلٰی ۝ (۲۰/۲۸)

جو کوئی جھٹلائے اور سرتابی کرے تو ہم پر وحی اتر چکی ہے کہ اس کے لئے عذاب کا پیام ہے۔
کوئی رسول ایسا نہیں تھا جس پر وحی نہ آئی ہو کہ رسول (پیغامبر) کہتے ہی اسے میں جو پیغام لے کر آتے۔
وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا وُحِّیَ اِلَيْهِ اَنَّهُ لَا
اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (۲۱/۲۵) نیز ۱۶/۴۳ تا ۱۹/۶۵

اور (اسے پیغمبر) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس پر اس بات کی وحی ہم
نہ بھیجی ہو کہ کائنات میں کسی کا اقتدار و قانون نہیں بجز ہمارے۔ پس چاہیے کہ میری ہی مخلوق

اطاعت و فرماں پذیری اختیار کرو۔

نبی اکرمؐ پر قرآن کریم بطور وحی نازل کیا گیا۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ
أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ قَدْ رَأَيْتَ
كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ ۝ (۲-۳/۱۲ نیز ۴/۲۲)

ہم نے اسے اس شکل میں امارا کہ یہ واضح اور مفصل زبان کی کتاب ہے تاکہ تم سمجھو بوجھو
(اے پیغمبر!) اس قرآن کی وحی کر کے ہم تجھے بہتر سے بہتر طریقہ پر (پچھلی سرگزشتیں سناتے ہیں)
اور یقیناً قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تو انہی لوگوں میں سے تھا جو (ان سرگزشتوں سے)
بے خبر تھے۔

دوسرے مقام پر اسی کو کتاب کہا گیا ہے:

وَأَنْزَلْنَاهُ مَاءً أَوْحَىٰ إِلَيْكَ ۖ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۖ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ تَنْفِ
وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ۝ (۱۸/۲۹ و ۱۴/۲۵ و ۲۹/۳۱ و ۳۵/۳۱)
اور (اے پیغمبر!) تیرے پروردگار کی کتاب جو تجھ پر وحی کی گئی ہے اس کا اتباع کرتا رہ اشد کا
قانون کوئی بدل نہیں سکتا۔ اور تجھے اس کے سوا کوئی پناہ کا بہارا ملنے والا نہیں!

انبیاء سابقہ کی وحی کا اولین اور بنیادی اعلان بھی خدا کی توحید تھا۔

قُلْ إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِإِلَهِ أَحَدٌ ۖ فَهَلْ أَنْتُمْ
مُسْلِمُونَ ۝ (۲۱/۱۰۸)

تو کہہ دو "مجھ پر جو کچھ وحی کیا گیا ہے" وہ تو صرف یہ ہے کہ تمہارے لئے اقتدار و اختیار
صرف خدا کا ہے (اس کے سوا کسی کا نہیں) پس بتلاؤ تم اس کے آگے سر جھکاتے ہو
یا نہیں؟

یہ کتاب اور حکمت کسے کہتے ہیں؟ اس کی تشریح اپنے مقام میں آئے گی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یہ دونوں
قرآن کریم ہی کے اندر ہیں اس سے باہر نہیں۔

حضور اسی وحی سے انسانوں کے وضع کردہ قوانین زندگی کے انجام و عواقب سے آگاہ فرماتے تھے۔

قُلْ إِنَّمَا أُنذِرُكُمْ بِأَنُوحِي هَلْ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَاءَ
إِذَا مَا يُنَادُونَ ۝ (۲۱/۴۵ نیز ۳۸/۴۰)

اے پیغمبر! تو کہہ دے میری پکار اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی وحی سے علم پا کر تمہیں مننبہ کر رہا ہوں اور (یاد رکھ) جو اپنے کانوں سے کام نہیں لیتے ہیں، انہیں کتنا ہی خبردار کیا جائے کبھی سننے والا نہیں!

اسی وحی سے ملت ابراہیمی کے اتباع کا حکم دیا گیا۔

ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنْ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (۱۹/۱۲۳)

اور پھر (اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ (اسی) ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو۔ ہر طرف سے ہٹا ہوا (صرف دین حق ہی پر کاربند رہنے والا) اور جو مشرکین میں سے نہ تھا۔ (اس کی تفصیل اپنے مقام پر ملے گی)۔ یہ وحی خدائے علیم و حکیم کی طرف سے آتی تھی۔

وَإِلَّا لَك لَمُتَ لَقِيَ الْقُرْآنَ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ ۝ (۲۷/۶)

اور بلاشبہ (اے پیغمبر!) تم پر یہ قرآن خدائے حکیم و علیم کی جانب سے القا کیا جاتا ہے۔

اس قرآن کا رسول اللہ کو پڑھا دینا اور پھر اس کا جمع کر دینا بھی خدا کے ذمہ تھا۔
إِنَّا عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَ قُرْآنَهُ ۖ فَإِذَا قُرْآنُهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۚ
(۴۵/۱۸-۱۷)

قرآن کو جمع کرنا اور اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔ پھر جب ہم اسے پڑھ چکیں (ہمارا فرشتہ پیغام کو پہنچا چکے) تو پھر اس کی قرأت کی پیروی کرو (اسے اسی طرح دہراؤ اور اسی طرح جم کر اس پر عمل کرو)۔

وحی صرف خیالات کا القاء نہیں | اس آیہ جلیلہ کو ذرا غور سے دیکھئے (فَإِذَا قُرْآنُهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ) ”جب ہم پڑھیں تو اس کے

پیچھے پڑھا کرو۔“ یہ ہے وحی کی حقیقت۔ محض خیالات کا دل میں ڈال دینا نہیں۔ بلکہ اس طرح سے الفاظ کو پڑھنا جیسے معلم، متعلم کو پڑھاتا ہے۔ (یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ قرآن کریم کے محض مطالب

ہی وحی نہیں بلکہ اس کے الفاظ بھی وحی ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی عنوان ”قرآن“ میں ملے گی۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہو گا کہ کوئی خیال الفاظ کے بغیر ممکن نہیں۔ ”خیال اور الفاظ“ احساس کے سرچشمہ سے بیک وقت باہر آتے ہیں“ (خطبات ص ۱۲) اس کے ساتھ ہی اللہ نے اس کی بھی وضاحت کر دی کہ وحی کا سرچشمہ یکسر خارجی (OBJECTIVE) ہوتا ہے۔ صاحبِ وحی کے اپنے خیالات و جذبات و رجحانات و میلانات کا اس میں قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یعنی وحی کا علم واطلی (SUBJECTIVE) نہیں ہوتا۔ چنانچہ سورۃ النجم میں ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ (۵۲/۳)

اور (دیکھو ہمارا پیغمبر) اپنے جذبات کے تابع کچھ نہیں کہتا۔

پھر جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ وحی رسالت سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ نوعِ انسانی کے لئے ضابطہ حیات ہے۔ اس لئے حضور کو حکم دیا گیا تھا وہ اس وحی کو دوسروں تک بھی پہنچائیں۔

تَبْلِغِ رِسَالَتٍ ۖ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۗ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝ (۵/۶۷)

لے پیغمبر! تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہوا ہے اسے (خدا کے بندوں تک)

لے سورۃ ابراہیم میں ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا وَبِلِسَانٍ قَوْمِهِ رَلِّبَيْنَ لَهُمْ ۖ (۱۴/۴)

اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں تاکہ وہ انہیں کھول کر بتائے۔

یہاں سے ظاہر ہے کہ رسول کا پیغام اس کی قوم کی زبان میں ہوتا ہے۔ چونکہ رسول اللہ کے اولیں مخاطب عرب تھے اس لئے قرآن عربی زبان میں نازل ہوا۔ لیکن قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ تک کے لئے ضابطہ حیات ہے اس لئے اس کے عربی زبان میں ہونے سے یہ مراد نہیں کہ وہ صرف عربوں کے لئے ہے۔

پہنچا دو اور دشمنوں کی مخالفت کی کچھ پروا نہ کروا کر تم نے ایسا نہ کیا، تو پھر خدا کا پیغام نہیں پہنچایا (یعنی ادائے فرض رسالت میں کوتاہی کی) اور اللہ تمہیں انسانوں (کے شر) سے بچانگا وہ اس گروہ پر (کامیابی) کی راہ نہیں کھولتا جس نے کفر کی راہ اختیار کی ہے!

اِتَّبَاعِ دَجِي | صرف پہنچانا ہی نہیں بلکہ خود دجی کا اتباع بھی کرنا۔
 وَ اَتَّبِعْ مَا يُوحِي اِلَيْكَ وَ اصْبِرْ حَتَّى يَخُفُّكَ اللّٰهُ ۚ
 وَ هُوَ خَيْرُ الْمُخْرِجِيْنَ ؕ (۱۰۹/۱۰/۳۵ نیز ۱۵/۳۲)

اے پیغمبر! جو کچھ تم پر دجی کی جاتی ہے اس پر چلتے رہو اور اپنی راہ میں جیسے رہو یہاں تک کہ اللہ (تمہاری جماعت اور فریق مخالف کی کشمکش میں) فیصلہ کر دے۔ اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!

اسی سے تم تک کا حکم ہے۔

فَاَسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؕ (۴۳/۴۲)
 اور (اے پیغمبر اسلام!) اپنی ہدایات کے ساتھ تم تک کرو جن کی تمہاری طرف دجی کی گئی ہے۔
 بلاشبہ تم سیدھے راستے پر ہو۔ [اسی پر گامزن رہو]۔

یہ کوئی نئی بات نہ تھی | یعنی رسول کو حکم دیا جاتا تھا کہ وہ اس دجی کو دوسروں تک پہنچائے اور پھر اس کے مطابق ایک معاشرہ قائم کرے جس میں تمام افراد معاشرہ دجی کا اتباع کریں۔ اور یہ کوئی نئی چیز نہ تھی۔ سلسلہ دجی و رسالت اور اس کا اتباع کا مسلک شروع سے چلا آ رہا تھا۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدَعَا مِنَ الرُّسُلِ وَمَا اَدْرِى مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ؕ
 اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ وَمَا اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ؕ (۹/۴۶)

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو کہ میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں، (بلکہ جماعت انبیاء کا ایک فرد ہوں۔ مجھ میں کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہے جو اور رسولوں میں نہ ہو) مجھے قطعاً معلوم نہیں کہ (کل) میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا؛ میں تو صرف ان ہدایات خداوندی کا اتباع کرتا ہوں جن کی میری طرف دجی کی گئی ہے۔ میں تو صرف (نوع انسانی کو اس کے بر

اعمال کے نتائج سے) کھلے طور پر (واضح طریقہ سے) آگاہ کرنے والا ہوں (اور بس!)
اتباعِ وحی سے انسان ہمیشہ راہِ راست پر رہتا ہے۔ اور اس کے سوا، راہنمائی کی کوئی دوسری شکل ہے
ہی نہیں۔ (خواہ کسے باشد)۔

قُلْ إِنْ ضَلَلْتُ فَإِنَّمَا أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِي ۖ وَإِنِ اهْتَدَيْتُمْ فِيمَا
يُؤْتِي إِلَيَّ رَبِّي ۖ إِنَّهُ مَعِي قَرِيبٌ ۝ (۳۴/۵۰)

اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ اگر میں معاشرہ کے تدبیرِ امور میں کہیں کوئی غلطی کرتا ہوں تو وہ غلطی
میرے اپنے اجتہاد کی غلطی ہوتی ہے اور جہاں بالکل سیدھی راہ پر چلتا ہوں تو وہ اس وحی
کی رُو سے ہوتی ہے جو میرا پروردگار میری طرف نازل کرتا ہے۔ وہ بیشک ہر ایک بات سننے
والا اور ہر ایک کے قریب ہے۔

یقینی علم | اس لئے کہ حتمی اور یقینی علم صرف وحی ہے جس میں ظن و تخمین کا کوئی شائبہ نہیں، حصوً^۱
سے ارشاد ہے:-

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۖ
قُلْ إِنْ هَدَىٰ اللَّهُ هُوَ الْهُدَىٰ ۖ وَلَئِنَّ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ
بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۖ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ ذَلِيلٍ ۖ
لَا نُصِيبُكَ ۝ (۲/۱۲۰)

اور (حقیقت یہ ہے کہ تم اپنی سچائی کی کتنی ہی نشانیاں پیش کرو، لیکن) یہود اور نصاریٰ تم سے
خوش ہونے والے نہیں۔ وہ تو صرف اسی حالت میں خوش ہو سکتے ہیں کہ تم اُن کی (بنائی ہوئی)
ملتوں کے پیرو ہو جاؤ۔ (کیونکہ جس بات کو انہوں نے دین سمجھ رکھا ہے وہ گروہ پرستی کے
تعصب کے سوا کچھ نہیں ہے) پس تم اُن سے (صاف صاف) کہہ دو کہ خدا کی ہدایت کی راہ تو
وہی ہے جو ہدایت کی حقیقی راہ ہے (نہ کہ تمہاری خود ساختہ ملتیں اور گروہ بندیاں) اور میری راہ
وحی ہے (اور یاد رکھو! اگر تم نے ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کی، باوجودیکہ تمہارے پاس علم
یقین کی روشنی آچکی ہے، تو (یہ ہدایتِ الہی سے صریح انحراف ہو گا) اور پھر اللہ کی دوستی اور
مددگاری سے تم یکسر محروم ہو جاؤ گے۔

کیونکہ وحی کو خدا اپنے علم سے نازل کرتا ہے۔

لَٰكِنَ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَاۤ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَشْذَلَهُ

بِعِلْمِهِ ۝ (۱۶۶/۳)

اے پیغمبر! اگر یہ لوگ تمہاری سچائی سے انکار کرتے ہیں، تو انکار کریں، لیکن اللہ نے جو کچھ تم پر نازل کیا ہے وہ اسے نازل کر کے (تمہاری سچائی کی) گواہی دیتا ہے اور اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے۔

اور باطل اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۚ تَنْزِيلٌ

مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۝ (۲۲/۴۱)

(اور دیکھو) باطل نہ تو اس کے آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ (قرآن) خدا کے حکیم و حمید کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے۔

غیب کی وحی | چونکہ وحی علم خداوندی پر مشتمل ہوتی ہے، اس لئے اس میں وہ امور غیب منکشف کئے جاتے ہیں جو حیطہ علم انسانی میں نہیں آسکتے۔ قصہ حضرت مریمؑ کے ضمن

میں فرمایا۔

ذَٰلِكَ مِنْۢ بَيْنِ مَاۤ اُنۢبِئُكَ ۚ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ

اِذْ يُلْقُونَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۚ مَا كُنْتَ

لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُونَ ۝ (۲۲/۳)

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی ہم تم پر وحی کر رہے ہیں۔ ورنہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ تم اس وقت ان لوگوں کے پاس موجود نہ تھے جب میکائیل کے مجاور اپنے اپنے تیر پہنک رہے تھے کہ (قرعہ ڈال کر فیصلہ کر لیں) کون مریم کا کفیل ہو۔ اور (یقیناً) تم اس وقت بھی موجود نہ تھے جب وہ (مریم کی کفالت کے لئے) آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

حضرت نوحؑ کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔

تِلْكَ مِنْۢ بَيْنِ مَاۤ اُنۢبِئُكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا اَنْتَ

وَلَا قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا ۝ (۱۱/۴۹)

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جسے وحی کے ذریعے ہم تجھے بتلا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تو جانتا تھا، نہ تیری قوم۔

قصہ حضرت یوسفؑ کے سلسلہ میں فرمایا۔

ذَلِكَ مِنَ الْأَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَنْكُرُونَ ۝ (۱۲/۱۰۲)

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی ہم تجھ پر وحی کر رہے ہیں۔ درنہ (ظاہر ہے کہ) جس وقت یوسف کے بھائی سازش میں مصمم ہو گئے تھے اور پوشیدہ تدبیریں کر رہے تھے، تو تم اُس وقت کچھ اُن کے پاس کھڑے نہ تھے (کہ سب کچھ دیکھ سُن لیا ہو)۔

قصہ حضرت موسیٰؑ اور اہل مدین کے متعلق حضورؐ سے ارشاد ہوا۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا إِلَىٰ مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ ۝ (۲۸/۴۴)

اور (اے پیغمبر اسلام!) تم (کوہ طور کی) مغربی جانب میں موجود نہیں تھے جب ہم نے موسیٰ کو امر (رسالت) احوالہ کیا اور نہ ہی تم وہاں حاضر تھے۔

یعنی یہ تمام امور غیب حضورؐ پر توسطِ وحی منکشف ہوئے تھے۔ وحی کے بغیر حضورؐ ان سے واقف نہ تھے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَذَا الْقُرْآنَ ۚ وَإِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ ۝ (۱۲/۲)

(اے پیغمبر!) اس قرآن کی وحی کر کے ہم تجھے بہتر سے بہتر طریقہ پر (پچھلی) سرگزشتیں سناتے ہیں، اور یقیناً قرآن کے نازل ہونے سے پہلے تو انہی لوگوں میں سے تھا جو (ان سرگزشتوں سے) بے خبر تھے۔

نہ صرف امور غیب، بلکہ تمام علوم جن سے صاحبِ وحی بذاتِ خویش نا آشنا ہوتا ہے (۱۳/۱۱۳)۔

علمِ خصوصی | یہی وجہ ہے کہ رسولؐ اپنے ماحول کی پیداوار نہیں ہوتا۔ ورنہ اس کا علم اپنے گرد و پیش سے آگے نہ بڑھ سکتا۔ یہ وحی ہے جس کی بنا پر وہ اپنے ہم عصروں سے ایک

جداگانہ علم رکھتا ہے۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا۔
 اُبَلِّغْكُمْ رِسَالَتِ رَبِّي وَ اَنْصَحْ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا
 تَعْلَمُونَ ۝ (۷۲/۷۳)

میں اپنے پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچاتا ہوں اور پسند و نصیحت کرتا ہوں اور اللہ کی طرف
 سے اس بات کا علم رکھتا ہوں جو تمہیں معلوم نہیں۔
 عام ماحول تو ایک طرف، صاحبِ وحی کا علم (جو بذریعہ وحی ملتا ہے) اس کے اپنے افرادِ خاندان، حشی کہ
 اب وجد سے بھی جداگانہ ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے فرمایا۔
 يَا بَتِّ اِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاصْبِرْ
 اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ (۱۹/۲۳)
 اے میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں، علم کی ایک روشنی مجھے مل گئی ہے جو تجھے نہیں ملی۔
 پس میرے پیچھے چل، میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا۔



رسول اللہ کو خدا کی طرف سے جو وحی ملی تھی وہ قرآن کے اندر محفوظ ہو گئی۔ قرآن سے باہر اور کہیں
 وحی کی قسمیں | بھی وحی نہیں۔ ہمارے ہاں جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں
 ایک وحی متلو (یعنی جس وحی کی تلاوت کی جاتی ہے) اور دوسری وحی غیر متلو
 (یعنی جس وحی کی تلاوت نہیں کی جاتی)۔ تو قرآن سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ قرآن سے صرف
 ایک ہی قسم کی وحی کی سند ملتی ہے اور وہ وحی قرآن کے اندر ہے۔ وَ اَوْحِيَ اِلَيْنَا هٰذَا الْقُرْآنُ
 لِاُنْذِرَكُمْ بِهِ وَ مَنْ بَلَغَ (۱۹/۹) ”ان سے کہہ دے کہ میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں
 اس کے ذریعے تمہیں غلط روش زندگی کے نتائج سے آگاہ کر دوں۔ اور انہیں بھی جن تک یہ قرآن پہنچے۔“
 غیر نبی اور وحی | جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، وحی صرف انبیاء کے لئے مخصوص ہوتی ہے اور
 غیر از نبی کو نہیں ملتی۔ قرآن کریم میں دو تین مقامات پر وحی کا لفظ غیر از نبی

کے لئے بھی آیا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ کی والدہ کے متعلق ہے۔ وَ اَوْحَيْنَا اِلٰی اُمِّ مُوسٰی (۲۸/۷) اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی (کہ بچے کو دریا میں بہا دے) یا حضرت عیسیٰ کے حواریوں کے متعلق ہے کہ ”میں نے حواریوں پر وحی کی کہ وہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لائیں“ (۱۱/۵)۔ ظاہر ہے کہ ان مقامات میں وحی کا لفظ ”حکم دینے“ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے خواہ اس کا ذریعہ کچھ ہی ہو۔ حضرت موسیٰ کی والدہ کی طرف یہ حکم کسی نبی کی وساطت سے پہنچایا گیا ہو گا۔ اور حضرت عیسیٰ کے حواریوں تک خود حضرت عیسیٰ کی وساطت سے۔ ان آیات میں اُوْحٰی کے معنی اس قسم کی وحی کرنا نہیں جس قسم کی وحی حضرات انبیاء کرام کی طرف کی جاتی تھی، وہ وحی غیر از نبی کی طرف کی ہی نہیں جاتی تھی۔ (نہ اب کسی کی طرف کی جاسکتی ہے) باقی رہا ”کشف والہام“: سوان کا ذکر کس آں میں نہیں۔ مسلمانوں نے اسے دوسروں سے مستعار لیا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ”تصوف“ اسلام کی مرز میں میں اجنبی پودا ہے۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ نزول قرآن کے بعد اللہ تعالیٰ بعض برگزیدہ بندوں کو بذریعہ الہام کچھ بتا دیا کرے گا۔ اس نے قرآن نازل کر دیا۔ اسے مکمل کر دیا۔ اسے غیر متبدل بنا دیا (۶/۱۱۶)۔ اس کی حفاظت کا خود ذمہ لیا (۱۵/۹)۔ اور اس طرح باب نبوت کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ اب علم کے دو ہی ذرائع ہیں۔ خدا کی یہ کتاب اور اس پر غور و فکر کرنے کے لئے عقل و فکر انسانی وَ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیْمُ اس لئے ہمارے لئے دین کی سند قرآن ہے اور علم و بصیرت اس کے سمجھنے کا ذریعہ۔ کشف والہام کا دین سے کوئی تعلق نہیں (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) یہ ایک اکتسابی فن ہے اور ہر شخص کسب و ہنر سے اسے حاصل کر سکتا ہے۔



خلاصہ بحث | حیات جاوداں کی خواہش انسان کی دلی آرزو ہے۔ یہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ انسانی باحریات کے مثیلی بیان، یعنی قصہ آدم میں دیکھئے۔ ابلیس نے انسان کے اسی کمزور پہلو سے فائدہ اٹھایا اور اسے یہ کہہ کر ورغلا یا کہ آؤ! تمہیں حیات جاوید کا راز بتاؤں۔ اس نے کہا کہ بقاءے ذات کا ذریعہ افزائش نسل ہے اور نسل و خاندان کا تحفظ عقلی اسباب و ذرائع سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یعنی اس نے بالفاظ دیگر یہ کہا کہ انسان عمل ارتقاء کی ایک میکانیکی تخلیق ہے اور اس کے سامنے مسئلہ صرف طبیعی حوائج و ضروریات کے حل کا ہے۔

اور یہ حل علم محسوسات، یعنی عقل کے ذریعہ تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابلیس کے پیش کردہ نظریہ کی رُو سے مادی زندگی کے علاوہ انسان کی کوئی زندگی نہیں اور اسی مادی پیکر کی بقتار حیات جاوید ہے۔ اس کے برعکس خالق فطرت نے کہا کہ یہ غلط ہے کہ انسان محض حیوانات ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اور اس کے سامنے مسئلہ صرف اس کی طبیعی ضروریات کا ہے جو علم محسوسات کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہیں۔ نفس انسانی مادہ سے ماوراء ہے اور بقا کا راز نفس کے استحکام میں پوشیدہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کے مادی پیکر کا تحفظ و استحکام بھی ضروری ہے (کہ یہی وہ قلعہ ہے جس کے اندر اس کی خودی کی فوج متمکن ہے) لیکن متنبہانے نگاہ فقط مادی پیکر کا تحفظ ہی نہیں بلکہ نفس انسانی کا تحفظ و استحکام ہے اور یہ تحفظ علم محسوسات (عقل یا علم استدلالی) سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ علم محسوسات عالم طبیعیات سے متعلق ہے اور نفس انسانی دنیائے طبیعیات سے ماوراء ہے اس کے لئے ایسی راہ نمائی کی ضرورت ہے جس کا سرچشمہ مادی کائنات سے ماوراء ہو۔ اس کا نام دجی ہے۔

پہلے دن سے آج تک، یہی ایک سوال ہے جو نوع انسانی کے لئے کشمکشِ پیہم کا موجب بن رہا ہے۔ اسی کا نام ابلیس و آدم کی آویزش ہے۔ یعنی ایک گروہ اس کا مدعی ہے کہ انسانی زندگی بس اسی مادی پیکر کی زندگی ہے۔ اس لئے انسانی مسائل کا حل علم محسوسات (عقل) کے ذریعے مل سکتا ہے اور رائے عقل کچھ نہیں ہے۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ انسانی زندگی اسی مجلسِ آب و گل کی زندگی نہیں بلکہ یہ پیکر نفس انسانی کا قالب ہے۔ اصل زندگی نفس انسانی کی زندگی ہے اور اسی کی بقتار حقیقت ہے۔ چونکہ نفس انسانی محسوسات کی دنیا سے ماوراء ہے اس لئے اس کے حفظ و بقتار سے متعلق مسائل کا حل محسوسات کی دنیا میں نہیں مل سکتا۔ بلکہ اس کی راہ نمائی کے لئے ایسی روشنی کی ضرورت ہے جو اس دنیا سے آرہی ہو جس سے نفس انسانی متعلق ہے۔ اس روشنی (دجی) کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ عقل (علم استدلال) اس کے اندر آجاتی ہے۔ لیکن یہ عقل کے محدود و متناہی دائرہ کے اندر نہیں آسکتا۔ یہ دونوں نظریات زندگی دو الگ الگ بنیادیں ہیں جن پر دو مختلف تہاویب کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

یہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ انسان کے اندر کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جو فی الواقعہ استدلالی علم کے دائرہ سے باہر ہیں۔ جبلی عادات، ضمیر کی آواز، ذوق جمالیات، اختیار و ارادہ۔ ان کا تعلق انسان کے مادی جسم سے نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یورپ کے ان علمائے طبیعیات نے (جن کے نزدیک مادہ سے ماوراء اور کوئی دنیا نہیں) بہت کوشش کی ہے کہ ان چیزوں کی بھی مادی توجیہات پیش کی جائیں۔ لیکن رفتہ رفتہ خود وہیں کے حکماء اور محققین نے ان کا رد کر دیا اور اب تحقیقات جدیدہ کا رخ اسی طرف ہے کہ یہ تمام معاملات نفس انسانی سے متعلق ہیں جو اس مادی پیکر کی تخلیق نہیں۔ انہوں نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ نفس کی کئی حقیقت سے متعلق بھی تحقیقات کی جائیں۔ لیکن چونکہ نفس، محسوسات کی دنیا کی چیز نہیں اور ان کے ذرائع تحقیق محسوسات و استدلال کی دنیا سے متعلق ہیں۔ اس لئے ان ذرائع سے نفس کی حقیقت کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ نفس کے لزوم و مابجریات یا اس کے دائرہ اثر و نفوذ سے بحث کر سکتے ہیں۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ (ان اشارات کی تفصیل، سلسلہ معارف القرآن کی ایک آئندہ کڑی میں جا کر ملے گی جس کا نام ہے ”انسان نے کیا سوچا؟“)



ہماری کائنات محسوسات کی دنیا ہے جس میں ہر آن تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کائنات کے پیچھے ایک حقیقت (REALITY) ہے جو تغیرات سے ماوراء ہے۔ رازِ کائنات معلوم نہیں کیا جاسکتا جب تک ادراکِ حقیقت نہ ہو۔ جب حیات، شعور سے متمسک ہوتی ہے تو نفس متشخص ہو جاتا ہے۔ لہذا نفس کی کئی حقیقت سے آگہی کے لئے رازِ حیات یا ادراکِ حقیقت ضروری ہے۔ واضح رہے کہ نفس (انسانی ذات) یا (PERSONALITY) حیات یا شعور کا پیدا کردہ نہیں۔ قرآن لے ”روح خداوندی“ کہہ کر بکارتا ہے۔ یہ ہر انسان کو پیدائش کے ساتھ ہی خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ البتہ اس کے تشخص سے آگہی اس منزل میں جا کر ہوتی ہے جب حیات، شعور کے ساتھ متمسک ہوتی ہے، بلکہ یوں کہیے کہ انسان کا شعور خویش، نفس کی بنیادی خصوصیت ہے۔ علم محسوسات (سائنس یا طبیعیات) کے ذریعے حقیقت کے صرف ان پہلوؤں کی جھلک ہی سامنے آ سکتی ہے جن میں محسوس طور پر وہ اپنا نمود کرتی ہے۔ لیکن یہ حقیقتِ مطلق کا

ادراک نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ان مختلف پہلوؤں کو یک جا جمع کر لیا جائے تو ان کی حاصل جمع حقیقت کلی ہو جائے اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ سائنس، حقیقت کو جزاً جزاً دیکھ سکتی ہے مگر تمام نہیں۔ اور جب تک حقیقت تمام سامنے نہ آجائے اس کے مختلف گوشوں کا باہمی ربط و ضبط سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ لہذا تنہا عقل کی رُو سے انسانی ہیئت اجتماعیہ کے لئے جو نظام بھی متعین کیا جائے گا وہ انسانی زندگی کے کسی ایک گوشے کے لئے مفید نتائج کا کفیل ہو تو ہو، کلی ارتقائے انسانیت کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے وہی نظام مفید ہو سکے گا جو انسان کو تمام و کمالاً سامنے رکھ کر متعین کیا گیا ہو (اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں حُشْن ہے) اور جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ عقل کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے مادرائے عقل کسی سرچشمہ کی ضرورت ہے۔ مادرائے عقل وجدانیات کی دنیا ہے۔ لہذا اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیائے وجدانیات میں حقیقت کا ادراک کُلّی ممکن ہے؟ اور اگر ہے تو کس مقام پر؟

علم غیر استدلالی میں سب سے پہلے ہمارے سامنے جبلت یا ضمیر کا میدان آتا ہے۔ حقیقت ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ اس لئے ادراک حقیقت کا نتیجہ ہمیشہ اور ہر جگہ ایک ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن جبلت کا اختلاف اور ضمیر کی آواز کی بوقلمونی ایک بدیہی چیز ہے۔ یہی صورت وجدان (شدت ذوق) میں ہے۔ لہذا جبلت اور وجدان (یا حدس) حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس سے آگے باطنیت (یا تصوف) کی دنیا آتی ہے۔ لیکن بغور دیکھا جائے تو اسے محض اس اعتبار سے دنیائے وجدان میں شامل کیا جا سکتا ہے کہ قوت نفس (قوت ارادی یا قوت خیال) کے نتائج، دلائل عقلی کی رُو سے سمجھے یا سمجھائے نہیں جا سکتے۔ اس لئے یہ علم استدلالی کی حدود سے خارج ہے لیکن اس اعتبار سے کہ یہ فن یکسر اکتسابی ہے اور مشق و ریاضت سے اس میں اضافہ ہو سکتا ہے اسے سرچشمہ علم قرار ہی نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ایک فن ہے۔

پھر جبلت اور وجدان کی طرح، باطنیت (تصوف) کے نتائج بھی باہم دیگر مختلف ہوتے ہیں اور یہ اختلاف فرعی یا جزئی نہیں۔ بلکہ اصولی اور اساسی ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ یہ تجربہ بالکل انفرادی ہوتا ہے اور نوع انسانی کی ہیئت اجتماعیہ کے لئے کوئی پیغام اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اس کے طریق فکر کی طرف آئے تو یہ خارجی دنیا سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ داخلی اور خارجی دنیا

دو الگ شعبے ہیں جو نہ صرف ایک دوسرے سے غیر متعلق ہیں بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں حالانکہ ایک حقیقت کے دو گوشے کبھی باہم مدگر متضاد نہیں ہو سکتے۔ لہذا باطنیت (تصوف) کی دنیا بھی حقیقت کا ادراک کالی نہیں کر سکتی۔

اس کے بعد ہمارے سامنے علم غیر استدلالی کا آخری مقام آتا ہے جسے مقام نبوت کہا جاتا ہے یہ وہ علم حقیقی ہے جس میں کسب و ہنر کو کوئی دخل نہیں۔ اس لئے یہ یکسر وہی ہے۔ اسی علم کو وحی کہا جاتا ہے۔ وحی کی رو سے حاصل شدہ تعلیم میں کبھی کہیں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ وحی انسان کی تمام ترجمان ہوتی ہے اس لئے اس کی رو سے متعین کردہ نظام انسان کی جملہ مضمحلہ جہتوں کی نشوونما اور تکمیل کا ضامن ہوتا ہے۔ قرآن نے یہی نظام نبی اکرمؐ کی وساطت سے عملی طور پر مشکل کیا تھا۔



وحی منزل من اللہ ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ صاحبِ وحی کسب و ہنر سے اس ملکہ کو اپنے اندر سے پیدا نہیں کرتا۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ حقیقت کا انکشاف نہیں کیا جاسکتا بلکہ حقیقت خود اپنے آپ کو منکشف کرتی ہے۔ لیکن یہ انکشاف یونہی نہیں کر دیا جاتا بلکہ جس قلبِ مطہر کو کائنات کے اس عظیم الشان راز کا امین بنانا مقصود ہوتا ہے وہ شرفِ انسانیت کے معراجِ کبریٰ پر فائز ہوتا ہے۔ اسی لئے صاحبِ وحی، وراثت اور ماحول کے اثرات سے منزہ اور دنیا کی ہر غلط روش کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت لئے ہوتا ہے۔ وہ حقیقت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اس لئے اس کی آنکھ کہیں دھوکا نہیں کھاتی نہ اس کا دل کسی فریب میں آتا ہے۔



قرآن کریم میں وحی کا لفظ 'غیر استدلالی دنیا کے مختلف گوشوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ ان میں نبوت، وحی کی ایک منفرد اور خصوصی شکل ہے جس میں کوئی اور شامل نہیں ہو سکتا۔ یہ ادراکِ حقیقت کا مکمل اور واحد ذریعہ ہے اور نوعِ انسانی کے لئے ایک انقلابِ درآغوشِ پیغام جو لوگ اپنے خوابوں کے اوہام اور ذہنی وساوس کے ڈانڈے اس وحی سے جا ملاتے ہیں وہ وحی کی حقیقت سے باخبر نہیں ہوتے۔ حقیقت کا مکمل انکشاف صاحبِ قرآن کے قلبِ منور پر ہو چکا۔ اب شرفِ انسانیت کا راز

اس تعلیم کے اتباع میں ہے۔ اور اس اتباع کی صحیح صورت یہ ہے کہ انسانی ہیئت اجتماعیہ کو وحی کی تعلیم کے خط و خال پر متشکل کیا جائے۔ نبوت ختم ہو گئی اس لئے خدا سے براہ راست علم ملنے کا دروازہ بند ہو گیا۔ اب انسان کے لئے علم کے ذرائع دو ہی ہیں۔ قرآن کریم اور عقل انسانی۔



اس کتاب کے اخیر پر ”نگہ باز گشت“ کے عنوان کے تحت، وحی کے متعلق انہی حقائق و تفصیل کو ایک دوسرے انداز میں سمٹا کر لکھ دیا گیا ہے۔ بہتر ہو کہ ساتھ ساتھ ایک نگاہ اس پر بھی ڈال لی جائے تاکہ اس کے تمام گوشے مختلف زاویوں سے سامنے آجائیں۔



الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَ

رِسَالَتِهِ

فلک کی بات بتادی زمین کے محرم کو



سفالِ رائے اوجِ امِ جم کرد درونِ قطره ام پوشیدہ ہم کرد
خرد اندر سرم بت خانہ ریخت خلیلِ عشق دیرم را حرم کرد



رسالت

ہبوطِ آدم کے وقت نوعِ انسانی سے کہا گیا تھا کہ
 قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَاِمَّا يَأتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن
 تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۲/۳۸)
 ہمارا حکم ہوا اب تم سب یہاں سے نکل چلو (اور جس نئی زندگی کا دروازہ تم پر کھولا جا رہا
 ہے اسے اختیار کرو) لیکن (یاد رکھو) جب کبھی ایسا ہو کہ ہماری جانب سے ہمیں ہدایت
 ملے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا اس کے لئے نہ کسی طرح کا کھٹکا ہوگا نہ
 کسی طرح کی غم گینی۔

دوسری جگہ اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔
 يٰۤاٰدَمُ اِمَّا يَأتِيَنَّكُم رُّسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ
 تَمَنّٰى اَلْعٰلٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (۷/۳۵)
 (اور فرمان الہی ہوا تھا) اے اولادِ آدم! جب کبھی ایسا ہو کہ میرے پیغمبر تم میں پیدا ہوں
 اور میری آیتیں تمہیں پڑھ کر سنائیں تو جو کوئی ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گا
 اور اس طرح اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دے گا تو اس کے لئے نہ کسی طرح کا اندیشہ ہوگا

یہ کسی طرح کی غمگینی۔

پیام رسانی | اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہدایتِ خداوندی جس کا وعدہ نوحِ انسانی سے کیا گیا تھا خدا کے رسولوں کی وساطت سے ملنی تھی۔ لہذا ہدایتِ آسمانی وہی ہے جسے اللہ کے رسول پیش کریں۔ رسول (پیغامبر) کو رسول کہا ہی اس لئے جاتا ہے کہ وہ رسالات (پیامات) خداوندی پہنچاتا ہے۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا۔

أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَتِ رَبِّي ۖ وَأَنْصَحُ لَكُمْ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۴/۶۲)

میں اپنے پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچاتا ہوں اور پسند و نصیحت کرتا ہوں اور اللہ کی طرف سے اس بات کا علم رکھتا ہوں جو تمہیں معلوم نہیں۔

یہی کچھ حضرت ہودؑ، صالحؑ، شعیبؑ (علیہم السلام) نے فرمایا۔ (دیکھئے ۴/۶۸، ۴/۶۹، ۴/۹۳)۔ خود نبی اکرمؐ سے ارشاد ہے۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ بَلِّغُوا مَا أُتِيَ بِكُمْ مِنَ رَبِّكُم ۚ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا فَمَا بَلَّغْتُمْ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝ (۵/۶۷)

اے پیغمبر! تمہارے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اسے (خدا کے بندوں تک) پہنچا دو (اور دشمنوں کی مخالفت کی کچھ پروا نہ کرو) اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو (پھر) خدا کا پیغام نہیں پہنچایا۔ (یعنی ادائے فرضِ رسالت میں کوتاہی کی اور اللہ تمہیں انسانوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ وہ اس گروہ پر کامیابی کی) راہ نہیں کھولتا جس نے کفر کی راہ اختیار کی ہے۔

سورۃ اعراف کی مندرجہ صدر آیت (۷/۳۵) پر ایک بار پھر غور کیجئے۔ نوحِ انسانی سے ارشاد ہے کہ اِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ اس میں مِنْكُمْ (تم میں سے) کا لفظ توجہ طلب ہے۔ یعنی اگرچہ ہدایت کا سرچشمہ انسانوں کی دنیا سے ماورا ہے لیکن یہ ہدایت جن رسولوں کے توسط سے ملے گی وہ انسان ہی ہوں گے۔ انسانی جہالت کا تقاضا چونکہ توہم پرستی ہے اس لئے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی

رسول انسان ہی ہوتے تھے

کہ جو شخص اللہ کی طرف سے رسول ہے وہ اُن جیسا ایک آدمی کیسے ہو سکتا ہے؟ اسے عالم بشریت سے الگ کچھ اور ہونا چاہیئے (وہ تو خیر عہدِ جہالت تھا۔ آج بھی تو ہم پرستی کا یہ عالم ہے کہ جن لوگوں میں "روحانیت" سمجھی جاتی ہے انہیں انسانی دنیا سے کچھ الگ تھلگ تصور کیا جاتا ہے) اسی لئے قرآن کریم نے متعدد مقامات پر حضراتِ انبیاءِ کرام کی بشریت کو کھلے اور واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ کہیں اس انداز میں کہ لوگ رسولوں کی بشریت پر تعجب کرتے تھے اور معترض ہوتے تھے کہیں اس اسلوب سے کہ خود حضراتِ انبیاءِ کرام اپنی بشریت کا اعلان فرماتے اور لوگوں کے دل پر اس حقیقت کو نقش کرتے تھے۔ قصہ حضرت نوحؑ کے ضمن میں فرمایا۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا تَرِيكَ إِلَّا
بَشَرًا مِثْلَنَا ۝ (۲۴/۱۱ نیز ۲۳/۲۳)

اس پر قوم کے ان سرداروں نے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی کہا کہ ہم تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو۔

حضرت صالحؑ کی قوم نے بھی یہی کہا۔

مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا ۝ فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ كُنْتَ مِنْ
الصَّادِقِينَ ۝ (۲۶/۱۵۴)

تم تو ہمارے ہی جیسے ایک آدمی ہو (ہمیں تو تم میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے خدا نے تمہیں رسالت کے لئے منتخب کیا ہو) اگر تم (درحقیقت) سچے ہو تو کوئی نشانی لاؤ۔

یہی قوم حضرت شعیبؑ نے کہا۔

وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَإِنْ نَظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ۝ (۲۶/۸۶)

اور تم تو ہمارے ہی جیسے ایک آدمی ہو اور ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔

جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ (علیہما السلام) نے فرعون اور اس کی قوم کے سامنے دعوتِ کلیبی کو پیش کیا تو انہوں نے بھی یہی اعتراض کیا تھا۔

فَقَاوَا أَنْتُمْ مِنْ بَشَرَيْنِ مِثْلِنَا ۝ قَوْمُهُمَا لَنَا عِدُونٌ ۝ (۲۳/۲۴)

تو وہ بولے کیا خوب! ہم اپنے ہی جیسے دو انسانوں پر ایمان لے آئیں، اور وہ انسان بھی اس قوم کے افراد جو ہماری محکوم ہے۔

ہر رسول کے متعلق یہی اعتراض ہوتا تھا۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالُوا أَبَشَرٌ يَهْدِيٰ دُنَا فَلَكَفَرُوا وَتَوَكَّوْا وَاسْتَغْنَىٰ اللَّهُ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝ (۶/۶۲)

بات یہ تھی کہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ اُن کے رسول آتے تھے اور وہ کہہ دیا کرتے کہ کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے؟ چنانچہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور (دعوتِ حق سے) اعراض برتتے تھے (بالآخر) خدا کی دعوت ان سے مستغنی ہو گئی اور اللہ تو ہمیشہ سے بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔

سورۃ ابراہیم میں اس اجمال کو ذرا تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ قوم نوح اور عاد و ثمود کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ آتِنِي شَاكًا ۚ فَاطْرِبِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ
وَ عَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ (۱۰-۱۱/۱۲)

ان کے رسولوں نے کہا ”کیا تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہے؟ وہ اللہ کہ آسمان و زمین کا بنانے والا ہے وہ تمہیں بلال رہا ہے کہ وہ تمہارے لئے تخریبی قوتوں سے محفوظ بننے کا سامان پیدا کر دے اور ایک وقتِ مقررہ تک (زندگی و کامرانی کی) ہمتیں دے۔“

اس پر قوموں نے کہا کہ تم اس کے سوا کیا ہو کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور پھر چاہتے ہو کہ جن معبودوں کی ہمارے باپ دادا اطاعت کرتے آئے ہیں ان کی اطاعت سے ہمیں روک دو۔ اچھا (اگر ایسا ہی ہے تو) کوئی واضح دلیل پیش کرو۔

ان کے رسولوں نے جواب میں کہا ”ہاں ہم اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ تمہاری ہی طرح کے آدمی ہیں۔ لیکن اللہ جس بندہ کو چاہتا ہے اپنے فضل و احسان کے لئے چن لیتا ہے۔ اور یہ بات ہمارے اختیار میں نہیں کہ تمہیں کوئی سند لا دکھائیں مگر ہاں یہ کہ اللہ کے حکم سے ہو۔ اور اللہ ہی ہے جس پر ایمان رکھنے والوں کا بھروسہ ہے۔“

خود نبی اکرمؐ کے متعلق بھی یہی اعتراض تھا۔

وَقَالُوا مَالِ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ
لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونُ مَعَهُ نَذِيرًا ۝ (۲۵/۴)

اور لوگوں نے کہا۔ یہ رسول کیسا ہے (جو عام انسانوں کی طرح) کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ انا دیا گیا جو اس کے ساتھ ڈرنے والا ہوتا۔

اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا أَنْعُمَ لِيَاسِكُنَ الطَّعَامَ
وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ ۝ (۲۵/۲۰)

اور (اے پیغمبر اسلام!) ہم نے تجھ سے پہلے تمام رسول ایسے ہی بھیجے تھے جو کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔

دوسری جگہ ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً ۝
(۱۳/۳۸)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے تجھ سے پہلے (بیشمار) پیغمبر قوموں میں پیدا کئے اور (وہ تیری ہی طرح انسان تھے) ہم نے انہیں بیویاں بھی دی تھیں اور اولاد بھی۔

لوگوں کو تعجب تھا کہ انہی میں سے ایک آدمی پر کس طرح وحی نازل ہو سکتی ہے۔

أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَا إِلَى رَجُلٍ مِّنْهُمْ أَنْ أَنْذِرِ النَّاسَ
وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا أَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۝ (۱۰/۲)

کیا لوگوں کو اس بات پر اچنبھا ہوا کہ انہی میں سے ایک آدمی پر ہم نے وحی بھیجی؟ اس بات کی وحی کہ لوگوں کو (انکار و بد عملی کے نتائج سے) خبردار کر دے اور ایمان والوں کو خوشخبری

دے دے کہ پروردگار کے حضور ان کے لئے اچھا مقام ہے۔

جتنا زیادہ انہیں تعجب تھا اتنی ہی زیادہ شدت و تکرار سے نبی اکرمؐ اپنی بشریت کا اعلان فرماتے تھے۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ
وَاحِدٌ ۝ (۲۱/۶ : ۱۸/۱۱۰)

(اے پیغمبر اسلام! صاف صاف کہہ دے کہ میں تو اس کے سوا کچھ نہیں ہوں کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ البتہ اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تمہارا الہ وہی ایک ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔

تمام رسول مرد تھے | پھر اس امر کی بھی تصریح فرمادی کہ تمام رسول مرد تھے۔
وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُوْحِي إِلَيْهِمْ

فَسَلُّوا أَهْلَ الدِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ (۲۱/۴) (۲۱/۴) اور (اے پیغمبر اسلام!) تجھ سے پہلے ہم نے جتنے رسولوں کو بھیجا، تو اسی طرح بھیجا کہ وہ مرد تھے ان پر ہم وحی بھیجتے تھے (ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آسمان کے فرشتے یا دیویاں اتر آئی ہوں) پس (اے منکرین حق!) اگر خود تمہیں (یہ بات) معلوم نہیں تو ان لوگوں سے دریافت کر لو جو آسمانی کتابوں کی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں (یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے کہ رسول مرد ہوتے تھے)۔

ایسا کیوں ہوا؟ | اللہ تعالیٰ اس پر قادر تھا کہ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے آسمان سے نورانی فرشتے اتر آتے اور وحی کے الفاظ کو بستیوں اور قریوں، امتوں اور جماعتوں

میں نشر کر دیا کرتے۔ لیکن پیغام رسانی کے اس مافوق الفطرت طریق سے انسانی رشد و ہدایت کا مقصد فوت ہو جاتا۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ انسانی اختیار و ارادہ، انسان کا سب سے بڑا جوہر اور اس کی قوت عقل و شعور اس کا بہت بڑا امتیاز ہے۔ اس قسم کے اسلوب پیغام رسانی سے انسان خوفِ بر اس سے طوعاً و کرہاً ہدایت قبول کرتا۔ جس میں نہ تو اس کے اختیار و ارادہ کو دخل ہوتا نہ عقل بصیرت کو درگ۔ اور یوں انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں جو بلا شعور و اختیار لگے بندھے قوانین کے تابع چلی جا رہی ہیں کچھ فرق نہ رہتا۔ رسولوں کا فوق البشر ہونا تو ایک طرف، اس مقصد کے پیش نظر تو مشیت کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ جو فرشتہ پیغام لاتا ہے اسے بھی مرئی (VISIBLE) صورت میں لوگوں کے سامنے لایا جائے۔

وَقَالُوا لَوْ لَا أَنْزَلَ عَلَيْهِ مَلَائِكَةٌ..... (۶/۸)

اور انہوں نے کہا کہ اگر یہ شخص اپنے دعوے میں سچا ہے، تو کیوں اس پر فرشتہ نہیں اُترتا (کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں؟)۔

اس سے اگلی آیت میں ہے کہ اگر بفرض محال ایسا کرنا ضروری ہوتا کہ وہ فرشتہ مرنی صورت میں سامنے آئے، تو بھی اسے اللہ تعالیٰ عام انسانوں کی شکل میں بھیجتا تاکہ رشد و ہدایت مافوق الفطرت انداز سے ذہن انسانی پر مسلط نہ ہو جاتی۔

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبَسُونَ ۝ (۶/۹)

اور اگر ہم کسی فرشتہ کو پیغمبر کرتے، تو اسے بھی انسان ہی بناتے (کیونکہ یہ قانون الہی کے خلاف ہے کہ فرشتے اپنی مرنی شکل میں انسانوں کے سامنے آئیں) اور جیسے کچھ شبہات یہ اب کر رہے ہیں، ویسے ہی شبہوں میں اس وقت بھی انہیں ڈال دیتے (یعنی یہ کہتے) یہ تو دیکھنے میں ہماری ہی طرح کا آدمی ہے فرشتہ نہیں ہے۔

دوسری وجہ | منصب رسالت کے لئے انسانوں ہی کو کیوں منتخب کیا گیا۔ اس کی دوسری وجہ قرآن کریم نے یہ بیان فرمائی ہے کہ

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا ۚ قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَتَمَشُّونَ مِطَافِينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا ۝ (۹۴-۹۵/۱۷)

اور حقیقت یہ ہے کہ جب کبھی اللہ کی ہدایت (دنیا میں) ظاہر ہوئی تو صرف اسی بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا کہ (متعجب ہو کر) کہنے لگے کہ کیا اللہ نے (ہماری طرح کا) ایک آدمی پیغمبر بنا کر بھیج دیا ہے؟ (اے پیغمبر!) کہہ دے کہ اگر ایسا ہوتا ہوتا کہ زمین میں (انساؤں کی جگہ) فرشتے بسے ہوتے اور اطمینان سے چلتے پھرتے، تو ہم ضرور آسمان سے ایک فرشتہ پیغمبر بنا کر اتار دیتے۔

یعنی چونکہ دنیا میں انسان بستے ہیں اس لئے ان کے لئے رسول بھی انہی میں سے ہونے چاہئیں۔

لے معجزات سے کیا مقصود ہے اس کے لئے سلسلہ معارف القرآن کی ایک کڑی "معراج انسانیت" میں دیکھئے۔

رسول کی حیثیت

اس سے فریضہ رسالت کے ایک اہم گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔ یعنی رسول کے ذمے صرف پیغام پہنچا دینا ہی نہیں (جیسے چٹھی رساں کے ذمے چٹھی پہنچا دینا ہوتا ہے) بلکہ وہ اس تعلیم خداوندی کو ایک عملی نظام معاشرہ کی صورت میں متشکل کر کے اس کے درخندہ نتائج اور خوشگوار ثمرات کو وحی خداوندی کی صداقت کے لئے بطور دلیل پیش کرتا ہے اور اس طرح لوگوں کو مشہود طریقے پر بتا دیتا ہے کہ یہ تعلیم ناممکن العمل نہیں ہے۔ تم نے بھی اسے اسی طرح کے نظام کی شکل میں آگے چلانا ہے۔ منصب رسالت کے مختلف گوشوں اور رسول کی متنوع حیثیتوں کا تفصیلی ذکر اپنے مقام پر آئے گا۔ اس مقام پر صرف اتنا بیان کرنا مقصود ہے کہ رسول کی حیثیت محض آلہ ابلاغ کی نہیں ہوتی کہ وہ (معاذ اللہ) ریڈیو سیٹ کی طرح محض نشر الصوت (BROADCASTING STATION) سے نشر شدہ پیغام کو فضا کی لہروں سے اخذ کر کے سامعین تک پہنچا دیتا ہے اور اس کے بعد لکڑی کا ایک ڈبہ رہ جاتا ہے۔ ایسا تصور منصب رسالت اور مقام نبوت سے انتہائی بے بھری کا ثبوت ہے۔

رسول سب سے پہلے خود اس پیغام پر ایمان لاتا ہے جو اس پر وحی کیا جاتا ہے۔
 اَمَّنَ الرَّسُولُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ... (۵۸)
 اللہ کا رسول اس (کلام) پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل ہوا ہے اور جو لوگ (دعوت حق پر ایمان لائے ہیں) وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

سب پہلے عبدِ مسلم

اور اس طرح وہ سب سے پہلا عبدِ مسلم بنتا ہے۔ یعنی اس جماعت کا پہلا رکن جو اس کے بعد وجود میں آنے والی ہوتی ہے اور جس نے قوانین خداوندی پر عمل کر کے دکھانا ہوتا ہے (۲۹/۱۲)۔

پھر وہ سب سے پہلے خود اس وحی کا اتباع کرتا ہے۔
 رَسُوْلٌ وَاٰتٰبَاعٌ وَّحٰی اَتَّبِعْ مَا يُوْحٰی اِلَيْكَ وَاصْلِحْ حَتّٰی يَخْرُجَ

اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ۝ (۱۰/۱۵ نیز ۱۰/۱۵)

دلے پیغمبر! جو کچھ تم پر وحی کی جاتی ہے اس کا اتباع کرو اور اس راہ میں جے رہو یہاں تک کہ اللہ تمہارے اور تمہارے مخالفین کے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے!

اور اس کے بعد دوسرے لوگوں (یعنی اپنی جماعت) سے اپنی اطاعت کراتا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنَ الرُّسُولِ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (۴/۶۴)

اور (دلے پیغمبر!) ان لوگوں کو جو تمہاری اطاعت کا حکم دیا گیا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو انہی کے ساتھ ہوئی ہو، ہم نے جس کسی کو بھی منصب رسالت دے کر دنیا میں کھڑا کیا تو اسی لئے کیا کہ ہمارے قانون کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔

رَسُولُ کی اطاعت | اس انداز کی اطاعت کہ اس کے سامنے سر ہی نہ جھکیں بلکہ اس کے فیصلوں کے آگے اس جماعت کے قلب و نگاہ کے تمام گوشے جھکے ہوئے ہوں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ
ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا
تَسْلِيمًا ۝ (۴/۶۵)

تمہارا پروردگار اس بات پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک ایسا نہ ہو کہ یہ اپنے تمام جھگڑوں، قضیوں میں تمہیں حاکم بنائیں۔ اور پھر (صرف اتنا ہی نہیں) بلکہ ان کے دلوں کی حالت بھی ایسی ہو جائے کہ جو کچھ تم فیصلہ کر دو اس کے خلاف کسی طرح کی دل گرفتگی محسوس نہ کریں اور وہ جو کسی بات کو مان لینا ہوتا ہے اسی طرح ٹھیک ٹھیک مان لیں۔

اسی اطاعت میں خدا کی اطاعت پوشیدہ ہوتی ہے۔

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلَّى فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِظًا ۝ (۴/۸۰)

جس کسی نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی تو اس نے فی الحقیقت اللہ کی اطاعت کی اور جس کسی نے روگردانی کی تو (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں ان پر کچھ پاسبان بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ ان کے اعمال کے لئے تم جوابدہ ہو اور جبراً ان سے اپنی اطاعت کراؤ۔

منصب رسالت میں یہ پہلو اپنی اہمیت کے اعتبار سے ایک مستقل باب کا محتاج ہے (اور یہ باب اپنے مقام پر آئے گا)۔ اگر دین انفرادی شے ہوتا۔ یعنی اس سے مقصود یہ ہوتا کہ ہر شخص اپنی اپنی جگہ کوئی اس گوشے میں، کوئی اس زاویے میں، کوئی کسی پہاڑ کی چوٹی پر، کوئی کسی دریا کے کنارے، اپنی اپنی انفرادی "نجات" کی فکر میں خدا کے دھیان اور پوجا پاٹ میں مستغرق رہے، تو اس صورت میں رسول کی اطاعت ضروری نہ تھی، جب رسول اللہ کے احکام لوگوں تک پہنچا دیتا تو لوگ اپنے اپنے طور پر ان احکام کی تعمیل کرنے لگ جاتے۔ لیکن اس طرز "مذہبیت" کو قرآن کریم نے رہبانیت قرار دیا اور ذہن انسانی کی اختراع بتایا ہے۔ (دیکھئے ۵۴/۲۷) جس کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی، جیسا کہ ہم وحی کے عنوان میں اجمالاً بتا چکے ہیں، وحی و رسالت کی ضرورت اس لئے ہے کہ انسانوں کو مدنیت کی زندگی بسر کرنا ہے۔ انہیں آپس میں مل جل کر رہنا ہے۔ ایسی طرز زندگی کے لئے ایک نظام اطاعت کی ضرورت ہے جسے

رسول کی اطاعت کیوں؟

عام اصطلاح میں حکومت اور قرآن کی رو سے دین کہا جاتا ہے۔ دنیاوی نظام حکومت میں (خواہ اس کا اصطلاحی نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے) قانون سازی کا اختیار کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعت کو ہوتا ہے اور باقی انسان ان کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جس نظام حکومت کے علمبردار حضرات انبیاء کرامؑ ہوتے ہیں اس میں اصولی قوانین کے وضع کرنے کا اختیار کسی انسان کو نہیں ہوتا۔ اس میں اصولی ضابطہ قوانین خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ رسول اپنی جماعت کے مشوروں کے ساتھ ان اصولی قوانین کی روشنی میں اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، جُزئی احکام مرتب کرتا ہے اور ان قوانین کو بطور نظام حکومت نافذ کرتا ہے۔ اس نظام کو نظام حکومت خداوندی کہا جاتا ہے یعنی وہ نظام جس میں قانون کی اصل، خدائی وحی ہوتی ہے۔ رسول اس نظام حکومت کا مرکزِ اولین ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کی اطاعت (جو درحقیقت قانون خداوندی کی اطاعت ہوتی ہے) ضروری ہوتی ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ (۵۴/۲۵)

(دیکھو) ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلے کھلے دلائل سے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب (ضابطہ قوانین) اور نظام عدل کو نازل کیا تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ اور ہم نے (سرکشوں کی سرکوبی کے لئے) لوہے کو پیدا کیا ہے جس میں بڑی طاقت اور لوگوں کے لئے بہت سی منفعتیں ہیں اور اس لئے کہ خدا کو معلوم ہو جائے کہ کون لوگ خدا (کے دین) کی اس کے محسوس نتائج دیکھے بغیر مدد کرتے ہیں (اگرچہ اُسے انسانوں کی امداد کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ) بلاشبہ اللہ خود بڑی طاقت کا مالک اور غالب ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا تا وقتیکہ اس کے مرکز کی اطاعت نہ کی جائے اس لئے حکومت خداوندی کے نظام میں رسول کی اطاعت نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ اطاعت رسول کی ذات کی اطاعت نہیں ہوتی۔ ذاتی اطاعت کا تو رسول کو اختیار ہی نہیں ہوتا۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ۝ (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے (انسانوں کی ہدایت کے لئے) کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا یہ شیوہ ہو کہ لوگوں سے کہے خدا کو چھوڑ کر میرے بن جاؤ (یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرو) بلکہ چاہیئے کہ ربانی انسان بنو اس لئے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہتے ہو اور اس لئے کہ تم اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

رسول اس ضابطہ قوانین کی اطاعت کرتا ہے جو اسے من جانب اللہ عطا ہوتا ہے اس لئے رسول کی

اطاعت در حقیقت خدا کی اطاعت ہوتی ہے۔

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۚ وَمَنْ تَوَلَّىٰ فَمَا أَرْسَلْنَاكَ
عَلَيْهِمْ حَفِظًا ۝ (۴/۸۰)

جس کسی نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی، تو اس نے فی الحقیقت اللہ کی اطاعت کی،
اور جس کسی نے روگردانی کی، تو (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں ان پر کچھ پاسبان بنا کر نہیں بھیجا
کہ ان کے اعمال کے لئے تم جوابدہ ہو اور جبراً ان سے اطاعت کراؤ۔

اس مقصد کے لئے رسول ایک معاشرہ (SOCIAL ORDER) کی تشکیل کرتا ہے جس میں افراد
معاشرہ کی مناسب تعلیم و تربیت سے ان کی مضمحل صلاحیتیں نشوونما پا کر تکمیل حاصل کرتی ہیں اور جب ان
صلاحیتوں میں صحیح توازن و اعتدال پیدا کر دیا جاتا ہے تو اس سے وہ کشمکش بھی ختم ہو جاتی ہے جو انسان
کے اپنے اندر مختلف اور متضاد صلاحیتوں میں عدم توازن کی بنا پر پیدا ہوتی ہے اور وہ کشمکش بھی جو
مختلف انسانوں میں باہمی مفاد کے تصادم سے رونما ہوتی ہے رسول کا فریضہ اس قسم کی تعلیم و تربیت سے
بہترین افراد معاشرہ کا پیدا کرنا ہوتا ہے۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝ (۲/۱۵۱)

جس طرح یہ بات ہوئی کہ ہم نے تم میں سے ایک شخص کو اپنی رسالت کے لئے چن لیا جو
تمہارے سامنے ہمارے قوانین پیش کرتا ہے تمہاری مضمحل صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام
کرتا ہے۔ تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ باتیں سکھاتا ہے جن سے تم بکسر
نا آشنا تھے۔

لہٰذا تمام امور کے مستقل ابواب اپنی اپنی جگہ الگ آئیں گے۔ اس مقام پر صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔
اے کتاب اور حکمت سے کیا مفہوم ہے؟ یہ اپنی جگہ آئے گا یہاں صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہوگا کہ کتاب سے مراد قانون
خداوندی ہے اور حکمت سے مفہوم وہ مصالح جن پر اس قانون کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نتائج جو اس قانون کا لازمی ثمر
ہیں۔ کتاب و حکمت دونوں منزل من اللہ ہیں اور قرآن کے اندر محفوظ۔

چونکہ تکمیل شرف انسانیت کا دار و مدار اسی نظام پر ہے اس لئے اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص نوازش کہا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کی دل کی آنکھیں کھلی ہوں تو اسے نظر آجائے کہ نوع انسانی پر اس سے بڑی نوازش اور کیا ہوگی؟

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (۲/۱۲۹)

بلاشبہ یہ اللہ کا مومنوں پر بڑا ہی احسان تھا کہ اس نے ایک رسول ان میں بھیج دیا جو ان ہی میں سے ہے وہ اللہ کے قانون ان کے سامنے پیش کرتا ہے ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ (اس نے اس طرح ان کی راہ ان پر کھول دی) حالانکہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے!

یہی وہ نظام ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو کسی قسم کا خوف و حزن نہیں رہتا نہ اس زندگی میں نہ اس کے بعد (جیسا کہ سابقہ عنوان میں بتایا جا چکا ہے) یہی انسان کا منتہائے مقصود ہے۔

وَمَا مُرْسَلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَ مُنذِرِينَ فَمَنْ أَمَنَ وَ أَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۶/۲۸)

اور (ہمارا قانون یہ ہے کہ) ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے۔ مگر اس لئے کہ (ایمان و عمل کی برکت کی) خوشخبری سنائیں اور (انکار و بد عملی کے نتائج سے) آگاہ کریں۔ پھر جو کوئی ایمان لایا اور اس نے اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کر لی تو اس کے لئے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی۔

تبشیر و تنذیر | رسولوں کی تبشیر و تنذیر سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ضابطہ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے درخشنہ نتائج کا مژدہ حیات بخش سنائیں (بلکہ ایسے نتائج کو عملاً سامنے لے آئیں) اور اس مسلک زندگی سے روگردانی کرنے والوں کو ان کی غلط روش کے ہلاکت انگیز عواقب سے آگاہ کریں تاکہ وہ صحیح راستہ اختیار کر لیں۔ چونکہ حضرات انبیاء کرام کی دور رس

نگاہیں وحی کی روشنی میں ان نتائج و عواقب کو واضح طور پر اپنے سامنے دیکھتی ہیں۔ اس لئے راہِ راست سے مُنہ موڑنے والوں کی بربادی اور تباہی کا تصور ان کے قلبِ حساس کو اندوہناک اور درد آگیز کر دیتا ہے اور وہ ایک طبیبِ مشفق کی طرح اس فکر میں غلطاں و بیجاں رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح مریض کی جان بچ جائے۔ نبی اکرم کی اس قلبی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَذَا الْحَدِيثِ
أَسَفًا ۝ (۱۸/۶)

(اے پیغمبر!) تیری حالت تو ایسی ہو رہی ہے کہ جب لوگ ایسی (واضح) بات بھی نہ مانیں، تو عجب نہیں ان کی (ہدایت) کے پیچھے تو مارے افسوس کے اپنی جان ہلاکت میں ڈال دے۔
دوسری جگہ ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝ (۲۶/۲)
شاید (اے پیغمبر!) تم تو اس غم میں کہ وہ لوگ مومن کیوں نہیں بن جاتے (پنی جان ہی ہلاکت میں ڈال دو گے۔

لیکن چونکہ ہدایت اس کو ملتی ہے جو اپنے دل کے ارادے سے اسے حاصل کرنا چاہے اس لئے حضور سے کہا گیا کہ ان لوگوں کے دلوں کو بدل دینا آپ کے ذمے نہیں۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هَذَا بِهَمٍّ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ... (۲/۲۴۲)
(اے پیغمبر!) تم پر کچھ اس بات کی ذمہ داری نہیں کہ لوگ ہدایت قبول ہی کر لیں (تمہارا کام صرف سمجھا دینا ہے ہدایت تو خدا کے قانون کے مطابق اسے ملتی ہے جو ہدایت لینا چاہے۔
آپ کے ذمے تو فقط ہدایت کا پہنچا دینا ہے۔

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ ۚ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَا حِمَلْتُمْ ۚ وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا ۚ وَمَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۝ (۲۴/۵۴) نیز (۱۶/۲۵)

(اے پیغمبر!) تم کہہ دو کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو! پھر اگر وہ لوگ اس سے روگردانی

لے اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت دو مستقل اور الگ الگ اطاعتیں نہیں ہیں، بلکہ اس سے مراد قانونِ خداوندی (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

کریں تو (انہیں سمجھ لینا چاہیئے) کہ رسول کے ذمے صرف اتنا ہی ہے جتنا اس پر بار ڈالا گیا ہے۔
 (یعنی انسانوں تک احکام الہی کو پہنچا دینا) اور تمہارے ذمے وہ سب کچھ ہے جس کا تم پر بار ڈالا
 گیا ہے۔ (یعنی ان احکام پر عمل پیرا ہونا۔ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرنا) اگر تم اس کے رسول
 کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے۔ اور معلوم رہے کہ رسول کے ذمہ تو صرف (احکام الہی کو
 انسانوں تک صاف صاف طور سے پہنچا دینا ہے۔) اور بس۔

ایک عظیم المرتبت حقیقت | سلسلہ رشد و ہدایت کے ضمن میں قرآن کریم نے ایک ایسی
 حقیقت کو پیش کیا ہے جسے اگر صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو
 دنیا کے مذاہب سے بحث و جدل اور اختلاف و نزاع کا خاتمہ ہو جائے اور مذہب کے نام پر جس قدر خونریزیاں
 اور فساد انگیزیاں ہو رہی ہیں سب صلاح و فلاح میں بدل جائیں۔ موجودہ مذاہب کی دنیا پر غور کیجئے۔ ان
 میں سے ہر ایک ایک دوسرے کا رقیب اور ابدی دشمن دکھائی دیتا ہے اور چونکہ ہر مذہب اپنے آپ کو آسمانی
 تعلیم کا حامل قرار دیتا ہے اس لئے مذہب کی موجودہ عداوت و رقابت کے پیش نظر انسان لامحالہ اسی نتیجہ پر
 پہنچتا ہے کہ ان مذاہب کے بانی بھی ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ متشدد طبقہ کے لوگ اس خیال کا اظہار علامتہ
 کرتے رہتے ہیں۔ لیکن متوسط ان خیال لوگ چونکہ اس عقیدہ کو اختلاف و نزاع کا موجب سمجھتے ہیں اس لئے وہ
 ایک دوسری راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مذاہب سب اپنی اپنی جگہ سچے ہیں۔ لیکن اہل مذاہب نے
 باہمی ضد اور تعصب سے اختلاف و نزاع کی صورتیں پیدا کر رکھی ہیں۔ لیکن جہاں پہلا عقیدہ غلط ہے یہ دوسرا
 عقیدہ بھی صحیح نہیں۔ حقیقت ان سے الگ ہے۔ پہلے عقیدہ کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ باقی رہا دوسرا
 عقیدہ۔ سو یہ ظاہر ہے کہ مذاہب چھپے ہوئے تو ہیں نہیں کہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ ان کی اصلی تعلیم کیا ہے اور
 ان کے پیرو اسے کس رنگ میں پیش کر رہے ہیں۔ ان کے پیروؤں کے اعمال غلط ہوں لیکن ان مذاہب کی
 تعلیم ان کتابوں کے اندر ہے اور یہ کتابیں ہر جگہ مل سکتی ہیں۔ انہیں پڑھ کر دیکھ لیجئے۔ ایک دوسرے سے
 کس قدر مختلف ہیں۔ لہذا باہمی رواداری اور حسن سلوک یا جذبہ موعوبیت کی بنا پر یہ کہہ دینا کہ تمام مذاہب
 یکساں طور پر سچے ہیں لیکن ان کے ماننے والے اپنی تعلیم کو غلط انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ ایک کھلی ہوئی

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ فٹ نوٹ) کی اطاعت بذریعہ اس مرکز نظام حکومت کے لئے جو اس قانون کو نافذ کرتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی
 مروج انسانیت میں ملے گی۔

حقیقت سے چشم پوشی بلکہ فریب دہی ہے۔ اگر سب مذاہب (جس شکل میں وہ آج موجود ہیں) خدا کی طرف سے ہیں اور سب یکساں اور سچے ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ہی خدا نے مختلف مذاہب کو دنیا میں بھیج کر اس قدر تشدد و انتشار، افتراق و اختلاف اور جنگ و جدل کی راہیں کیوں کھول دیں؟ انسانوں کے باہمی اختلافات کے لئے بے شمار اسباب و علل دنیا میں موجود رہتے ہیں اور مذہب کا اولین فریضہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ان اختلافات کو مٹا کر انسانوں میں یگانگت اور وحدت پیدا کرے۔ لیکن جب (تمام سچے اور یکساں) مذاہب باہمی اختلاف و نزاع کا سب سے بڑا ذریعہ بن جائیں تو اس کی علت سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

کیا سب مذاہب سچے ہیں؟ | بعض لوگوں نے اس الجھن سے گھبرا کر اور اس حقیقت کو محسوس کر کے کہ مختلف مذاہب کی کتابوں میں اختلاف موجود

ہے امن و سلامتی کی یہ راہ نکالی کہ ان مذاہب کی کتابوں سے ”اچھی اچھی باتیں“ ایک جگہ جمع کر کے اس ”مجموعہ حسنات“ کو انسانوں کا مشترکہ مذہب قرار دیا جائے۔ چنانچہ یہی وہ جذبہ ہے جو مختلف زمانوں میں مختلف نقاب اڑھ کر سامنے آتا رہا ہے۔ کبھی اکبر کے درن الہی کی شکل میں کبھی برہمہ سماج کی صورت میں۔ شکلیں مختلف ہوں لیکن روح ہر جگہ وہی کار فرما ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جذبہ کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ دنیا میں جس قدر مذہبی کتابیں ہیں ان میں اچھی اچھی باتیں بھی ہیں اور بُری بھی، اچھی اچھی باتوں کو ایک جگہ جمع کر کے بُری باتوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اس عقیدہ کا مطلب یہ ہوا کہ گویا آج آسمان کے نیچے کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں جسے خالصتہً من جانب اللہ قرار دے کر اس کی تعلیم کو مذہبی نصاب بنایا جاسکے۔ یعنی ایک طرف تو ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ انسانوں کی رشد و ہدایت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے اُس نے ذریتِ آدم سے کہہ دیا تھا کہ جو ہدایت اس کی طرف سے آئے اس کی پیروی کرنے سے نجات و سعادت حاصل ہوگی۔ اور دوسری طرف عملاً یہ صورت ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے اس کا کوئی انتظام ہی نہیں کیا کہ انسانوں کی ہدایت کے لئے ان کے اندر کوئی ایسی کتاب موجود ہو جسے بطور ضابطہ زندگی اختیار کیا جاسکے۔ اور اب بیچارے انسان کو مجبوراً یہ راہ اختیار کرنی پڑی کہ جہاں جہاں اسے اچھی اچھی باتیں ملیں انہیں اکٹھا کر کے اپنے لئے ایک نصاب زندگی تجویز کرے۔ پھر ”اچھی باتوں“ کا معیار کیا ہے؟ ذہن انسانی کی میزان۔ اور ذہن انسانی کی جو کیفیت ہے اسے ہم وحی کے عنوان میں دیکھ چکے ہیں۔

اور اگر آپ کہیں کہ نہیں نیکی اور ہدی کا معیار ذہن انسانی نہیں بلکہ ان مذاہب کی مقدس کتب ہیں

ہیں۔ تو اس سے یہ غلط فہمی اور بھی بڑھ جاتے گا۔ موجودہ تورات کو صحیفہ آسمانی ماننے والوں کے نزدیک دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ عین نیکی ہے۔ اس کے برعکس انجیل کو تعلیم خداوندی سمجھنے والوں کے نزدیک ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینا نیکی۔

تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے دلہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر تجھ پر بالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو جو غصہ بھی اسے لے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جاہ

(متی ۳۸-۵/۴۲)

اس سے آگے بڑھتے لکھا ہے۔

تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے بڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے غداوت۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دعا مانگو۔ تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر رہے بیٹے ٹھہرو۔ کیونکہ وہ اپنے سوچ کو بدوں اور نیکیوں دونوں پر چمکاتا ہے اور راست بازوں اور ناراستوں دونوں پر مینہ برساتا ہے۔

(متی ۲۳-۵/۴۵)

”تم سُن چکے ہو کہ کہا گیا تھا! تورات میں۔ اسی تورات میں جو خود بائبل کا حصہ ہے یہاں یوں ہی ایک مثال پیش کر دی گئی ہے ورنہ اگر آپ مختلف مذاہب کی مذعومہ آسمانی کتابوں کا مطالعہ کریں تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ ان کی تعلیم میں کس قدر اصولی اختلافات ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ (قرآن کریم کے سوا) ان میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس کے متعلق حتمی اور یقینی طور پر کہا جاسکے کہ وہ من وعین وہی ہے جو اس کتاب کے لانے والے نے اپنے متبعین کو دی تھی۔ ان کتابوں کی تاریخی حیثیت کیا ہے اور ان میں کس قسم کی تعلیم پائی جاتی ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے جس کے متعلق دوسری کتاب (مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں) میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اس وقت صرف اس چیز کو سامنے رکھتے کہ ان کتابوں میں ایک دوسرے سے ایسی متضاد و متباہن تعلیم پائی جاتی ہے جس میں باہمی تطابق و توافق کی کوئی راہ نہیں نکلی سکتی۔ لہذا یہ نظریہ بنیادی طور پر غلط ہے کہ ان مختلف مذاہب کی کتابوں کی تعلیم کو ”نیکی اور ہدی“ کا معیار قرار

دیکھا جائے اس صورت میں تو ایک ہی عمل ایک کتاب کے مطابق نیک اور دوسری کے مطابق بد قرار پا جائے گا۔ حالانکہ ہم سابقہ عنوان میں دیکھ چکے ہیں کہ حقیقت ایک ہے اور جہاں جہاں یہ بے نقاب ہوئی ہے ایک ہی صورت میں ہوئی ہے، آپ نے غور کیا ہو گا کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے ذہن انسانی نے جس قدر راہیں تلاش کی ہیں ان میں سے کوئی راہ بھی تسلی بخش نہیں رہی۔ اب

صحیح راہ عمل

دیکھئے کہ قرآن کریم اس کے متعلق کیا کہتا ہے۔ اس بحث کا صحیح مقام تو اسلام کا عنوان ہے۔ لیکن چونکہ وہ باب بہت دیر میں سامنے آئے گا اس لئے اس مقام پر اطناب و تفصیل سے قطع نظر صرف اجمالی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم بتاتا ہے کہ

(۱) جس وقت سے انسانوں کو آسمانی روشنی کی ضرورت لاحق ہوئی، اللہ تعالیٰ نے سلسلہ رشد و ہدایت کو برابر جاری رکھا اور ہر قوم میں اپنے رسول بھیجے

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا
خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۝ (۲۳/۲۵ نیز ۱۶/۳۶ ذ ۱۰/۴۷)

اے پیغمبر! ہم نے تمہیں سچائی کے ساتھ (ایمان و عمل کی برکتوں کی) خوشخبری سنانے والا اور (انکار و بد عملی کے نتائج سے) آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا۔ تم کوئی انوکھے نبی بن کر نہیں آئے ہو ہر قوم میں کوئی نہ کوئی (انکار و بد عملی کے نتائج سے) آگاہ کرنے والا گزر چکا ہے۔

یہ سلسلہ متواتر جاری رہا۔

ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا ۖ كُلَّمَا جَاءَ أُمَّةً رَّسُولُهَا كَذَّبُوا ۖ فَاتَّبَعْنَا
بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۖ وَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ ۖ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ ۖ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ (۲۳/۲۴)

پھر ہم نے لگاتار ایک کے بعد دیگرے اپنے رسول بھیجے۔ لیکن جب کبھی کسی قوم میں اس کا رسول ظاہر ہوا معاوہ جھٹلانے پر آمادہ ہو گئی۔ پس ہم بھی (اپنے قانون مکافات کی رو سے) ایک کے بعد ایک کر کے انہیں برباد کرتے گئے اور ان کی ہستیاں افسانے بن گئیں۔ سوال کے لئے

محرمی و نامرادی ہے جو قانونِ خداوندی پر ایمان نہیں رکھتے۔

ان حضراتِ انبیاءِ کرام کی وساطت سے ہر زمانہ اور ہر ملک میں مختلف اقوام و ملل تک اللہ کے پیغامات پہنچتے رہے۔

(۲) ان پیغاماتِ خداوندی کا سرچشمہ چونکہ ایک ہی تھا اس لئے ان کی اصل و بنیاد ہمیشہ ایک رہی۔ یعنی خدائے واحد کے قوانین کی اطاعت۔ اس کے سوا کسی اور کی محکومیت کو جائز نہ سمجھنا اور یوں ایک خدا کی حاکمیت تسلیم کر کے تمام مخلوق کا ملتِ واحدہ بن کر رہنا۔ تعلیم ربانی کا یہ نقطہ ماسکہ شروع سے اخیر تک ایک ہی رہا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ
وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ
وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۚ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۗ اللَّهُ
يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ ۝ (۲۲/۱۳)

(اور دیکھو اے لوگو! خدا نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا۔ اور جس کو ہم نے (اے پیغمبرِ اسلام!) تمہارے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ اور جس کا ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا۔ اور (اُن سے اور ان کی قوموں سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ) اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ اندازی نہ کرنا۔ (حیرت ہے کہ اگرچہ یہ نئی اور انوکھی بات نہیں مگر) مشرکین کو وہ بات بڑی گراں گذر رہی ہے جس کی طرف تم نہیں بلا رہے ہو (حیرت ہے کہ وہ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ فلاں کو نبوت کیوں دی گئی اور فلاں کو کیوں نہیں؟ خدا انسانوں کی مرضی کے تابع نہیں ہے) خدا جسے چاہتا ہے اپنی رسالت کے لئے منتخب کر لیتا ہے اور جو شخص خدا کی طرف رجوع کرتا ہے اسے اپنی طرف کا راستہ دکھا دیتا ہے۔

یہ تو حق دین کی اصل و اساس۔ لیکن اس اصل کو بروئے کار لانے کے لئے عملی نظام کی تشکیل (یعنی مناجح و مناسک) میں مقتضیاتِ زمانہ کے اعتبار سے جزئیات میں رد و بدل ہونا رہا۔

(۳) یہ پیغامات آتے کچھ عرصہ تک اپنی اصلی صورت پر قائم رہتے اس کے بعد یا تو آفاتِ ارضی و سماوی

کے ہاتھوں ضائع ہو جاتے۔ یا خود انسانوں کی دستبرد سے ان میں تخریف و الحاق ہو جاتا۔ یا انہیں فراموش کر دیا جاتا لہذا کچھ وقت کے بعد ان پیغامات کی پھر سے تجدید ہو جاتی۔ انہی جیسے پیغامات (آیات اللہ) کا پھر سے نزول ہو جاتا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقت بھی تھی۔ انسانیت خود اپنے ارتقائی منازل طے کر رہی تھی۔ اس کے مقتضیات و داعیات میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس لئے ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق نظام خداوندی کے تشکیلی عناصر میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ یعنی ہر رسول کی وساطت سے کچھ توسیع رسول کے فراموش کردہ یا ضائع شدہ پیغام کی تجدید ہو جاتی اور جزئیات میں کچھ تغیر و تبدل بھی ہو جاتا۔ (لیکن اصل و اساس ہمیشہ ایک رہتی) لیکن یہ تغیر و تبدل ہمیشہ عروج کی طرف لے جاتا۔ مہبوط و تنزل کی طرف نہ جاتا۔ اس لئے ہر نئے رسول کے وقت جہاں سابقہ رسول کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان کا حکم دیا جاتا وہیں اس نئے رسول کا اتباع اور اس کی اطاعت لازم قرار دی جاتی۔ سورہ بقرہ کی اس آیت جلیلہ میں اسی اہم حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

مَا تَكْسِرُ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْصِفُهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (۲/۱۰۶)

(ہمارا قانون یہ رہا ہے کہ) ہم اپنے احکام میں سے جو کچھ منسوخ کر دیتے یا فراموش ہو جانے دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل کر دیتے ہیں۔ (لے پیغمبر! کیا تمہیں معلوم نہیں) (ضرور معلوم ہے) کہ اللہ ہر بات پر قادر ہے؛ (تو اس کے لئے ایک حکم کی جگہ اس جیسا یا اس سے بھی بہتر حکم دے دینا کیا مشکل ہے)۔

چنانچہ قرآن کریم میں کتب سابقہ کی تخریف و الحاق کا ذکر متعدد مقامات پر موجود ہے۔ آج دنیا میں (اسلام کے سوائے) کوئی مذہب ایسا نہیں جو اس دعوے کو ثابت کر سکے کہ جس کتاب کو اس کے ہاں صحیفہ آسمانی سمجھا جاتا ہے وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جو اس کے ”بانی“ نے انہیں دی تھی۔ یہ ایک تاریخی بحث ہے جس میں معتقدات کو کچھ دخل نہیں۔ اس لئے ہمارا یہ دعویٰ بھی تاریخی شواہد پر مبنی ہے اور اس کی سند میں خود اہل مذاہب کے اعترافات موجود ہیں۔ (تفصیل ان امور کی ”مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں“ میں ملے گی)۔

(۴) یہ سلسلہ رشد و ہدایت یونہی جاری رہا تا آنکہ دنیا اپنے عہد طفولیت سے نکل کر سن رشد

بلوغ تک پہنچ گئی۔ اب مشیت ایزدی کے اندازے کے مطابق وہ وقت آگیا کہ ان تمام ازلی حقائق کو جو اس سے پیشتر حضرات انبیائے کرام کی وساطت سے وقتاً فوقتاً نوع انسانی کی طرف بھیجے گئے تھے اور جو یا تو بالکل ضائع ہو چکے تھے یا ان میں تحریف و الحاق ہو چکا تھا۔ ان کی اپنی اصل شکل میں ایک جگہ جمع کیا جائے۔ پھر ان تمام احکامات کو جو وقتی طور پر آئے تھے ایسے احکامات سے بدل دیا جائے جو اصولی طور پر قیامت تک کے لئے انسانی داعیات و مقتضیات کو پورا کر سکیں۔ ان تمام حقائق کو ایک جامد ون کر کے اس مجموعہ کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا جائے کہ نہ تو یہ آفات ارضی و سماوی کے ہاتھوں ضائع ہونے پائے اور نہ اس میں انسانی دستبرد کچھ تصرف کر سکے۔ اس مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ چنانچہ ضابطہ خداوندی کے اس آخری اور مکمل ایڈیشن کے بعد حکم یہ دیا گیا کہ اب اطاعت اس کی اور صرف اس کی لازم ہے۔ اس کے باہر کوئی قانون نافذ العمل نہیں۔ اب دین ہے تو یہی اور اطاعت ہے تو اسی کی۔ یہ اس خدا کا اعلان ہے جس نے اپنی آخری کتاب کو نازل کیا اور ان احکامات کو جو اس سے پیشتر نافذ العمل تھے سمٹا کر اسی ایک کے اندر محفوظ کر دیا۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنْ
الْكِتَابِ وَ مُهَيِّمًا عَلَيْهِ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا
تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۵/۴۸)

اور (اے پیغمبر اسی طرح) ہم نے تمہاری طرف سچائی کے ساتھ کتاب بھیجی۔ ان کتابوں کی اصلی صداقتوں کو سچ کر دکھانے والی جو پہلے سے موجود ہیں۔ اور ان سب کو اپنے اندر لئے ہوئے (اور یوں ان کی صداقتوں کی حفاظت کئے ہوئے) خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور جو سچائی تمہارے پاس آچکی ہے اسے چھوڑ کر لوگوں کی خواہشوں اور رایوں کی پیروی نہ کرو۔

کہہ دیا جاسکتا ہے کہ یہ تو صاحب پھر وہی بات ہوئی کہ ہمارا دین سچا ہے اور دوسرے ادیان باطل اور یہی دعویٰ ہر ایک اہل مذہب کرتا ہے۔ پھر آپ میں اور ان میں فرق کیا ہوا؛ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں فرق یہ ہے کہ کسی اور اہل مذہب کے پاس ان کی کتاب اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہیں۔ اور قرآن کریم کے متعلق داخلی اور خارجی شواہد موجود ہیں (جن کا اعتراف خود غیر مسلم مورخین اور محققین کو بھی ہے)

کہ یہ حرفاً و ہاوی ہے جو نبی اکرمؐ نے دنیا کو دیا۔ اس تاریخی شہادت کے بعد دوسری حقیقت یہ ہے کہ اس کی تعلیم انسانی داعیات کے عین مطابق ہے اور دنیا آہستہ آہستہ اپنے تجربات کی ناکامیوں کے بعد اس کی طرف لوٹتی آرہی ہے۔ (تفصیل سابقہ عنوان میں گزر چکی ہے)۔

(۵) یہ ہے وہ حقیقت جو آسمانی تعلیم کے متعلق قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے اور جس کی تین شہادت تاریخ کے اوراق سے ملتی ہے۔ اسی لئے اس نے کسی شخص کے توہن ہونے کے لئے جہاں نبی اکرمؐ پر ایمان لانے کی شرط پیش کی ہے اس کے ساتھ ہی یہ شرط بھی ہے کہ وہ اس حقیقت پر ایمان لائے کہ حضورؐ سے پیشتر جس قدر انبیائے کرام تشریف لائے وہ سب منجانب اللہ تھے اور ایک مشعل کی مختلف کرنیں۔ ایک ہی لڑی کے تابناک گوہر ایک جوئے رواں کے قطرات آب۔ ایک ہی ملت کے مختلف افراد۔

وَإِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ۝ (۲۳/۵۲)

اور (اے گروہ پیغمبران! دیکھو!) یہ تمہاری امت دراصل ایک ہی امت ہے اور تم سب کا پروردگار میں ہی ہوں۔ پس تم تقویٰ کی راہ اختیار کرو۔

ان تمام حضرات انبیاء کرامؐ پر ایمان مسلمان کے لئے شرط اولین ہے۔

قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَىٰ إِبْرٰهٖمَ
..... وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (۲/۱۳۶ - ۱۳۷)

تم کہو: ہمارا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں۔ قرآن پر ایمان لائے ہیں جو ہم پر نازل ہوا ہے۔ ان تمام تعلیموں پر ایمان لائے ہیں جو ابراہیمؑ کو اسماعیلؑ کو اسحاقؑ کو یعقوبؑ کو اور اولاد یعقوبؑ کو دی گئیں۔ نیز ان کتابوں پر جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ بلکہ دنیا کے تمام نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی تھیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے (ہر ایک کے متعلق ایمان رکھتے ہیں کہ وہ خدا کے سچے پیغام بر تھے) ہم خدا کے قانون کے فرمانبردار ہیں! اگر یہ لوگ کبھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر سمجھو کہ انہوں نے (اسلام و اطاعتِ خداوندی کی) سیدھی راہ پائی۔ اور اگر وہ اس سے اعراض کریں تو (یاد رکھو) وہ (ہمیشہ) مبتلائے نزاع رہیں گے (اور)

خدا ان (کی ان) بدکرداریوں اور باہمی نزاع و اختلاف کو کافی ہو جائے گا اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

ایسا ایمان کہ ان میں سے کسی ایک میں فرق نہ کیا جائے۔ ہر ایک کے متعلق ایمان رکھا جائے کہ وہ اپنے اپنے وقتوں میں خدا کے سچے رسول تھے (۲/۲۸۵)۔ ان میں تفریق کرنا کفر ہے (۴/۱۵۰)۔
(۶) لیکن تفریق بین الرسل کی ایسی سخت ممانعت کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ ان رسولوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ یعنی ان کے دائرہ تبلیغ کے اعتبار سے (۲/۲۵۳ و ۱۴/۵۵)۔ یعنی یہ حیثیت رسالت ان تمام حضرات انبیاء کرام میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ سب خدا کے رسول تھے۔ لیکن ان کے دائرہ تعلیم اور احاطہ اثر و نفوذ کے اعتبار سے بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے جیسا کہ ہم آئندہ اوراق میں دیکھیں گے۔ بعض رسول ایک قبیلہ کی طرف مبعوث ہوتے۔ انہی کی اصلاح ان کے پیش نظر ہوتی۔ لہذا ان کے پیغام کا دائرہ اسی قبیلہ تک محدود رہتا۔ بعض ایک بہت بڑی قوم کی طرف مبعوث ہوتے اور بڑی بڑی سرکش قوتوں کے ساتھ مقابلہ کر کے احقاق حق اور باطل باطل کرتے۔ اور اس طرح ان کے حلقہ تبلیغ و تعلیم کے اعتبار سے ان میں فرق مدارج ہوتا۔ اس معیار کے مطابق یہ ظاہر ہے کہ جس رسول کی بعثت کسی خاص ملک یا خاص قوم، خاص جماعت یا خاص گروہ کے بجائے تمام نوع انسانی کے لئے ہو اور جس کا پیغام، زمان و مکان کی قیود و حدود سے بلند و بالا ہو۔ اور اسے قیامت تک کے لئے ضابطہ حیات انسانی قرار دیا جائے۔ اس رسول کو دیگر حضرات انبیاء کرام پر کس درجہ فضیلت ہوگی، یہ اللہ کے آخری رسول جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھے جن کے متعلق فرمایا۔

قُلْ يَٰ أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ۚ الَّذِي لَهُ
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ فَآمِنُوا
بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ النَّبِيُّ الَّذِي يَأْتِيكُم بِٱلْبَيِّنَاتِ ۚ وَٱللَّهُ
وَٱشْعَبُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ (۱۵۸ و ۳۴/۲۸)

اے پیغمبر! تم لوگوں سے کہو اے افرادِ نسلِ انسانی! میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ وہ خدا کہ ارض و سما میں تمام اقتدار اسی کے لئے ہے۔ کوئی صاحبِ اقتدار نہیں مگر اسی کی ایک ذات، موت اور حیات اس کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔ پس اللہ

پر ایمان لاؤ اور اُس کے رسول نبی اُمتی پر کہ اللہ اور اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کی پیروی کرو تاکہ (کامیابی کی) راہ تم پر کھل جائے۔ تمام نوعِ انسانی کے لئے رسول۔

وَ اَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا ۚ وَ كَفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا ۝ (۴/۹)
اور (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں تمام لوگوں کے لئے اپنا پیامبر بنا کر بھیجا ہے۔ (اور تمہارے پیغمبر ہونے کے لئے) اللہ کی گواہی بس کرتی ہے!

ان کے لئے بھی جن کے پاس اس سے پیشتر رسول آچکے تھے۔
يَا اَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرَّسُلِ اَنْ تَقُوْا مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا تَذِبُوْا ۚ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّلَا تَذِبُوْا ۚ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (۵/۱۹)

اے اہل کتاب (ایسی حالت میں کہ رسولوں کا ظہور مدتوں سے بند تھا) ہمارا رسول (یعنی پیغمبر اسلام) تمہارے پاس آیا تم پر احکام حق واضح کر رہا ہے تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہماری طرف کوئی نہیں بھیجا گیا۔ نواب (دیکھو) بشارت دینے والا اور آگاہ کرنے والا تمہارے پاس آگیا ہے (یعنی تمہارے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہا ہے) اور اللہ ہر بات پر قادر ہے۔

اور ان کے لئے بھی جن تک ابھی رسول نہیں پہنچے تھے۔

لَتُنذِرَ قَوْمًا مَّا اُنْذِرَ اٰبَاؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (۳۶/۶)
(اے پیغمبر اسلام!) ہم نے تمہیں اس لئے کتاب دی ہے تاکہ تم ان قوموں کو (بد عملی اور بدکرداری کے نتائج سے) ڈراؤ جن کے آباء (واجداد اپنی بدکرداریوں کے نتائج سے) نہیں ڈرے گئے تھے۔ چنانچہ وہ (اور ان کی اولادیں ابھی تک) غافل چلے آ رہے ہیں۔

سارے جہان کے لئے رسول اور سارے زمانوں کے لئے (قیامت تک کے لئے) رسول۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْاُمَمِيْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰیٰتِهِ وَ يَزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَ اٰخِرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۚ وَ هُوَ

الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (۲-۳/۶۲)

(اور دیکھو! تمہارا پروردگار) وہی خدا ہے جس نے ان لوگوں میں جنہیں اس سے پہلے کتاب نہیں ملی تھی انہی میں سے ایک رسول بھیج دیا۔ جو ان پر قوانین خداوندی کو ہمیش کرتا ہے اور ان کی صلاحیتوں کی نشوونما کی تکمیل کرتا ہے اور انہیں احکام الہی سکھاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی حکمت بھی (اس نے اپنی تعلیم سے اس ان پڑھ قوم میں دنیا بھر کی صلاحیت پیدا کر دی ہے) اگرچہ وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے (اور اس کی رسالت صرف ان لوگوں تک ہی محدود نہیں جو آج موجود ہیں بلکہ ان) دوسرے لوگوں کو بھی احاطہ کئے ہوئے ہے جو ابھی تک پیدا بھی نہیں ہوئے۔ اور (تمہیں معلوم ہے کہ) خدا بڑے غلبہ والا اور حکمت والا ہے۔

حضور کے بعد کوئی اور نبی نہیں آسکتا۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُولَ اللَّهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۖ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ۝ (۳۳/۲۰)

(اور دیکھو!) محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کا باپ نہیں ہے بلکہ (وہ تو) اللہ کا رسول ہے اور نہ صرف رسول بلکہ انبیاء کے خاتمہ کی مہر جس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نبوت ختم کر دی گئی، اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے (اسے خوب معلوم ہے کہ محمد اس منصب جلیل کا اہل ہے اور صحیح اہل ہے)۔

کہ اس مقام پر پہنچ کر دین کی تکمیل اور خدا کی نعمتوں کا اتمام ہو گیا۔

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا ۖ (۵/۳)

اس دور نبوت میں میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی۔ اور دین کی حیثیت سے تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا! (اب اگر کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دوسری راہ اختیار کرے گا تو وہ ہرگز اس سے قبول نہ کی جائے گی)۔

چونکہ یہ حضرات انبیاء کرام اسی ایک خدا کے مختلف پیغام رساں تھے۔ اس لئے ان میں (معاذ اللہ) نہ باہمی

رقابت تھی، نہ عداوت، بلکہ وہ ایک دوسرے کے مؤید و مصدق تھے۔ اور نبی اکرم چونکہ آخر میں تشریف لائے والے تھے۔ اس لئے ہر ایک جانے والا اپنی امت کو اس آخری آنے والے کی بشارت دے کر اور یہ تاکید کر کے جاتا تھا کہ جب وہ آنے والا آئے تو تم اس کی اتباع اور اطاعت کرنا۔ (اس اجمال کی تفصیل اور اس حقیقت کبریٰ کی تائید میں تاریخی شواہد اپنے مقام پر ملیں گے)۔

یہ ہے آسمانی سلسلہ رشد و ہدایت کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم۔ اس تعلیم کو سامنے رکھتے اور بھرپور سمجھتے کہ وہ تمام اشکال جن کا ذکر اس موضوع کے شروع میں کیا گیا ہے کس طرح ایک ایک کر کے حل ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس حقیقت کبریٰ پر بھی ایمان موجود ہے کہ تمام (آسمانی) مذاہب عالم کی اصلی اور سچی تعلیم کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔ اس لئے کسی مذہب کی اصلی اور سچی تعلیم کی تکذیب نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی اس تعلیم کے لانے والوں میں سے کسی کی شان میں سور ادبی کا تصور تک بھی لایا جاسکتا ہے۔ سور ادبی تو ایک طرف ان کی صداقت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہے کہ آج مختلف مذاہب کی تعلیم میں اس قدر اختلافات کیوں ہیں۔ اور سب سے آخریہ مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان تمام مذاہب کی اصلی اور سچی تعلیم کہاں مل سکتی ہے! یہ ہے قرآن کریم کی تعلیم۔ اگر تعصب کی پٹی کسی کی آنکھیں نہ بند کر دے تو کہئے کہ اس تعلیم کے ماننے میں کسی سلیم القلب انسان کو بھی تاثر ہو سکتا ہے؛ لیکن اس کے لئے قرآن کی تعلیم کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اور یہی چیز مشکل ہے جس دن انسان میں اتنی وسعت قلبی اور کشادگی نگاہ پیدا ہو گئی اسی دن یہ مشکلات ختم ہو جائیں گی۔ آخری عنوان ”گمہ باز گشت“ میں اس مسئلہ کو اور بھی زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجئے۔



ایک اور اہم حقیقت آگے بڑھنے سے پیشتر ایک اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے۔ یہ ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے اس امر کی وضاحت فرمادی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر بستی، ہر قریہ، ہر ملک میں حضرات انبیاء کرام مبعوث ہوتے رہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ان میں سے بعض کا ذکر قرآن کریم میں ہے اور باقیوں کا ذکر نہیں ہے۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصُصْهُمْ
عَلَيْكَ ۗ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ۝ (۲/۱۷۴ نیز ۲۰/۷۸)

نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم (قرآن میں) پہلے سنا چکے ہیں اور وہ جن کا حال ہم نے نہیں نہیں سنا یا۔ اور (اسی طرح) اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام کرنا بڑا ہے۔

لیکن جن رسولوں کا تذکرہ جمیلہ قرآن کریم میں مذکور ہے وہ تمام سامی اقوام سے متعلق ہیں، یا یوں کہیے کہ وہ عرب اور اس کے گرد و پیش بسنے والی قوموں کے رسول ہیں۔ باقی اقوام و ملل عالم کے رسولوں کا قرآن میں ذکر نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے ایک مقدمہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ انسانی علوم کی جس قدر شاخیں ہیں انہیں تین اہم شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) علم فطرت، (۲) تاریخ اور (۳) علم النفس۔ قرآن کریم نے ان علوم کی اہمیت پر جس قدر زور دیا ہے اس کے تذکرہ کا صحیح مقام قرآن کا عنوان ہے جو اپنی جگہ آئے گا۔ اس وقت صرف اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن نے تاریخ کو محض وقائع نگاری کی حیثیت نہیں دی بلکہ استقرائی طریق سے اس کے مطالعہ کو ضروری قرار دیا ہے۔ (اور یہی وہ استقرائے تاریخی ہے جسے اب انسان کی سیاسی و عمرانی زندگی میں اس قدر اہمیت حاصل ہے) اس نے حضرات انبیاء کرامؑ اور ان کی اقوام کا جو تذکرہ کیا ہے تو محض ایام و وقائع کی تاریخ کی حیثیت سے نہیں کیا بلکہ اس سے عبرت و موعظت کے خاص نتائج اخذ کئے ہیں۔ اس نے

ایام اللہ کی اہمیت

کیا گیا۔ ماننے والوں نے اسے کیسے مانا اور جھٹلانے والوں نے اسے کس طرح جھٹلایا۔ پھر یہ بتایا ہے کہ ماننے والوں کے اس ایمان و عمل نے کس قسم کے خوشگوار اور حیات بخش نتائج مرتب کئے اور تکذیب کرنے والوں کی سرکشی و عصیان نے انہیں کس طرح تباہی و بربادی کے جہنم کی طرف دھکیل دیا۔ ان واقعات کے بیان کرنے کے بعد اس نے بتایا ہے کہ یہ محض اتفاقی حوادث نہ تھے جو یوں ہی وجود پذیر ہو گئے بلکہ ان کا ظہور قوانین خداوندی کے ماتحت ہوا جسے سنت اللہ کہا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کو ذہن نشین کرانے کے بعد اس نے فکر و نظر کے تمام گوشوں کو اس مرکز کی طرف منتقل کر دیا کہ جب یہ سب کچھ ایام گزشتہ میں سنت اللہ (اللہ کے غیر متبدل قوانین) کے تابع ہوتا رہا ہے تو اب بھی وہی سنت اللہ جاری و ساری ہے جس میں تم کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں پاؤ گے۔ لَنْ يَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔ لہذا جو کچھ اقوام گزشتہ اور ملل سابقہ کے ساتھ ہوا وہی کچھ تمہارے ساتھ ہوگا۔ انہوں نے رسولوں کی دعوت کی تائید و تصدیق کی تو کامیابی و شاد کامی کی تمام راہیں ان پر کشاد ہو گئیں۔

اگر تم بھی ایسا کرو گے تو اسی قسم کی سعادت و نجات کی راہیں تم پر کھل جائیں گی۔ برعکس اس کے اقوام سابقہ کے مکہ میں نے اس دعوت کو جھٹلایا تو اس تکذیب کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر نکتہ و ادبار کا ہلاکت انگیز عذاب مسلط ہو گیا۔ اور پھر وہ قومیں آہستہ آہستہ ایسی فنا ہوئیں کہ ان کی صرف داستانیں باقی رہ گئیں۔ اگر تم بھی اپنے اعمال قلوب و جوارح سے اس آسمانی دعوت کی تصدیق نہ کر دو گے جو قرآن کے اندر آئی ہے تو تمہارا بھی انجام وہی ہوگا۔ یہ ہے وہ مقصد عظیم جس کے لئے قرآن کریم میں ملل قدیمہ اور حضرات انبیاء سابقہ کے احوال و قصص بیان ہوئے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا تھا کہ یہ اقوام و ملل اور ان کے پیغمبر وہ ہوتے جن سے اُس زمانہ کے مخاطبین واقف و شناسا تھے۔ یہ تمام قومیں جن کا ذکر قرآن کریم میں ہے عرب اور اس کے قرب و جوار (فلسطین، شام، مصر وغیرہ) کے علاقوں میں بسنی تھیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر بستیاں ایسی تھیں جن کے **صرف سامی اقوام کیوں؟** کھنڈرات عرب قافلوں کی گذرگاہوں میں پڑتے تھے اور جن کی ٹھیکریاں ان اقوام گذشتہ کی داستانیں تھیں۔ وہ لوگ ان قوموں کے افسانے دن رات سنتے تھے۔ ان کے کان حضرات انبیائے کرام کے اسمائے گرامی سے آشنا اور ان کے سوانح و احوال سے شناسا تھے۔ لہذا جب ان کے سامنے ان اقوام گذشتہ کے احوال و کوائف بیان کر کے ان کی توجہ اصل مقصود کی طرف منحطف کرانی جاتی تھی تو وہ ان داستانوں اور ان کے نتائج میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتے تھے۔ یعنی اس تذکرہ و موعظت کا ایک حصہ تو پہلے ہی ان کے سامنے تھا۔ فقط اتنا باقی تھا کہ انہیں یہ بتادیا جائے کہ ان اقوام کی یہ حالت کیوں ہوئی تھی؟ اور اگر تم بھی ایسا ہی کرو گے تو تمہاری بھی ویسی ہی حالت ہو جائے گی۔ سو ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے ان کے سامنے انہی اقوام و انبیائے کرام کے واقعات

لے اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم تمام نوع انسانی کے لئے قیامت تک کے لئے ضابطہ حیات ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم صرف اُس زمانہ کے مخاطبین تک ہی محدود نہ تھی۔ لیکن اس تعلیم کی عالمگیریت کے لئے ضروری تھا کہ سب سے پہلے اس قوم کو بطور خمیر کے تیار کیا جاتا جو اس کی اولین مخاطب تھی۔ پھر وہ قوم اس شمع ایزدی کو لے کر ساری دنیا میں نکلتی اور اس فور سے دنیا بھر کے اندھیروں کو مٹاتی چلی جاتی۔ اس لئے ان حقائق کو ان کی اولین مخاطب قوم کے ذہن میں راسخ کرنے کے لئے یہ انداز و اسلوب اختیار کیا گیا۔

پیش کرنے چاہئیں تھے جن سے وہ پہلے ہی واقف تھے (یا اگر بعض تفصیل سے واقف نہ تھے تو کم از کم ان کے نام سے نا آشنا نہ تھے۔ اگر قرآن ایسی اقوام یا ایسے مصلحین کرام کا ذکر کرتا جن کے نام تک سے عرب واقف نہ تھے تو وہ کہنے والے کا منہ تنکے لگتے کہ یہ کن لوگوں کی باتیں کر رہا ہے۔ مثلاً اس زمانہ کے عربوں سے یہ کہا جاتا کہ دیکھو تم نے اگر اس دعوت کی تکذیب کی تو تمہارا حال کنفیوشس کی قوم سا ہوگا۔ تو نہ صرف یہ کہ ان کا قلب اس سے کسی قسم کا اثر قبول نہ کرتا بلکہ وہ اس قسم کے سوال لے کر بیٹھ جاتے کہ یہ قوم کون تھی؟ کہاں بستی تھی؟ (جناب کنفیوشس کی کیا تعلیم تھی؟ انہوں نے اس کی کیا خلافت ورزی کی۔ اور پھر ان کا کیا انجام ہوا؟ اور اس سوال و جواب کے بعد یہ بحث چھڑ جاتی کہ ان سے جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ اصل مقصد نگاہوں سے کم ہو جاتا اور سارا وقت اس نئی بحث و جدل کی نذر ہو جاتا۔ قرآن کریم کوئی تاریخ کی کتاب تو تھا نہیں کہ اسے تمام اقوام و ملل عالم کا تذکرہ کرنا ضروری تھا۔ اس نے اس قسم کے مباحث سے بچ کر وہ سیدھی راہ اختیار کی جس کا نتیجہ بالکل بدیہی طور پر سامنے آگیا۔ آپ تاریخ کے اوراق کو اٹھا کر دیکھتے مخاطبین نے ان اقوام و ملل کے احوال و ظرف کو کہیں محل نظر قرار دے کر بحث و جدل نہیں شروع کی بلکہ انہیں مستمہ حقائق کے طور پر تسلیم کر لیا۔ اب باقی صرف اتنا کام رہ گیا کہ ان کے ذہن نشین یہ کرادیا جائے کہ اگر تم نے بھی ایسا ہی کیا تو تمہارا حشر بھی ویسا ہی ہوگا۔

یہ ہے وہ مصلحت جس کے پیش نظر قرآن کریم نے صرف ان انبیاء کرام اور ان کی اقوام کا ذکر کیا ہے جو سامی نسل سے متعلق اور عرب کے قرب و جوار میں رہنے والی تھیں۔ ورنہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اس نے اس امر کی صراحت فرمادی ہے کہ اللہ کی طرف سے ہر قوم اور ہر ملک میں رسول آتے رہے۔ باقی رہا ان پر ایمان تو اس کا مطلب آج اتنا ہی ہے کہ ہم اعتراف کریں کہ وہ اپنے اپنے وقت میں اللہ کی طرف سے سچا پیغام لے کر آئے تھے جو اپنی اصلی صورت میں محفوظ نہ رہا۔ اور ان سب کی حقیقی تعلیم آج قرآن کریم کے وقتین کے اندر محفوظ ہے جو نوع انسانی کے لئے قیامت تک کے لئے ضابطہ حیات ہے۔ اب اس کے سوا کسی اور کی اطاعت، خدا کی اطاعت نہیں کہلا سکتی۔

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمام اقوام کو مذہب کی دنیا میں

ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ مشہور مؤرخ رینان اپنی کتاب (LIFE OF JESUS) میں رقمطراز ہے۔

یہ ساری نسل ہی ہے جسے یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے نوع انسانی کا مذہب مرتب کیا۔
تاریخی حدود سے کہیں آگے دنیاوی خیانتوں اور آلودگیوں سے پاک اور صاف اپنے خیمہ میں
بیٹھان بدوی مسلمین نے نسل انسانی کے لئے مذہب کی تدوین کی۔ (ص ۲۷)
حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کی امامت واقعی ساری اقوام کے حصہ میں آئی تھی۔ ابھی یہ تاریخی انکشافات عہد
طفولیت میں ہیں۔ انہیں آگے بڑھنے دیجئے۔ پھر ساری اقوام کی پوزیشن اور بھی نکھر کر سامنے آجائے گی۔



رسول کا صحیح مقام | پھر قرآن کریم نے اس باب میں ایک اور بڑی غلط فہمی کو بھی دُور کیا ہے
جو انسانی ضلالت و غوایت کی سب سے بڑی خطرناک گھاٹی ہے۔ دنیا
کی کسی قوم کو لیجئے ان کی فرط عقیدت نے ان کے بانیان مذہب کو انسانی درجہ سے اٹھا کر مرتبہ الوہیت
تک پہنچا دیا۔ (تفصیل اس کی اس جلد میں ملے گی جس میں اللہ کے متعلق گفتگو کی گئی ہے)۔ قرآن کریم
نے رسولوں کی بشریت کو اس لئے بھی زیادہ وضاحت اور تکرار سے بیان کیا ہے تاکہ ان کی الوہیت کا
خیال دامن عقیدت سے وابستہ نہ ہونے پائے۔ اس کے علاوہ مختلف مقامات پر اس امر کی بھی تصریح
فرمادی کہ رسولوں کو اپنی ذات کے لئے بھی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ دوسروں کے
معبود بن سکیں۔

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ وَلَوْ كُنْتُ
أَعْلَمُ الْغَيْبِ لَا سْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ ۚ إِنْ أَنَا
إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ (۱۸۸/۷ نیز ۱۰/۲۹)

(اے پیغمبر! تم کہہ دو کہ میرا حال تو یہ ہے کہ خود اپنی جان کا نفع نقصان بھی اپنے قبضہ میں نہیں
رکھتا وہی ہو کر رہتا ہے جو خدا کا قانون چاہتا ہے۔ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو ضرور ایسا کرتا کہ
بہت سی منفعت، ثور لیتا اور (زندگی میں) کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا۔۔۔ الخ)

حضرات انبیائے کرام کبھی قانون خداوندی سے سرکشی نہیں برتتے تھے۔ لیکن اگر ان سے کسی وقت کچھ

ذرا سی بھول چوک ہو جاتی تو اس پر فوراً تادیب آجاتی تھی۔ مثلاً غزوہ تبوک میں جب نبی اکرمؐ نے بعض لوگوں کو عدم شرکت کی اجازت دے دی تو اس پر وحی نازل ہوئی کہ

عَفَا اللَّهُ عَنْكَ ۚ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِينَ
صَدَقُوا ۚ وَتَعْلَمَ الْكَذِبِينَ ۝ (۹/۲۳)

(اے پیغمبر! اللہ تمہیں معاف کرے۔ تم نے ایسا کیوں کیا کہ (ان کی منافقانہ غزاریوں پر) انہیں (پیچھے رہ جانے کی) رخصت دے دی؟ اس وقت تک رخصت نہ دی جوتی جب تک تم پر یہ نہ کھل جائے کہ کون سچے ہیں اور تو معلوم کر لیتا کہ کون جھوٹے ہیں؟

(اس قسم کی اور مثالیں 'معراج انسانیت' میں ملیں گی)۔ ان واقعات کے بیان کرنے سے مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ کو درجہ الوہیت نہ دے دیا جائے۔ ان کا سب سے بلند مرتبہ مقام عبدیت ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جس میں شرف و اجتناب کی تمام سرفرازیاں اور سر بلندیاں جھل جھل نظر آتی ہیں۔ یعنی قوانین خداوندی کی صحیح اطاعت کرنے والا۔ اور دوسروں سے اس کی اطاعت کرانے والا۔

رسول پر ایمان | یہ ہیں مقام رسالت کے مختلف پہلو جن پر ایمان لانا ایک مومن کے لئے ضروری ہے۔ جب تک رسولوں پر ایمان نہ لایا جائے وحی پر ایمان نہیں لایا جاسکتا۔ اور چونکہ وحی ہی وہ ذریعہ ہے جس سے خدا اور بندوں کے درمیان صحیح تعلق قائم ہوتا ہے اس لئے وحی پر ایمان درحقیقت خدا پر ایمان ہے۔ یا یوں کہئے کہ خدا پر ایمان اس کی حاکمیت کا اعتراف ہے۔ یہ حاکمیت اس ضابطہ قانون کی رُود سے قائم ہوتی ہے جو وحی آسمانی کی وساطت سے بندوں کو ملتا ہے۔ اور اس ضابطہ کو نافذ العمل کرنے والی ہستی 'رسول' کی ذات ہوتی ہے۔ ایمان بالرسول کے پہلو پر ذرا پھر غور فرمائیے۔ ایک شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فلاں بات جس کا وہ حکم دیتا ہے اس کی اپنی طرف سے نہیں خدا کی طرف سے ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے اس دعوے کا کوئی ایسا محسوس دھڑکی ثبوت اس کے پاس نہیں ہوتا جس سے ہر شخص اس کی تعلیم کو منزل من اللہ سمجھنے لگ جائے۔ نہ ہی وہ کوئی

فوق البشر ہستی ہوتی ہے۔ وہ اپنے مخاطبین میں سے اپنی جیسا ایک انسان ہوتا ہے۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ جو کچھ میں پیش کرتا ہوں تم اس پر غور و فکر کرو۔ اس سے تم سمجھ جاؤ گے کہ یہ واقعی صداقت پر مبنی ہے۔ یا اس پر عمل کر کے دیکھ لو کہ اس سے وہ نتائج مرتب ہوتے ہیں یا نہیں جن کا یہ تعلیم دعویٰ کرتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ انہیں (اس تعلیم پر عمل کرنے کے لئے تو ایک طرف) اس پر غور و فکر کے لئے تیار کرنے کے لئے بھی ایک ذہنی اور نفسیاتی آمادگی کی ضرورت ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ ان کے اندر اس قسم کی آمادگی کس طرح پیدا ہو۔ اس کا ایک ہی ذریعہ ہو سکتا تھا۔ اور وہ یہ کہ اس شخص کے متعلق یہ یقین ہو کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ غلط بیانی سے کام نہیں لیتا۔ خیانت نہیں کرتا۔ چنانچہ جب نبی اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ آپ خدا کے رسول ہیں، تو اس کے جواب میں حضورؐ نے کیا فرمایا۔ یہی کہ میں کہیں باہر سے نہیں آیا۔ میں نے اپنی عمر تمہارے اندر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں سچا ہوں یا (معاذ اللہ) جھوٹا۔ (تفصیل سابقہ عنوان میں گزر چکی ہے)۔

فَقَدْ كَيْفَ لَكُمْ عُمْرًا مِّنْ قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (۱۴/۱۱)

یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملہ سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم سمجھتے ہو جتنے نہیں۔

رسول اجر رسالت نہیں مانگتا | اور پھر بڑی چیز یہ کہ نبی اپنی تبلیغ رسالت کا کوئی معاوضہ یا اجر نہیں مانگتا۔ اس کا اجر ان کے اللہ کے ہاں ہوتا ہے۔

اس لئے کہ رسول ایک عظیم الشان انقلابی پروگرام اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اور اس کا اجر اس پروگرام کی کامیابی ہوتی ہے۔ وہ انسانوں کو باطل کی ہر قوت کے استبداد سے نجات دلانے کے لئے آتا ہے۔ اس لئے اس کا اجر باطل کی قوتوں کی شکست میں مضمر ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے نظام کے قیام کے لئے آتا ہے جس کی رو سے تمام نوع انسانی کی ربوبیت (پرورش و تربیت) ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی محنتوں کا اجر اس کی سعی و کادش کا صلہ اس نظام کا قیام ہوتا ہے۔ اگر انقلاب کا علمبردار اجر کا خواہاں ہو جائے تو وہ تن پروری ہے۔ انقلاب نہیں۔ اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

لَا أَلَا الْمُوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ کا مفہوم اپنے مقام پر آئے گا۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ
الْعَالَمِينَ ۝ (۲۶/۱۰۹)

اور (دیکھو! نوح نے بھی یہی کہا کہ) میں اس (تبلیغ احکام الہیہ) پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو صرف جہانوں کے پروردگار کے ذمہ ہے (وہی دے گا۔ اور بس!)
اس لئے جو لوگ ان کی رسالت پر ایمان لاتے ہیں وہ کچھ احسان نہیں کرتے۔ جس طرح ایک مریض کسی ایسے طبیب کی حذاقت پر اعتقاد رکھ کر جو علاج کے لئے کسی معاوضہ کا خواہاں نہ ہو، اس کے مجوزہ نسخہ کا استعمال کرتا ہے تو یہ طبیب پر احسان نہیں بلکہ خود طبیب کا اس مریض پر احسان ہوتا ہے۔

يَسْتَوُونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۖ قُلْ لَا تَمُوتُوا عَلَىٰ إِسْلَامِكُمْ ۚ بَلِ
اللَّهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَىٰكُمْ لِلْإِيمَانِ ۖ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ (۴۹/۱۰۵)
اے پیغمبر اسلام! (دیکھو، یہ لوگ تم پر احسان جتلاتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں۔ تم کہہ دو کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو، بلکہ خدا خود تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دے دی۔ بشرطیکہ تم (اپنے دعوئے) اسلام میں سچے ہو۔

اس لئے حضرات انبیاء کرام نور انسان کے لئے آیہ رحمت ہوتے ہیں۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝ (۲۱/۱۰۶)

اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے مگر اس لئے کہ تمام دنیا کے لئے باعث رحمت ہو۔

لیکن اس رحمت سے مستفیض وہی ہو سکتے ہیں جو رسول کی رسالت پر ایمان لائیں۔

وَرَحْمَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ ۖ (۹/۶۱)

اور وہ ان لوگوں کے لئے سراسر رحمت ہے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں۔

جس طرح ابرگہر بار کی درفشانی سے وہی زمین متمتع ہو سکتی ہے جو اپنے سینے کو اس رحمت کے لئے کشادہ کر لے اور اپنے اندر اس کے جذب و قبول کی صلاحیت پیدا کر لے۔ اسی طرح رسول کی رسالت (قوانین خداوندی) ابھی انہی کے لئے خوشگوار یوں اور کامرانیوں کا موجب بنتی ہے جو ان قوانین کا اتباع کریں۔ دیکھئے قرآن کریم نے اس حقیقت کبریٰ کو بارش کی مثال سے کس قدر دل آویز اور دل کش انداز میں بیان کیا۔

فرمایا ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ يُرْسِلَ الرِّيحَ مُبَشِّرَاتٍ ۖ لِيُذِيقَكُمْ مِمَّن رَزَقْتِهِ وَيُخَفِّفَ الْغُلُولَ بِأَمْرِهِ ۚ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ ۚ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ (۳۰/۴۶)

اور اس کی آیات (قدرت) میں سے (یہ بھی ایک نشانی) ہے کہ وہ ہواؤں کو باعثِ بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ اور اس لئے (بھیجتا ہے) تاکہ تمہیں اپنی رحمت کے اثرات سے متمتع ہونے کا موقع دے اور اس لئے کہ خدا کے حکم سے کشتی (پانی میں) چلے اور تاکہ تم اس کے فضل کو طلب کر سکو۔ اور اس لئے بھی کہ تم اس کا شکر کرو۔

اس سے آگے ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَجَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَأَنْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرُومُوا ۚ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (۳۰/۴۷)

اور (دیکھو!) پیغمبر اسلام! ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سے رسول ان کی اپنی قوموں کی طرف بھیجے ہیں۔ وہ ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے (مگر منکرینِ حق نے ان کا بھی انکار ہی کیا) تو ہم نے (بھی) مجرمین کو ان کی غلط روش کی سزا دی (ان کی بد عملی اور انکارِ بد کے بد نتائج مرتب کر دیئے) اور ہم نے ایمان والوں کی مدد کرنا اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔

پھر اس کے بعد بارش اور مزدہ جانفزائی کی پیامبر ہواؤں کا ذکر ہے۔

اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رِيحًا فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا لَظَلُّوا مِنْ بَعْدِ يَكْفُرُونَ ۝ (۳۰/۴۸ - ۵۱)

اور (دیکھو!) اللہ وہ ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے۔ وہ ہوائیں ان بادلوں کو (نصنایں) پھیلاتی ہیں۔ پھر خدا انہیں آسمان پر جس طرح (اور جہاں) چاہتا ہے اپنے قانونِ کائنات کے مطابق پھیلا دیتا ہے اور انہیں اس طرح قبر تو کر دیتا ہے کہ تم ان کے درمیان

میں۔ بارش کے قطرات نکلنے دیکھتے ہو۔ تو جب وہ اپنے بندوں میں سے جنہیں چاہتا ہے وہ بارش پہنچا دیتا ہے تو وہ خوش ہونے لگتے ہیں۔ اگرچہ بارش نازل ہونے سے پہلے وہ بالکل مایوس تھے۔ تو (ذرا) اللہ کی رحمت کے آثار کو دیکھو کہ وہ کس طرح (ان قطرات بارش سے) مُردہ زمین کو (دوبارہ) زندگی بخش دیتا ہے (کہ یکبارگی زمینیں سبز و زاروں سے لہلہا اٹھتی ہیں) بلاشبہ یہی (خدا تو ہے جو) مُردوں کو بھی زندہ کی بخشنے والا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اور (دیکھو) اگر ہم ان ہواؤں کو بھیجیں (جو کھیتوں کو پکانے والی ہوں) اور یہ لوگ کھیتوں کو زرد (پکا ہوا) دیکھ لیتے ہیں تو اس کے بعد یہ لوگ پھر خدا کی نافرمانیوں میں پڑ جانے ہیں (جیسے انہیں خدا سے کبھی کوئی واسطہ تھا ہی نہیں)۔

آئندہ جلدوں میں رحمتِ خداوندی کی انہی عطر بیز ہواؤں اور عنبر فشاں گھاؤں کا تذکرہ جمیل و حبّ شادابی قلب و نگاہ ہو گا۔ جس سے سعید روحوں کی کشتِ انسانیت لہلہا اٹھی۔ لیکن زمین شور و سی کی دیسی رہ گئی۔ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا۔



رسول اور نبی | قرآن کریم میں پیغامبرانِ خداوندی کے لئے رسول کا لفظ بھی آیا ہے اور نبی کا بھی۔ رسول کے معنی پیغام رساں اور نبی کے معنی ہیں وہ جو شخص جو بلند مقام پر کھڑا ہو۔ عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ رسول وہ ہے جسے اللہ کی طرف سے کتاب ملے۔ اور نبی وہ جو بغیر کتاب کے آئے۔ لیکن یہ تقسیم انسانوں کی خود ساختہ ہے۔ قرآن کریم سے اس کی سند نہیں ملتی۔ برعکس اس کے قرآن کریم سے ظاہر ہے کہ رسالت اور نبوت ایک ہی مقام کے دو نام اور ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ نبوت کے معنی ہیں خدا کی طرف سے وحی کا ملنا۔ اور رسالت کے معنی ہیں اس وحی کو دوسروں تک پہنچانا۔ ظاہر ہے کہ وحی ملتی ہی اس لئے ہے کہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچایا جائے اور اس کے مطابق انسانی معاشرہ کی تشکیل کی جائے۔ لہذا نبوت بغیر رسالت کے بے مقصد موتی ہے۔ اور نبوت

لے جوئے نور برق طور، شعلہ مستور اور معراجِ انسانیت۔

کے بغیر رسالت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ جسے خدا کی طرف سے وحی نہیں ملے گی وہ انسانوں تک پہنچائے گا کیا؟ نبوت کے ساتھ رسالت کی تصریح کر دینے سے قرآن نے ایک بہت بڑی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ نبوت کوئی ایسا انفرادی تجربہ نہیں جس کا تعلق محض اس خاص شخص کی ذات سے ہو۔ اس شخص کو حصول وحی کے لئے منتخب کیا جاتا ہے تاکہ وہ خدا کی وحی کو دوسروں تک پہنچائے۔ اس لئے اس اعتبار سے دیکھتے تو نبوت کے بعد رسول کا اصل فریضہ رسالت ہی ہوتا ہے۔ رسالت بہت بڑی ذمہ داری کا منصب ہے۔ یہیں سے وہ تمام جاں گداز اور صبر آزما مراحل شروع ہوتے ہیں جو قرآن کے الفاظ میں رسول کی مکر توڑ دیتے ہیں۔ رسول اپنے اس پیغام کو لے کر اپنے اس معاشرے میں جاتا ہے جہاں کا ذرہ ذرہ اس پیغام کی مخالفت کرتا ہے۔ اُسے اس معاشرے میں وہ انقلاب پیدا کرنا ہوتا ہے جو اس کی وحی کی فایت ہوتا ہے۔ لہذا نبوت کے معنی میں خدا کی طرف سے ضابطہ حیات کا ملنا اور رسالت کے معنی میں اس ضابطہ حیات کے مطابق انقلاب پیدا کرنا۔ اس لئے قرآن نے ان حضرات کو کہیں انبیاء کہا ہے اور کہیں رسول کہہ کر پکارا ہے۔ مثلاً سورۃ النعام کے دسویں رکوع میں حضرت ابراہیمؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ عیسیٰؑ، الیاسؑ، اسمعیلؑ، یسعؑ، یونسؑ، لوطؑ (علیہم السلام) کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ۙ ۹۵/۶

نیز ۲۹/۲۶؛ ۱۴/۲۵؛ ۲۴/۵۷۔

یہ وہ انبیاء ہیں جنہیں ہم نے کتاب، حکومت اور نبوت عطا فرمائی ہے۔ اگر یہ لوگ (تہاے مخالفین) ان باتوں کے ساتھ کفر اور نافرمانی کا برتاؤ کرتے ہیں (تو کرنے دو) ہم نے ایک ایسی قوم کو ان باتوں کو سونپ دیا ہے جو ان کے ساتھ کفر اور نافرمانی کرنے والے نہیں ہیں۔

ان حضرات میں سے کئی ایسے ہیں جن کی کتاب کا ذکر قرآن کریم میں جداگانہ طور پر نہیں کیا گیا لیکن قرآن کریم کا واضح ارشاد موجود ہے کہ انہیں کتاب بھی دی گئی اور نبوت بھی۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ حضرات انبیاء کرام میں کسی جگہ انہیں رسول کہا گیا ہے کسی جگہ نبی۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق خود قرآن کریم میں ہے کہ انہیں اور حضرت موسیٰؑ کو صحف عطا کئے گئے۔

صُفِّ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوسٰى ۝ (۱۹/۸۷)

(یہ تمام باتیں) ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں بھی موجود ہیں۔

بائیں ہمہ حضرت ابراہیم کو نبی کہا گیا۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا ۝ (۱۹/۸۱)
اور (اے پیغمبر اسلام!) کتاب (یعنی قرآن) میں ابراہیم کا ذکر کرو، بلاشبہ وہ بہت
سچے انسان اور نبی تھے۔

حضرت عیسیٰ کو انجیل عطا ہوئی، لیکن آپ نے خود فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا ہے۔
قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ قَدْ اٰتٰنِی الْكِتٰبِ وَ جَعَلٰنِی نَبِيًّا ۝ (۱۹/۳۰)
اور (دیکھو) عیسیٰ نے کہا کہ میں تو اللہ کا بندہ ہوں، (کہ مقام عبدیت ہی سب سے بڑا مقام
ہے، میرے خدا نے) مجھے کتاب (انجیل) دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے کہ حضرت عیسیٰ رسول تھے۔

وَ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِیْسٰی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۝ (۱۵/۲۶)
اور ان (یہودیوں) کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم اللہ کے رسول کو
قتل کر دیا۔

ان کے برعکس حضرت اسمعیل (جن کی کتاب کا جہاگاہ ذکر نہیں ہے) کے متعلق فرمایا کہ رسول و نبی تھے۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ
كَانَ رَسُوْلًا نَبِيًّا ۝ (۱۹/۵۴)

اور (اے پیغمبر اسلام!) کتاب (یعنی قرآن) میں اسمعیل کا ذکر کرو، بلاشبہ وہ ایک پیکرِ غلوں
اور رسول و نبی تھے۔

سورۃ انعام کی آیت ۹۰ میں ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں کہ حضرت مرسلین علیہم السلام کے تذکرہ کے
ضمن میں فرمایا کہ انہیں کتاب و نبوت عطا کی گئی تھی، سورۃ ناز کے تیسویں رکوع میں ارشاد
ہے کہ

اِنَّا اَوْحٰیْنَا اِلَیْكَ کَمَا اَوْحٰیْنَا اِلٰی نُوحٍ وَ النَّبِیِّیْنَ مِنْ

بَعْدَ ۚ..... لَعَلَّآ يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ التَّسْلِيلِ
وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ (۱۶۳ - ۱۶۵/۴)

(اور اے پیغمبر اسلام! دیکھو) بلاشبہ ہم نے تمہاری طرف بالکل اسی طرح وحی کی ہے
جیسے ہم نے نوح کی طرف اور نوح کے بعد دوسرے انبیاء کی طرف وحی کی تھی۔ اور جس
طرح ہم نے ابراہیم، اسمعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس،
ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی تھی اور (اے پیغمبر! ہم نے تمہیں بالکل اسی طرح کتاب
قرآن عطا کی ہے جس طرح ہم نے داؤد کو زبور عطا کی تھی۔

اور (کچھ انہی حضرات انبیاء کرامؑ پر منحصر نہیں ہے) اور بھی بہت سے رسول ہیں جن
کے (کچھ) واقعات ہم نے اس سے پہلے تم سے بیان کر دیئے ہیں اور بہت سے رسول ہیں
جن کے واقعات ہم نے تم سے بیان نہیں کئے۔ (جس طرح ہم نے ان پر وحی کی تھی اور کتاب
دی تھی، بالکل اسی طرح ہم نے تم پر بھی وحی کی ہے اور کتاب (قرآن عطا کی ہے۔) نوعیت
وحی اور عطا کتاب میں کوئی فرق اور امتیاز روا نہیں رکھا گیا۔ اور خدا نے موسیٰ سے اچھی
طرح کلام فرمایا تھا (یہ (سب کے سب) خدا کے رسول تھے جو (نتائج اعمال کی) بشارت
دینے والے اور (انکار و بد عملی کے بُرے نتائج سے ڈرانے والے تھے تاکہ رسولوں کے
آجانے کے بعد لوگوں کی خدا پر کوئی (صحیح اور قابل پذیرائی) حجت باقی نہ رہے۔ اور تم جانتے
ہو کہ) خدا بڑے غلبہ اور حکمت والا ہے۔

یہاں ان حضرات کو رسول کہا گیا ہے۔ قرآن کریم کی رُود سے حضرات انبیاء کرامؑ پر ایمان ضروری ہے (ایمان
کے پانچ اجزاء میں سے یہ ایک جزو ہے)۔ سورۃ بقرہ کے مائیسویں رکوع میں ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَ
الْمَغْرِبِ..... وَالتَّيْبَتِ (۲/۷۷)

یہ کوئی بھلائی کی بات نہیں ہے کہ تم (نمازوں میں) اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف
پھیر لو البتہ بھلائی اور نیکی اس شخص کی بھلائی اور نیکی ہے جو اللہ پر قیامت (اور حشر و نشر)
کے دن پر فرشتوں پر کتابوں پر اور انبیاء پر ایمان لائے۔

اور اسی سورت کے چالیسویں رکوع میں ہے۔

أَمِنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ
أَمِنَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَكُتِبَ لَهُمْ أَنْ يَرْتَدُّوا عَلَى أَعْقَابِهِمْ
مَنْ رُسُلَهُمْ قَدْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ
الْمَصِيرُ (۲/۲۸۵) نیز (۳/۸۴)

اللہ کا رسول اس (کلام) پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر نازل
ہوا ہے اور جو لوگ (و عوہ) حق پر ایمان لائے ہیں وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں یہ سب
اللہ پر اس کے ملائکہ پر اس کی کتابوں پر اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں (ان کے
ایمان کا دستور العمل یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں) ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کو دوسرے سے
جدا نہیں کرتے اور (یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں داعی حق لے پکارا تو) انہوں نے کہا خدایا
ہم نے تیرا حکم سنا اور ہم نے تیرے آگے اطاعت کا سر جھکا دیا۔ تیری حفاظت ہمیں نصیب ہو۔
اے پروردگار! ہمیں تیرے قانون کی طرف ہی لوٹنا ہے۔

یعنی ایک جگہ نَبِیِّنَ اور دوسری جگہ رُسُلَ اسی طرح جہاں یہ فرمایا ہے کہ بعض رسولوں کو
بعض پر فضیلت دی گئی ہے وہاں ایک مقام پر انہیں رُسُلَ کہا گیا ہے اور دوسرے مقام پر انبیاء
سورہ بقرہ میں ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ (۲/۸۴)

یہ ہمارے رسول ہیں جن میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی ہے۔

اور سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَى بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُدَ
زَبُورًا (۱۷/۵۵)

اور بلاشبہ ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اور داؤد کو ہم نے (اپنی

کتاب) زبور عطا فرمائی۔

خود نبی اکرم کو کہیں رسول کے لقب سے مخاطب کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ... (۵/۴۷)
اے رسول! ان احکام کو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کئے گئے ہیں (لوگوں تک پہنچا دو!)

اور کہیں نبی کے لقب سے مثلاً
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ إِنْ
اللَّهُ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ (۳۳/۱)
اے نبی! اللہ کا تقوے اختیار کرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو بلاشبہ خدا (سب کچھ) جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اور کہیں رسول و نبی دونوں جامع القاب سے۔
الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأَوْفَىٰ (۴/۱۵۸ یز ۴/۱۵۸)
(اور دیکھو!) جو لوگ پیغمبر (اسلام) نبی اُمّی کا اتباع کرتے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے رسول اور نبی ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں۔ صاحب کتاب اور غیر صاحب کتاب کا فرق ذہن انسانی کا پیدا کردہ ہے۔ نبی یا رسول بغیر کتاب کے آہی نہیں سکتا۔ (پیغام رساں کے پاس اگر کوئی پیغام ہی نہیں تو وہ آئے گا کیا کر کے لئے رسول کے پیغام کو اس کی کتاب کہتے ہیں)۔ اس لئے قرآن کریم لے بالکل واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا کہ ہر ایک رسول کے ساتھ کتاب نازل کی گئی۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ... (۵۴/۲۵)

اور بلاشبہ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان سب کے ساتھ کتاب (ضابطہ قوانین) نازل کی۔

اور اسی طرح ہر ایک نبی کے ساتھ کتاب نازل کی گئی۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ
وَمُنْذِرِينَ ۖ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُحْكُمَ بَيْنَ

النَّاسِ فِيهَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (۲/۲۱۳)

چونکہ نوع انسانی کو ایک امت کی حیثیت سے (مدنی) زندگی بسر کرنا تھا اس لئے خدا نے انبیاء کو بھیجا جو اعمال کے نتائج کی بشارت دینے والے اور انکار و بد عملی کے بدنتائج سے ڈرانے والے تھے۔ اور ان سب کے ساتھ سچائی کے ساتھ کتاب (ضابطہ قوانین) نازل کی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان مسائل میں جن میں وہ اختلاف کر رہے تھے (خدا کے قانون اور اس کی مرضی کے مطابق) فیصلہ کر سکیں۔

مَعَهُم (ان سب کے ساتھ) قابل غور ہے۔ کوئی رسول اور کوئی نبی بغیر کتاب کے نہیں آیا۔ لہذا نبی یا رسول بلا کتاب کا تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔ اور شریعی و غیر شریعی کی تفریق اس حقیقت سے بیگانگی کی دلیل جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہر رسول (یا نبی) پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی تھی۔ وہ وحی اس کی کتاب تھی۔ اور وہی کتاب اس کی شریعت کا ضابطہ۔ کوئی نبی اور رسول بغیر کتاب کے نہیں آ سکتا۔ اور چونکہ قرآن کریم کے اندر دین مکمل ہو چکا ہے اور وہ دنیا میں اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ اس لئے اب کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں۔ اور چونکہ کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں اس لئے اب کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ یہ مفہوم ہے خَاتَمُ النَّبِيِّينَ کا جس کی تفصیل "ختم نبوت" کے عنوان میں (معراج انسانیت) میں ملے گی۔ نبوت کا سلسلہ نبی اکرم کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اب کسی کو وحی نہیں مل سکتی۔ وحی کے ذریعے خدا نے جو کچھ دینا تھا وہ سب قرآن کے اندر آچکا۔ اور قرآن کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ اس کی

لے جس طرح قرآن کریم میں بعض رسولوں کا ذکر ہے اور بعض کا نہیں۔ اسی طرح ان میں سے بعض کی کتابوں کا ذکر ہے اور بعض کا نہیں۔ لیکن کتاب ہر رسول کے ساتھ ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ حضرت ہارون (جنہیں حضرت موسیٰ کا وزیر کہا گیا ہے ۲۵/۲۵) ان کے متعلق فرمایا کہ

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ وَ هَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَذِكْرًا لِّلْمُتَّقِينَ (۲۱/۲۸)

اور (دیکھو) بلاشبہ ہم نے موسیٰ اور ہارون کو (حق و باطل میں) تمیز کرنے والی کتاب اور (سچائی کی)

روشنی اور متقی لوگوں کے لئے نصیحت کی چیز عطا فرمائی۔

حضرت ہارون کی رسالت کے متعلق حضرت موسیٰ کے عنوان کے ماتحت ذکر کئے گئے۔

حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔ باقی رہا اس کتاب کے ذریعے ایسا معاشرہ متشکل کرنا جو وحی کا مقصود ہے سو اس کی ذمہ داری اس اُمت کو سونپ دی گئی جسے اس کتاب کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ ان دونوں کا نام ہے نظام خداوندی یعنی وہ نظام جسے اُمت محمدیہ قرآن کی رُو سے قائم کرے۔ اس نظام کی موجودگی میں دنیا کو نہ کسی نبی کی ضرورت ہوگی اور نہ رسول کی۔ وَذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ۔



اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ حضرات انبیاء کرام کا یہ سلسلہ کہاں سے شروع ہوا اور کن کن مراحل سے گزرتا ہوا کہاں تک پہنچا۔ اس کا تعلق تاریخ رسالت سے ہے جو معارف القرآن کی جلدوں میں تکمیل پذیر ہوگی۔ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ۔



خلاصہ بحث

اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی سے وعدہ کیا تھا کہ ان کی راہ نمائی کے لئے اس کی طرف سے ہدایت ملے گی۔ یہ ہدایت آسمانی حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے ملتی رہی۔ ان کے ذمہ انسانوں تک خدا کا پیغام پہنچانا تھا۔ یہ تمام رسول انسان تھے۔ مافوق البشر مستیاں نہ تھے۔ ان رسولوں کے ذمہ صرف پیغام ربانی کا فریضہ ہی نہ تھا۔ بلکہ اس پیغام کو عملی طور پر متشکل بھی کرنا تھا۔ اور اس طرح سے ثابت کرنا تھا کہ وہ نظام جس کی طرف وہ دعوت دیتے ہیں ناممکن العمل نہیں۔ رسول سب سے پہلے خود اس وحی کا اتباع کرتا تھا جو اسے خدا کی طرف سے ملتی تھی۔ اس اتباع وحی سے وہ ایک نظام قائم کرتا تھا جس کی بنیاد اللہ کی حاکمیت کے اقرار پر ہوتی تھی۔ وہ خود اس نظام کا اولیٰ مرکز ہوتا تھا۔ لہذا اس نظام کی اطاعت کے لئے ضروری تھا کہ اس مرکز کی اطاعت کی جاتی۔ اس لئے خدا کی اطاعت بذریعہ رسول کی اطاعت کے ہونی لازمی تھی۔ لیکن رسول کی اطاعت اس کی ذات کی اطاعت نہ تھی۔ یہ دراصل خدا ہی کی اطاعت تھی کہ رسول خود خدا کی کتاب کی اطاعت کرتا تھا۔ رسول ایک طبیبِ مشفق کی طرح ہمیشہ اس غمخواری

میں گھلتا رہتا تھا کہ لوگ تباہی و بربادی کے جہنم سے بچ جائیں۔ لیکن اس کے ذمہ پیغامِ رسانی کا فریضہ تھا۔ ہدایت کو دلوں کے اندر اتار دینا اس کے بس میں نہ تھا۔

پھر ایک اور حقیقت کی طرف آیتے۔ آج عام طور پر دو قسم کے لوگ ملیں گے۔ ایک وہ جو کہتے ہیں کہ ان کا مذہب تو سچا ہے، لیکن باقی سب بائیانِ مذاہب (معاذ اللہ) جھوٹے تھے۔ دوسرا گروہ افراط کی طرف جا کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ نہیں، دنیا کے تمام مذاہب بالکل سچے اور یکساں ہیں۔ یہ دونوں مسلک غلط اور قرآن کی رو سے باطل ہیں۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر قوم کی طرف اپنے رسول بھیجے جن کی تعلیم اصولی اور بنیادی طور پر ایک تھی لیکن کچھ عرصہ کے بعد وہ تعلیم اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہی تھی۔ اس لئے اللہ کا ایک اور رسول آجاتا تھا۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا۔ تا آنکہ بالآخر یہ تمام صداقتیں ایک جگہ جمع کر کے قرآن کے اندر محفوظ کر کے رکھ دی گئیں۔ اب دنیا میں خدا کی سچی تعلیم صرف قرآنِ کریم کے اندر ہے اور کہیں نہیں۔ اس لئے قرآن کی اطاعت ہی خدا کی اطاعت ہے۔

۲۔ رسول اور نبی ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں ان میں کوئی فرق نہیں تھا۔



نگہ بازگشت

گذشتہ ادراک میں جو مباحث آپ کی نظروں سے گزرے ہیں وہ متعدد عنوانات پر مشتمل تھے اور ان میں قرآنی تعلیم کے بہت سے بنیادی گوشے آپکے ہیں۔ چونکہ یہ بنیادی اصول اس کے بعد بھی بار بار سامنے آئیں گے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سب پر ایک تیرتی ہوئی نگہ بازگشت ڈال لی جائے تاکہ ان سب کی یاد تازہ ہو جائے۔ اور آگے بڑھنے سے پیشتر ان قطع کردہ منازل کے مناظر ایک ہی جگہ سمٹ کر سامنے آجائیں؟

نظریہ ارتقاء | دورِ حاضرہ کے علمِ طبیعیات کا معرکہ آراء کارنامہ تخلیق انسانی کے متعلق نظریہ ارتقاء ہے۔ اس نظریہ کا ماحصل یہ ہے کہ انسان جس شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے، از ابتدا اسی شکل میں وجود میں نہیں آگیا تھا بلکہ اولیں جرثومہ حیات ارتقائی مراحل طے کرتے اور مختلف مراحل میں سے گزرتے گزرتے اس مقام تک پہنچا ہے۔ قرآن کریم سے بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن اس تائید و توافق کے باوجود اس باب میں قرآنی تعلیم اور مغرب کے مادہ پرست علمائے طبیعیات کے نظریہ میں ایسا بنیادی فرق ہے جس کے پیش نظر ان دونوں کو کبھی ہم آہنگ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ہم آہنگی تو ایک طرف ان دونوں کی رُو سے حیات اور کائنات کے متعلق جو مختلف تصورات قائم ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کائنات کے متعلق میکالکی تصور انیسویں صدی کے مادہ پرست (MATERIALIST) علمائے طبیعیات کی تخلیق ہے جو یورپ میں نظریہ ارتقاء کے اولین علمبردار ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی، غیر نامی (INORGANIC) مادہ میں بعض کیمیائی اور طبیعیاتی تبدیلیوں سے خود بخود (محض اتفاقی طور پر) پیدا ہو گئی اور اس طرح کاروانِ حیات نے (میکالکی طور پر) حیوانی پیکر

کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے بعد حیوانی دماغ میں بعض اسی قسم کی تبدیلیوں سے شعور (CONSCIOUSNESS) پیدا ہو گیا۔ اور یوں خاک کے ذرے جیتے جاگتے باشعور انسان کی صورت میں متشکل ہو گئے۔ اس کے بعد جب یہ میکانیکی ارتباط (MECHNAICAL COMBINATION) منتشر (DISINTEGRATE) ہو جائے گا تو زندگی اور شعور سب ختم ہو جائیں گے۔ لہذا زندگی بھی طبعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے اور اسی کا تحفظ و استحکام انسان کا نصب العین حیات ہے اس کے برعکس قرآن کریم کی رُوسے نہ زندگی بے جان مادہ میں کیمیائی اور طبیعیاتی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے اور نہ ہی انسانی شعور حیوانی دماغ کے میکانیکی ارتقاء کی اگلی منزل۔ زندگی اور شعور کا سرچشمہ وہ خدائے حق و قیوم اور حکیم و بصیر ہے جو اپنی حکمت بالغہ کے ماتحت اس کائنات کو وجود میں لایا اور اس کے بعد بایں شان ربوبیت اسے اس کے منتہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ جن امور کا محققین مغرب نے انکشاف کیا ہے وہ درحقیقت وہ قوانین ہیں جن کے مطابق خالق کائنات اس تمام کارگرہ ہستی کو چلا رہا ہے اور جن کے مطابق ایک جرثومہ حیات مختلف ارتقائی مراحل طے کر کے پیکر انسانی تک پہنچا ہے۔ لیکن انہی قوانین خداوندی کی رُوسے انسان کی موجودہ زندگی ارتقاء کے اس سلسلہ دراز کی آخری کڑی نہیں بلکہ یہ گویا تہید ہے کتاب حیات کی جلد دوم کی۔ انسانی تخلیق کی ابتدائی کڑیاں تو اسی سلسلہ کی مظاہر ہیں جس کی رد سے دوسرے حیوانات کی پیدائش ہوتی ہے لیکن اس کے بعد انسانی تخلیق ایک یکسر نئے دائرے میں داخل ہوتی ہے جو پچھلی کڑیوں کا طبعی نتیجہ نہیں۔ اس مقام پر اس میں روح خداوندی (DIVINE ENERGY) کا شمع ڈالا جاتا ہے اور اس طرح اسے صاحب شعور و بصیرت اور اختیار و ارادہ کا مالک انسان بنا دیا جاتا ہے۔ یہی وہ روح خداوندی ہے جس سے انسان اپنی مستقل انفرادی حیثیت رکھتا ہے اسی کو انسانی ذات، نفس، خودی، انا یا ایغو کہا جاتا ہے۔ انسانی تک و تاز کا حاصل اسی نفس (یا ذات) کی نشوونما اور تکمیل ہے۔ یہ انسانی خودی اپنی مناسب نشوونما (ربوبیت یا بالیدگی) سے ایسی مستحکم ہو جاتی ہے کہ موت بھی اسے فنا نہیں کر سکتی۔ اس طرح انسانی نفس حیات جاوید کا مستحق ہو جاتا ہے۔

مغرب کی غلط نگہی | مغربی مادہ پرستوں کے میکانیکی ارتقاء کے نظریہ کی بنیادیں اس قدر کمزور تھیں کہ انیسویں صدی کے اخیر میں خود مغرب ہی سے اس

کی تردید و مخالفت میں آوازیں اٹھنی شروع ہو گئیں۔ چنانچہ گلاسکو یونیورسٹی کا پرنسپل اور وائس چانسلر جون کیئرڈ (JOHN CARID) اپنے (۷۹ - ۱۸۷۸ء کے) لیکچرز (خطبات) میں کہتا ہے:-
 آج تک اس امر کی کوئی ایک مثال بھی نہیں پیش کی جاسکی کہ زندگی محض کیمیائی تھا
 (CHEMICAL CONSTITUENTS) سے پیدا ہو گئی ہو۔ لہذا یہ قیاس

کہ زندگی کا ارتقاء کسی اور زندگی کے اثر کے بغیر بھی ممکن ہے، بلا دلیل ہے (PROTOPLASM)
 کو جسے مادہ حیات قرار دیا جاتا ہے محض کیمیائی مرکبات کی سطح پر نہیں رکھا جاسکتا۔ وہ مادہ
 حیات جس کا تجربہ کیا جاسکتا ہے اور جس کے کیمیائی اجزاء معلوم ہو سکتے ہیں زندہ نہیں
 بلکہ مردہ مادہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس وہ مادہ حیات جسے زندہ کہا جاسکتا ہے اگرچہ انہی
 اجزاء کا مجموعہ ہوتا ہے جو مردہ مادہ حیات میں پائے جاتے ہیں لیکن اس سے ایسے خواص
 و اعمال کا مظاہرہ ہوتا ہے جو بالکل جدید ہوتے ہیں اور جنہیں اس کے کیمیائی اور طبیعیاتی
 اجزاء کی طرف کبھی منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی شے کسی ایک وقت میں ایسے خواص کا
 مظاہرہ کرتی ہے جو یکسر کیمیائی یا میکانیکی ہوں اور دوسرے وقت میں ایسے خواص کا جن سے
 وہ اپنے آپ کو ایک جیتے جاگتے، بڑھنے پھولنے والے جسم میں تبدیل کر لے یا ایسے افعال کا
 جن سے وہ دوسری چیزوں کو اپنا جزو بدن بنا سکے اور پھر اپنے جسم سے کچھ اور پیدا
 کر سکے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دوسری صورت میں جو نئی چیزیں اس میں پیدا
 ہوئی ہیں ان کا سبب کوئی ایسا جدید عنصر ہے جو پہلی صورت میں اس میں موجود نہ تھا
 جبکہ اس سے محض کیمیائی یا میکانیکی عمل ظہور میں آتا تھا۔

(INTERODUCTION TO THE PHILOSOPHY OF RELIGION; P-96)

یہ ”جدید عنصر“ زندگی ہے جو مادہ کی پیداوار نہیں۔ رفتہ رفتہ وہاں کے علمائے طبیعیات میں ایک
 ایسا گردہ پیدا ہو گیا جس نے یہ دیکھا کہ سلسلہ ارتقاء میں جو نئی چیز پیدا ہوتی ہے اس کے خواص
 ان عناصر کے خواص سے مختلف ہوتے ہیں جن کے امتزاج سے وہ نئی چیز پیدا ہوتی ہے۔ اس سے وہ
 اس نتیجہ پر پہنچے کہ بے جان مادہ میں جب زندگی پیدا ہوتی ہے تو وہ مادہ کے میکانیکی ارتقاء کا نتیجہ نہیں۔

زندگی کیسے وجود میں آجاتی ہے؟ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس لئے اس کا نام انہوں نے ہنگامی ارتقار (EMERGENT EVOLUTON) رکھ دیا۔ اسی قسم کے ہنگامی ارتقار سے (ان کے نزدیک) شعور انسانی پیدا ہو گیا۔ ان میں اور پہلی قسم کے مادہ پرستوں میں البتہ اتنا فرق ہے کہ ان کے نزدیک شعور (اسی طرح وجود میں آکر) اپنی جداگانہ ہستی رکھتا ہے اور کیمیا اور طبیعیات (CHEMISTRY AND PHYSICS) کے ان قوانین سے جن کے تابع جسم انسانی ہوتا ہے، الگ قوانین کے ماتحت ہوتا ہے۔

لیکن یہ نظریہ بھی چونکہ اطمینان بخش نہ تھا اور اس پر مختلف قسم کے اعتراضات وارد ہوتے تھے اس لئے مغربی فکر اور آگے بڑھا اور اس نے تخلیقی ارتقار (CREATIVE EVOLUTION) کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظریہ کے علمبردار جزئیات و تفصیل میں باہم مدگر متفق نہیں لیکن (جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے) اس کا ماحصل یہ ہے کہ زندگی کی لہر مادہ کے ساتھ شروع سے ہی موجود ہے لیکن خوابیدہ کائنات تغیرات کی آماجگاہ ہے اس مسلسل تغیر سے زندگی میں بیداری پیدا ہوتی ہے اور جب زندگی مناسب جسم سے متمسک ہوتی ہے تو اس سے ہنگامی طور پر شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ شعور پیدا تو اس طرح ہوتا ہے لیکن اس کے بعد زندگی اور جسم دونوں سے الگ اپنا مستقل وجود رکھتا ہے۔ مغربی محققین کی اب کثیر جماعت ایسی ہے جو میکائی ارتقار کے نظریہ کو ٹھکر کر، نفس انسانی (MIND) کے جداگانہ وجود کی قائل ہے۔ (ان کا تفصیلی ذکر وحقی کے عنوان میں ہو چکا ہے)۔

لے انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ بعض اوقات ارتقار کے ایک ہی سلسلہ میں ایسی چیزیں ظہور میں آجاتی ہیں جو باقی چیزوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ ایسی چیزوں کو (MUTATION SPORTS) کہتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے یہ توجیہ بیان کی کہ ارتقار کا سلسلہ بعض اوقات جست لگا کر علت و معلول کی بہت سی کڑیوں کو پھاند جاتا ہے جس سے ایسی ایسی چیزیں ظہور میں آجاتی ہیں جن سے کوئی سائنٹفک توجیہ سمجھ میں نہیں آتی۔

لے ہیکلے کے نزدیک "شعور بھی اسی طرح مادہ کے ایک عمل کا نام ہے جس طرح حرکت" لیکن TYNDALL لکھتا ہے کہ "یہ چیز تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ دماغ کی طبیعی ہیئت شعور پیدا کر سکتی ہے۔"

پروفیسر ایگنرڈر کے نزدیک شعور بھی زندگی کے اندر خوابیدہ ہوتا ہے اور زندگی کے تخلیقی ارتقار سے پیدا ہو جاتا ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ مغرب کی مادہ پرستی (MATERIALISM) خود وہیں کے محققین کے ہاتھوں کس طرح رفتہ رفتہ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے۔ لیکن چونکہ ان لوگوں کے سامنے وحی کی (بے رنگ و بے لوث) روشنی نہیں اس لئے وہ ظن و تخمین کی دادیوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ حقیقت تک ان کی رسائی نہیں۔

مغربی مفکرین انیسویں صدی کے کائنات کے میکانیکی تصور کو چھوڑ کر بہت آگے نکل چکے ہیں لیکن اس قوم کی اور اس کے ساتھ ساری دنیا کی بدبختی کہ ان کی جو تہذیب اس میکانیکی تصور کی بنیادوں پر اٹھی تھی وہ بدستور اپنی بنیادوں پر قائم رہی۔ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ چونکہ یہ بنیاد ہی غلط تھی اس لئے اس پر اٹھی ہوئی عمارت بھی بے حد نازک اور کمزور تھی۔

باطل بنیادوں پر تہذیب چنانچہ جب زندگی کے ٹھوس حقائق کا سامنا ہوا تو وہ پہلے ہی دھچکے میں متزلزل ہو گئی اور اس کا نتیجہ آج اہل مغرب اور ان کے ساتھ اس ساری دنیا کے سامنے ہے جو اس تہذیب کے اثرات سے ملوث ہو چکی ہے۔ اس قسم کی تہذیب کبھی حقائق کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

”تاریخ تہذیب“ کا مشہور عالم (BRIFFAULT) اپنی کتاب (THE MARKING OF HUMANITY) میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہ روم کی عظیم ایشان سلطنت اور اس قدر درخشاں تہذیب کیوں تباہ ہو گئی، لکھتا ہے۔

انسانی حیثیت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کیسے ہی تدریجاً اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری خارجی نظم و ضبط اور ادھر ادھر کی بحرانی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدّر ہے۔ روم کی سلطنت عام انسانوں کی لوث کھسوٹ سے ایک خاص جماعت کو متمول بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے اس ”سوداگری“ کو نہایت قابلیت اور تدبیر، خلوص اور دیانتداری سے چلایا۔ لیکن (حسن انتظام کی) یہ تمام خوبیاں بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا دروغایت نتیجہ خیز ہو کر رہے۔

(صفحہ ۱۵۹)

بقول علامہ اقبالؒ

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بناسر یہ داری ہے



اب ایک اور گوشے کو سامنے لائیے۔ غیر ذمی حیات چیزوں کو اپنی ہستی کا احساس نہیں ہوتا اسی لئے انہیں اس کی حفاظت کی فکر نہیں ستاتی۔ اور جب کسی شے کو اپنی حفاظت کی فکر نہ ہو تو پھر ان قوتوں سے جو اسے فنا کرنے پر آمادہ ہوں کسی قسم کی مزاحمت نہیں ہوتی۔ لہذا غیر ذمی حیات (یا غیر ذمی چیزوں) کا کسی قسم کے تزام و تصادم سے واسطہ نہیں پڑتا۔ وہ لذت کشکش سے نا آشنا ہوتی ہیں۔ لیکن اس کشمکش کے مدارج کے برعکس، ذی حیات (یا نامی اشیاء) میں اپنی ہستی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ دنیا میں اپنی خاطر زندہ رہنا چاہتی ہیں۔ انہیں اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ہر مخالف قوت کا مقابلہ کرتی ہیں۔ لیکن (زندگی کے ابتدائی مراحل میں) حفاظت غریب کا یہ تقاضا ان کے اندر جبلی طور پر (BY INSTINCT) ہوتا ہے۔ یعنی وہ اپنی زندگی کو محفوظ رکھنے کے لئے جدوجہد ضروری کرتی ہیں لیکن انہیں کچھ علم نہیں ہوتا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کے سامنے زندگی کا مقصد اپنی حیات طبعی کی حفاظت ہوتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔ بنا بریں ان کی یہ تمام جدوجہد اور کشمکش صرف خارجی قوتوں سے ہوتی ہے۔ ان کی داخلی دنیا میں کوئی کشمکش نہیں ہوتی۔ حیوانات تک کی دنیا میں اسی قسم کی کشمکش ہوتی ہے۔

لیکن اس سے آگے جب انسان کی دنیا میں قدم رکھئے تو یہاں دو قسم کی کشمکشیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو وہی کشمکش جو حیوانی زندگی میں موجود تھی (اور جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے) یعنی اپنی طبعی زندگی کی حفاظت کے لئے خارجی قوتوں سے تزام و تصادم۔ اور دوسرے خود اپنی داخلی دنیا میں ایک گہری کشمکش۔ اس داخلی دنیا میں انسان کی جنگ خود اپنی ذات کے خلاف ہوتی ہے جہاں اصول کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے اور مصلحتوں کا تقاضا کچھ اور۔ یہ جنگ ان دو دشمنوں میں ٹھنکتی ہے جو نہ کبھی ایک دوسرے سے صلح کر سکتے ہیں اور نہ ہی الگ ہو سکتے ہیں۔

انسانی زندگی جب اپنے ابتدائی مراحل میں تھی اور اس کے تقاضے مہنوز طبعی حوائج سے آگے نہیں بڑھے تھے تو اس منزل کو آدم کی ابتدائی زندگی سمجھئے۔ اس منزل میں انسانوں کی ضروریات بہت

مختصر اور سامان نشوونما با افراط تھا اس لئے ان میں باہمی مفاد کا تضاد پیدا نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت ابھی انسان ”انفرادی ملکیت“ کے تصور سے نا آشنا تھا۔ کیونکہ اُسے حفاظتِ خویش کے لئے رزق کو جمع کر کے رکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن جب انسان شعور و ادراک کی نشوونما کے بعد کچھ آگے بڑھا تو عقل نے اسے یہ سکھایا کہ حصولِ رزق کے لئے مسلسل جدوجہد کی بجائے یہ بہتر ہے کہ تھوڑے سے وقت میں مختلف جیلوں سے بہت کچھ اکٹھا کر لیا جائے اور اس طرح رزق کی طرف سے اطمینان حاصل کر لیا جائے۔ اس سے مختلف افراد کی عقلوں میں باہمی جنگ شروع ہوئی اور اس جنگ کا نتیجہ باہمی کشمکش ہو گیا۔ انسانیت کے مفادِ کلی کا تقاضا یہ تھا کہ رزق کے سرچشمے تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہیں لیکن انفرادی عقل کا مطالبہ یہ تھا کہ رزق کے سرچشمے زیادہ سے زیادہ اس فرد کی ملکیت میں آجائیں تاکہ وہ اس کے اور اس کی اولاد کے کام آئیں۔ اس سے دوسری کشمکش شروع ہو گئی۔ ایک انسان اور اس کے خارجی ماحول کی۔ اور دوسری انسان کے اپنے اندر کی۔ اسی کا نام ”آدم اور الیس کی آمیزش“ ہے۔ اور انسان کی ساری داستان اسی آمیزش کی کہانی ہے۔

انسان نے اس کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کی ہے۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے وہ منظم کوشش آتی ہے جو دنیا میں ”فلاطونی حکمت“ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ وہ فلاطونی تصویر حیات ہے جسے فلاطینس (PLOTINUS) نے پروان چڑھایا۔ اس حکمت نے (جو مختلف اوقات میں رہبانیت، ویدانت، غنچی تصوف وغیرہ کے نظر فریب نقاب اور ڈھکے سامنے آتی رہی) اس کشمکش کا علاج آرزوؤں اور تقاضوں کے فنا و استہلاک میں سمجھا۔ گویا اس قسم کی ترکِ آرزو کی زندگی کا لازمی نتیجہ ”انفرادی نجات“ کا تصور تھا۔ یہ تصور نوعِ انسانی کی اجتماعی علاج و بہبود کے لئے کس درجہ ستم قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ اس کے متعلق تفصیل سے اس کے اصلی مقام پر لکھا جائے گا۔ اس وقت ہم (BRIFEAULT) کے ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

اخلاقیات کے متعلق یونان کے ابتدائی تصور کاروائی اور ابقوریت کے فلسفہ میں تبدیل ہو جانا ایسی خرابی کا موجب ہوا جس کی نظیر انسان کے اخلاقی تصور کی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ اخلاق جس سے مفہوم یہ ہے کہ انسانوں کے باہمی معاملات حق و صداقت پر مبنی

ہونے چاہئیں اپنا حقیقی مفہوم کھود دیتا ہے اگر اس کا نتیجہ نوع انسانی کی بہبود نہیں۔ اس سے تو اخلاقیات کا مقصود ہی فنا ہو جاتا ہے۔ اخلاقیات کا مقصود ایک فرد کی ذاتی بہبود یا نجات نہیں (اگرچہ نوع انسانی کی بہبود میں یہ ذاتی بہبود بدرجہ اتم موجود ہے) بلکہ یہ مقصود ہے کہ اس فرد کا اس نوع انسانی کے ساتھ جس کا یہ ایک جزو ہے کس قسم کا واسطہ ہے؟ اس (باہمی معاملات کے) ضابطہ اخلاق کی بنیاد عدل ہے۔۔۔۔۔ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر مستبدانہ اور قابضانہ قوت سے غالب نہ آ سکے۔۔۔۔۔ اگر دنیا میں باطل (WRONG) کے کوئی معنی ہیں تو وہ یہی ہیں کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کو محض فرضی اقتدار کی بنیاد پر اپنا تابع فرمان بنالے۔۔۔۔۔ اس باطل کا استیصال، اخلاقیات کا اصل فریضہ ہے۔ آپ مثالی اخلاقیات کی کیسی ہی شاندار عمارت کیوں نہ تعمیر کر لیں، اگر وہ باطل کا استیصال کر کے اس کی جگہ حق کو قائم نہیں کرتی تو وہ یکسر بے معنی ہے۔ یہ ادھر کی عمارت اخلاقیات کی عمارت کہلا ہی نہیں سکتی۔۔۔۔۔ روائی فلسفہ کی رو سے نصب العین حیات، شر کا مقابلہ نہیں بلکہ اس کے سامنے جھک جانا

رہ جاتا ہے۔ (صفحہ ۳۳۱ — ۳۳۲)

مغرب کی مادہ پرستی | یہ تور ہارہبانیت (تصوف) کا مسلک زندگی۔ اس کے برعکس مغرب کی مادہ پرستی نے یہ کہہ کر فرار کی راہ اختیار کر لی کہ زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس لئے کشمکش صرف خارجی قوتوں سے ہے جس نے تسخیر فطرت سے اپنی قوتوں میں اضافہ کر لیا، وہی آگے بڑھ گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا محض مادی ترقی کا نام ”انسانی ترقی“ ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب (BRIFFAULT) سے سنئے جس نے اقوامِ دہاذیبِ عالم کے عروج و زوال کی تاریخ سے نتائج مرتب کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

اگر انسان بادلوں سے اونچا اڑنے لگ جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی بلند ہو گئی ہے۔ نہ ہی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کے معنی ترقی ہیں۔ انسان اگر ستاروں کو توڑنے کے قابل بھی ہو جائے اور علوم و فنون کے وسیع میدانوں میں گھوڑے دوڑانے لگ جائے تب بھی اس کے جوہر ذاتی میں قلبِ مہمیت پیدا نہیں ہو

سکتی۔ انسانی معاملات اس سے کہیں گہرے ہوتے ہیں..... قوت تہذیب کلچر بمعنی چیزیں ہیں اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدر و قیمت باقی جاسکتی ہے۔ اخلاقی پیمانہ ہے۔ (صفحہ ۲۵۹)

اس قسم کے نظام تمدن کے مال کے متعلق یہی مؤرخ رقم طراز ہے۔ وہ نظام تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ نا انسانی سے کوئی فرد کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جوہر ہے اور وہ جماعت جو اس نا انسانی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے اس نا انسانی کی وجہ سے انجام کار برباد ہو جاتی ہے۔ انتخاب طبعی اٹل قانون کی بنیاد پر گناہ کی اجرت موت ہے۔ (صفحہ ۲۶۲)

کسی تہذیب کی تباہی سے یہ مراد نہیں کہ وہ قوم جو اس تہذیب کی حامل ہوتی ہے، امن و سلامتی میں رہتی ہے اور تہذیب فنا ہو جاتی ہے۔ کسی قوم کی تہذیب کی بربادی خود اس قوم کی موت ہوتی ہے۔ اور اس موت سے پہلے سکرات کی پچکیاں اس قدر جاں گسل ہوتی ہے کہ قلب حساس اس کے نظارے سے چیخ اٹھتا ہے۔ تہذیب مغرب کی اس جاں کنی کے عذاب کے متعلق ڈاکٹر جوڈو لکھتا ہے۔

انیسویں صدی، سائنس کی ظفر مندی کا زمانہ تھا۔ سائنس نے ہمیں سستا کونولہ اور کپاس دی اور ذرائع رسل و رسائل میں انقلاب پیدا کر دیا اور دیگر سینکڑوں طریق سے انسانی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کر دیں اور اس کی آسائش کے سامان مہیا کر دیئے۔ لیکن یہ سائنس ایک دودھاری تلوار تھی جس نے انسان کو وہ قوتیں عطا کر دیں جن کا طریق استعمال وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قتل و غارت گری کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا اور اس طرح اس کی تہذیب تباہی کے جہنم کے کنارے تک پہنچی۔ انیسویں صدی نے صرف سائنس کی ترقی دیکھی اور یہ ہمارے لئے چھوڑ دیا کہ ہم دیکھیں کہ سائنس کی اس ترقی کے ساتھ ساتھ انسانیت میں کس طرح تنزل واقع ہوتا گیا۔

(GOD AND EVIL; P-114)

یہ تھا مغرب کا وہ نظام تمدن جس کی اساس اس غلط فکر پر تھی کہ زندگی بس یہی طبعی زندگی ہے جس

میں کشمکش صرف خارجی قوتوں سے ہوتی ہے۔

ان دونوں (یعنی حکمت یونان اور تہذیب مغرب) کے برعکس قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسانی زندگی کی کشمکش کا علاج حقائق سے چشم پوشی نہیں بلکہ ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے میں ہے۔ طبعی زندگی کی کشمکش کے لئے تسخیرِ فطرت ضروری ہے اور اندرونی کشمکش کے لئے انسانی خودی کا نشوونما اور استحکام لازمی۔ نہ اُس سے فرار ہو سکتا ہے نہ اس سے گریز۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ اس باب میں داخلی اور خارجی کشمکش میں کوئی فرق نہیں۔ وہ ایک ایسا محیطِ کل نظامِ عطا کرتا ہے جس میں ایک ہی پروگرام کے ماتحت داخلی اور خارجی دونوں قوتیں انسان کو اس کے صحیح نصب العین کی طرف لے جاتی ہیں جس قسم کے قلبی جہنم میں آج یورپ گرفتار ہے۔ بعینہ ہی حالتِ رومن تہذیب کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ اس جہنم سے کس چیز نے بچایا؟ یہ ہم سے نہیں بلکہ (BRIFFAULT) سے سنئے وہ لکھتا ہے۔

زندگی ایک الجھاؤ بن چکی تھی۔ برقی رفتار لیکن بے سکون۔ فوری تبدیلیوں سے بھری ہوئی۔ انتہائی درجہ کی غمناک اندوہ گین کشاکش میں مبتلا۔ بے پناہ خواہشات اور پھر ایوسیاں اور ناکامیاں۔ انسانیت اس مصیبت میں پھنسی ہوئی تھی کہ ایسے میں مشرق کی تصوراتی دنیا سے مذہب نے آکر ایک نئی روشنی اور نئے اختانات دیئے درمیانہ انسانیت اسی کے لئے تڑپ رہی تھی۔ مشرق ایک نجات دہندہ کی صورت میں مسیحا بن کر آگیا۔ (صفحہ ۱۵۵)

آج بھی دنیا کو اگر اس جہنم سے کوئی چیز امن و سلامتی کی راہ دکھا سکتی ہے تو وہ صرف وحی کی روشنی ہے۔ وحی کی رُو سے قائم شدہ نظام میں سب سے پہلے ہوتا یہ ہے کہ انسانوں کے ہاتھ سے قوت و اقتدار چھین کر اس خدا کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو رَبُّ الْعَالَمِینَ ہے (رَبِّ کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ ہر شے کو اس کی ابتداء سے آخری نقطۂ ارتقاء تک بخیر و خوبی لے جاتا ہے) اس طرح وہ 'علامتِ مرض' کا علاج کرنے کے بجائے 'علتِ مرض' کو جڑ سے کاٹ دیتا ہے۔ انسانی قوت و اقتدار کی خواہیوں پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

جو کچھ مطلق قوت کے متعلق درست ہے وہی کچھ ہر قوت اور اقتدار کے متعلق درست ہے خواہ وہ کسی شکل اور کسی درجے میں ہو خواہ یہ اقتدار مراعات کا ہو یا قوتِ بازو کا۔ دولت

کی وجہ سے ہو یا ذہنی تفوق کی بنا پر۔ حاکم کا ہو یا حکومت کے کارندوں کا۔ ملاً کا ہو یا فتنہ انگیز خطیب کا۔ انسانی اقتدار کا لازمی نتیجہ ظلم ہوتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ انسان بد واقع ہوئے ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ قوت کا خاصہ ہے کہ وہ حق و انصاف کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت میں خرابیاں پیدا کر دیتی ہے۔ (صفحہ ۲۷۸)

انسانی حاکمیت کا استیصال | قرآن سب سے پہلے ہی کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نظام میں بھی قوانین و ضوابط کی پابندیاں ضروری ہوتی ہیں (اور پابندیوں کے بغیر حقیقی آزادی میسر کیسے آسکتی ہے؟) لیکن انسانوں کے خود ساختہ نظام اور وحی کے متعین کردہ قوانین میں بہت بڑا فرق ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وحی کے قوانین حیات کے تقاضوں کی آواز ہوتے ہیں۔ اس لئے انسان ان کی اطاعت و متابعت میں کسی خارجی قوت کی محکومیت محسوس نہیں کرتا۔ پرنسپل کیئرڈ (CAIRD) کے الفاظ میں:-

صدائیت مطلق..... کی زندگی کوئی اجنبی زندگی نہیں ہوتی۔ اگر وہ ہم سے کہیں باہر ہوتی ہے تو خود ہمارے اندر بھی وہی ہوتی ہے۔ اس کے سامنے جھک جانے سے ہم کسی خارجی مستبد قانون یا کسی بیرونی قوت کی محکومیت اختیار نہیں کرتے بلکہ ایک ایسے قانون کی متابعت کرتے ہیں جو خود ہماری ذات کا قانون ہوتا ہے۔ ایک ایسے حکمران کی اطاعت جس کا منتخب حکومت خود ہمارا عمیق قلب ہوتا ہے۔ (صفحہ ۲۳۷)

اسی حقیقت کو علامہ اس بصیرت افروز انداز میں بیان کرتے ہیں:-

اسلام بہ حیثیت ایک نظام سیاست کے اصول توحید کو انسان کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی طریق ہے۔ اس کا مطالبہ وفا و اداری خدا کے لئے ہے نہ کہ تخت و تاج کے لئے۔ اور چونکہ ذات باری تمام زندگی کی روحانی اساس ہے اس لئے اس کی اطاعت کیشی کا درحقیقت مطلب یہ ہے کہ انسان خود اپنی معیاری فطرت کی اطاعت اختیار کرتا ہے۔ (خطبات تشکیل جدید، صفحہ ۱۴۰)

قرآن کریم نے جب اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ تمام نوع انسانی کی تخلیق ایک "نفس واحدہ"

سے ہوئی ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ حیات ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے اور مختلف انسانی پیکر اس کی نمود کے ذرائع ہیں تو اس سے مقصود محض ایک سائنٹفک سلمہ سے تعارف نہیں بلکہ ایک عظیم الشان حقیقت کی طرف راہ نمائی ہے یعنی اس حقیقت کی طرف کہ انسانی میسیت اجتماعیہ کی تشکیل وحدت خالق اور وحدت خلق کے محکم اصول پر ہونی چاہیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب ایک فرد اس حقیقت پر ایمان لے آئے کہ اس کی اپنی ذات کی نشوونما انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی بلکہ وہ کل (انسانیت) کا ایک جزو ہے اور جب تک کل (انسانیت) کا ارتقاء نہیں ہوتا اس وقت تک جزو کا ارتقاء نہیں ہو سکتا تو وہ اپنی محنت کے حاصل کو کل کی نشوونما کے لئے وقف کر دے گا۔ اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں نوع انسانی کی ربوبیت عامہ ہے۔ جو خدا کے صفت رب العالمین کا پرتو ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ وحی کی رو سے قائم کردہ نظام میں تمام نوع انسانی کی بالیدگی اور فلاح کا راز مضمر ہوگا۔ نہ یہ کہ کسی قوم یا جماعت کے خون سے دوسری قوم یا جماعت کی پرورش کی جائے گی یہی نظام صحیح نظام انسانیت کہلا سکتا ہے۔ بقول (BRIFFAULT) انسانی ارتقاء سے مفہوم ہی نوع انسانی کی تشکیل ہے نہ کہ افراد کی نجات و فلاح۔

فطرت کی میزان میں کسی ایسے بڑے مقدس اور نیک عمل کا وزن جو انسانیت کے ارتقاء میں مدد نہ ہو کبھی اتنا نہیں ہو سکتا جتنا اس ایک عمل کا جو نوع انسانی کے ارتقاء کا موجب

ہو۔ (صفحہ ۳۵۲)

اسی بنا پر قرآن کریم، نسل، رنگ، قوم، وطن، زبان کی بنا پر نوع انسانی کی تفریق و تقسیم کو غلط قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک نوع انسانی کی تقسیم صرف ایک معیار پر ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ وہ تمام انسان جو اس نظام ربوبیت کو نصب العین حیات قرار دیں جو وحی کی رو سے قائم ہوتا ہے۔ ایک جماعت کے افراد اور ان کے علاوہ وہ تمام انسان جو انفرادی (یعنی طاغوتی) نظام ہائے زندگی کو اپنا شعار بنالیں۔ دوسری جماعت کے افراد۔ اول الذکر جماعت کا نام مومنین (یعنی اس نظام کو ماننے والے) اور دوسری کا کافرین (یعنی اس نظام سے انکار کرنے والے) ہے۔ لیکن اس تقسیم سے بھی یہ مفہوم نہیں کہ جماعت مومنین دوسری جماعت پر ظلم کرے گی اور ان سے ناانصافی برتنے گی۔ قطعاً نہیں۔ جو نظام وحدت خلق کے عالمگیر اصول پر قائم ہو اس میں ظلم اور ناانصافی کا بھلا کیا دخل؟ وہ ان کے ساتھ بھی عدل کرے گی اور عدل کے معنی یہ ہیں

کہ کوئی فرد، بنیادی حقوق انسانیت سے محروم نہ رہنے پائے۔

وحی کے نظام کی ابتداء ایمان سے ہوتی ہے۔ یعنی اس حقیقت کے اعتراف سے کہ انسانی ہیئت اور اجتماعیہ کی تشکیل اس کے باہمی معاملات کے سلجھاؤ اور انسانیت کے ارتقاء کے لئے تنہا عقل کی راہ نامی کافی نہیں۔ بلکہ خدا کی ہدایت یعنی وحی کی روشنی کی بھی ضرورت ہے۔ وحی کی کثرت و ابہت کا ادراک عقل (یعنی علم استدلالی) کے بس کی بات نہیں۔ علم استدلالی کا دائرہ محسوسات کی حدود کے اندر ہے۔ اور وحی ان حدود سے باہر کی چیز ہے۔ محدود کے لئے لامحدود کا احاطہ ناممکن ہے۔ بقول پرنسپل

کسی اعلیٰ فطرت کا اپنے سے ادنیٰ فطرت یا لامحدود کا محدود پر اپنے آپ کو منکشف کر دینا تو ہماری سمجھ میں آ سکتا ہے۔ لیکن کسی محدود کا لامحدود کو ثابت کرنا یا اس کے اثبات کے دلائل لانا، ہمارے تصور میں نہیں آ سکتا۔ (صفحہ ۴)

وحی اور عقل لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وحی کی تعلیم عقل کے خلاف ہوتی ہے۔ وحی خلاف عقل ہو نہیں سکتی لیکن اور اے عقل ہو سکتی ہے۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ کسی خاص زمانہ کی عقل وحی کے کسی انکشاف کا احاطہ نہ کر سکے۔ ایسی صورت میں صحیح راہ عمل یہی ہے کہ وحی کی پیش کردہ حقیقت پر ایمان رکھا جائے اور اس بات کا انتظار کیا جائے کہ جب زمانہ کی علمی اور عقلی سطح اور بلند ہوگی اور اس وقت یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی۔ پرنسپل کیسے دیکھتا ہے۔

جو خلاف عقل ہو وہ وحی نہیں ہو سکتی۔ لیکن وحی ہم تک ایسی چیزیں بھی تو پہنچاتی ہے جو عقل کی حدود سے بلند ہوتی ہیں وحی میں وہ اسرار الہیہ بھی شامل ہوتے ہیں جو انسانی فہم کی حدود سے ماوراء ہوتے ہیں..... محدود عقل ان اسرار کو دریافت نہیں کر سکتی۔ اور جب یہ دریافت بھی ہو جائیں تو ان کا احاطہ نہیں کر سکتی..... لہذا یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے کہ کسی مذہب میں ایسے تصورات بھی ہوں جو یقینی طور پر سچے ہوں۔ لیکن دنیا کے عملی تجربہ میں ان کا علم بعد میں جا کر آئے اور اس وقت بھی نوع انسانی کے کسی خاص حصہ کے علم میں۔

(صفحہ ۶۶ - ۶۷)

انسان کی سب سے بڑی بھول یہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی عقل اور اپنے زمانہ کی عقل کو ہمیشہ مکمل سمجھتا ہے حالانکہ یہ حقیقت کہ وہ اپنے سے پہلے زمانہ کی عقل پر ہنستا ہے خود اس امر کی دلیل ہے کہ بعد میں آنے

والا اس کے زمانہ کی عقل پر اسی طرح ہنسے گا۔ اس لئے اس کے زمانہ کی عقل مکمل کیسے ہو سکتی ہے؟ ہم آج اپنے زمانہ کی سائنس کے انکشافات پر اس درجہ نازاں ہیں اور اس امر کے مدعی کہ صداقت وہی ہے جو اس سائنس کی رُو سے صحیح ثابت ہو جائے۔ لیکن ہماری اس سائنس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے متعلق (BRIFFAULT) کا فتوے سنئے۔ وہ لکھتا ہے کہ

ہمارے اپنے طبعیاتی اور حیاتیاتی نظریے آنے والی نسلوں کو اسی طرح عجوبہ دکھائی دیں گی جس طرح آج ہمیں وہ نظریے دکھائی دیتے ہیں جن میں سائنس اپنے عہد طفولیت میں لپٹی ہوئی تھی۔ (صفحہ ۱۹۷)

جب انسان کے علم و عقل کی تدریجی ترقی کی یہ حالت ہے تو کسی حقیقت سے محض اس لئے انکار کر دینا کہ وہ آج کے زمانہ کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ عقلی حدود کے متعلق مبالغہ سے کام لینا ہے۔ وحی کی تعلیم کی صداقت اس کے عملی نتائج سے پہچانی جاتی ہے یعنی اس حقیقت سے کہ زمانہ فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کس طرح غیر وحی تصوراتِ حیات کو چھوڑتا جاتا اور ان کی جگہ قرآنی تصوراتِ زندگی کو ایک ایک کر کے قبول کرتا جاتا ہے۔



رسول کا منصب | جن نفوسِ قدسیہ پر حقیقت اپنے آپ کو بے نقاب کرتی ہے انہیں دین کی اصطلاح میں رسول یا نبی کہا جاتا ہے۔ دین کا کام یہ نہیں کہ چند بنیادی صداقتیں (FUNDAMENTAL TRUTHS) نظری طور پر پیش کر دے اور بس بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ عملی طور پر بتائے کہ انسانی معاملات کو ان صداقتوں کے قالب میں کس طرح ڈھالا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کے عملی مسائل (جنہیں تمدن کہا جاتا ہے) شروع سے ایک جسم نامی کی طرح ارتقائے زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور پھیلتے جاتے تھے اسی لئے وہ اسالیب و انداز جن میں یہ بنیادی صداقتیں پیش کی جاتی تھیں اس ماحول کے مقتضیات کے مطابق اختیار کئے جاتے تھے جس میں وہ تعلیم سامنے آتی تھی۔ انسانی تقاضوں کے ارتقار کے ساتھ ساتھ ان اسالیب و انداز میں بھی ارتقائی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ حتیٰ کہ یہ جسم نامی اپنے عہد شعور تک پہنچ گیا۔ جہاں اس تعلیم کو اس طرح مکمل کر دیا گیا کہ وہ انسان کے تمام تقاضوں کا اصولی حل اپنے اندر رکھتی ہے۔ یہ تعلیم قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔

اس سلسلہٴ رشد و ہدایت کا انتظام یہ کیا گیا تھا کہ ایک رسول آتا اور وہ خدا کے پیغام کو اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق تشکیل کر کے دے دیتا۔ جب تک اس تعلیم کو علیٰ حالہ رکھنا مقصود ہوتا وہ باقی رہتی۔ اس کے بعد یا تو ضائع ہو جاتی یا تحریف و الحاق سے مسخ ہو جاتی۔ اس وقت ایک اور رسول آجاتا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جب کسی سابقہ تعلیم کے ضائع، فراموش یا مسخ ہو جانے کے بعد نئی تعلیم آتی، تو چونکہ یہ تعلیم بھی اسی سرچشمہٴ ہدایت کی طرف سے تھی جو سابقہ تعلیم کا منبع تھا، اس لئے اپنے آپ کو سابقہ تعلیم کی طرف منسوب کرنے والے اس نئے پیغام پر لبتیک کہتے۔ لیکن انسانی ضد اور ہٹ دھرمی ایسا نہ ہونے دیتی۔ سابقہ تعلیم کے وابستگان دامن الگ گردہ بن کر بیٹھ جاتے اور اس نئے پیغام کی تکذیب اور مخالفت میں سب سے بڑی سعادت محسوس کرتے۔ اس طرح مختلف مذاہب و ملل کا وجود

مذہبی فتنے بندیاں

عمل میں آگیا جو آج تک قائم ہے۔ چونکہ مذہب کا تعلق یکسر خدات سے سمجھا جاتا ہے اس لئے کوئی فرقہ یا گردہ غور و فکر سے کام لینے کی کوشش نہیں کرتا۔ ورنہ اگر ذرا بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو یہ معاملہ کچھ ایسا مشکل نہیں کہ سمجھ میں نہ آ سکے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا میں (آخری دین یعنی اسلام کے سوا) کسی کے ہاں ان کی آسمانی کتاب اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں وجود نہیں تاریخی شہادات کے علاوہ خود ان کتابوں کی (موجودہ) تعلیم اور ایک دوسرے کا باہمی اختلاف اس حقیقت پر گواہ ہے۔ تھوڑا عرصہ گزرا، ایک کتاب شائع ہوئی ہے (BIBLE OF THE WORLD) اس کتاب میں مختلف مذاہب عالم کی مقدس کتابوں کے ان اقتباسات کو یکجا کیا گیا ہے جو مرتب کے نزدیک ان مذاہب کی بنیادی تعلیم کا حاصل ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر یہ دعویٰ صحیح ہو کہ تمام مذاہب کی

اے حضرات انبیاء کرام خدا کی طرف سے دیئے گئے تھے۔ لیکن جب ان کے نام لیوا بعد میں اس دین کو مسخ کر دیتے تو اس کا نام مذہب ہو جاتا، دین اور مذہب کے اس فرق کو سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے۔ میں نے اس فرق کی تفصیل اور تشریح اپنی آئندہ تحریروں میں بڑی شرح و بسط سے کی ہے۔ حتمی کہ میری انگریزی کتاب کا عنوان ہی (ISLAM : A CHALLENGE OT RELIGION)

ہے۔ اسلام 'مذہب' نہیں 'دین' ہے۔ اور دین 'ہمیشہ مذہب کے خلاف چیلنج کرتا ہے۔

مقدس کتابیں اپنی اصلی شکل میں دنیا میں موجود ہیں تو بائبل اور دی ورلڈ میں پیش کردہ تعلیم میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہونا چاہیے اس لئے کہ ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف اور متضاد تعلیمات کا تصور باطل ہے۔ لیکن پروفیسر جوڈ کے الفاظ میں بائبل اور دی ورلڈ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان تعلیمات میں کس قدر باہمی اختلاف ہے۔ اور مباحث کو تو چھوڑیے۔ صرف اس ایک مسئلہ میں کہ دنیا کا آغاز کس طرح ہوا۔ ایک تعلیم دوسرے سے نہیں ملتی؟

مذہب عالم کے ان اختلافات سے گھر اکڑ لوگوں نے عام طور پر دورا میں اختیار کر لیں۔ متشدد طبقہ نے تو یہ کہنا شروع کر دیا کہ ان کے بانی مذہب کے علاوہ دیگر بانیان مذہب اپنے دعوے میں (معاذ اللہ) جھوٹے تھے اس لئے آسمانی صداقت صرف انہی کے پاس ہے۔ دوسرے طبقہ **دو غلط راہیں** نے (جو ہر دلعزیز رہنا چاہتا تھا) اس عقیدہ کو پھیلانے کی کوشش کی کہ عالمگیر صداقتیں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں اس لئے کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر فوقیت و افضلیت حاصل نہیں۔ قرآن کریم کی رو سے یہ دونوں مسلک باطل ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمام رسول خدا کی طرف سے سچی تعلیم لائے تھے اس لئے ان میں سے ہر ایک کے دعوئے رسالت کی صداقت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ لیکن ان کی تعلیم اپنی اصلی شکل میں کہیں باقی نہیں رہی اپنی اصلی شکل میں صرف آخری تعلیم موجود (قرآن کریم کے اندر) ہے جسے اب ہمیشہ کے لئے انسانی زندگی کا نصب العین بنایا گیا ہے۔ لہذا یہ غلط ہے کہ آج تمام مذاہب میں عالمگیر صداقتیں یکساں طور پر موجود ہیں جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ دین کا کام محض چند صداقتوں کا نظری طور پر پیش کرنا نہیں بلکہ ایک نظام زندگی متعین کرنا ہے جو انسانی معاملات کے تمام انفرادی اور اجتماعی گوشوں کو محیط ہو۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام ایک

لہ مذہب کے لئے باقی کا لفظ دیگر مذاہب کی مروجہ اصطلاح کی رو سے استعمال کیا گیا ہے ورنہ قرآن کریم کی رو سے رسول آسمانی دین کا بانی نہیں ہوتا۔ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ رسول اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ لہ ہمارے زمانے میں اس مسلک کے عام کرنے والے (مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم) تھے۔ میں نے ان کے اس مسلک کی شدت سے مخالفت کی تھی۔

ہی ہو سکتا ہے۔

پھر اس حقیقت کو بھی سامنے رکھئے کہ مذہب کا یہ نظام (یعنی عالمگیر صد اقتوں پر مشتمل عملی اسلوب جسم نامی کی طرح بڑھتا رہا ہے۔ اس لئے اگر بفرض محال یہ بھی مان لیا جائے کہ آج سے چھ سات ہزار سال پیشتر کے انسانوں کے لئے دین کا جو نظام متعین کیا گیا تھا وہ آج بھی اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود ہے تو کیا وہ نظام اس نظام کے برابر ہو گا جو انسانیت کے عہد بلوغ میں تمام نوع انسانی کا نصاب زندگی بننے کے لئے دیا گیا ہے؟ کیا یہ حقیقت ان دونوں

کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟

میں بنیادی صداقتیں ایک ہی ہیں ان دونوں کو ایک ہی سطح پر کھڑا کر دے گی؟ درخت کی وہ پہلی سوئی جو بیج سے پھوٹی ہے اور پھولوں اور پھولوں سے لدا ہوا درخت دونوں میں ایک ہی بنیادی صداقت کا فرما ہوتی ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس اشتراک کے باوجود دونوں کا مقام ایک نہیں ہوتا۔ ایک نوجوان صاحب عقل و شعور میں وہی بنیادی صداقتیں جلوہ پیرا ہوتی ہیں جو اُس میں اُس وقت موجود تھیں جب وہ گھٹنیوں چلتا تھا۔ لیکن اس مشارکت سے جو ان اور بچہ ایک جیسے کہیں نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جو چیز ایک جسم نامی کی طرح ارتقائی طور پر آگے بڑھ رہی ہو اس کی پچھلی منزل کی خصوصیات اگلی منزل میں منتقل تو ہو جاتی ہیں۔ لیکن علیٰ حالہ قائم نہیں رہتیں۔ بلکہ اگلی منزل انہیں اپنے اندر جذب کر کے ایک اور ہی رنگ دے دیتی ہے جب شاخ پھول بنتی ہے تو پھول میں شاخ موجود ہے لیکن اپنی اصلی حالت میں نہیں پھول اسے اپنے اندر جذب کر کے اسے ایک اور ہی قبائے رنگین عطا کر دیتا ہے۔ پودا جن مختلف منازل میں سے گزرتا ہے وہ سب کی سب درخت کے اندر جذب ہوتی ہیں۔ لیکن اب ان کی شکل کچھ اور ہوتی ہے۔ ایک نوجوان میں بچپن سے لے کر جوانی تک کے تمام مقامات (STAGES) یکجا موجود ہوتے ہیں لیکن ایک نرلے انداز میں۔ اسی طرح مذہب کی عالمگیر صداقتیں جب انداز و اسالیب کی مختلف ارتقائی منازل طے کر کے آگے بڑھتی ہیں تو ہر سابقہ منزل کی خصوصیت نئی منزل میں جذب ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے حتیٰ کہ آخری منزل میں تمام سابقہ منازل کی خصوصیات جذب ہو کر انتہائی رعنائیاں اختیار کر لیتی ہیں۔ لہذا یہ تصور ہی غلط ہے کہ مختلف مذاہب عالم کی "مشترکہ خصوصیات" کو یک جا کر لیا جائے تو اس مجموعہ کا نام "عالمگیر صداقتیں" ہو گا جو "ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں" یہ مشترکہ خصوصیات

اخلاق کے چند مبادیات کے سوا اور کیا ہوں گی؟ دین ایک مکمل نظام زندگی عطا کرتا ہے لہذا نوع انسانی کی راہ نمائی کے لئے آخری دین ہی واحد اور مکمل ضابطہ حیات ہو سکتا ہے نہ کہ مختلف مذاہب اپنی موجودہ شکل میں۔ مکمل ہر سابقہ ناتمام کو اپنے اندر لئے ہوتا ہے۔ ناتمام، مکمل کو اپنے اندر نہیں رکھ سکتا۔ قرآن کریم نے اپنے اندر ایسے اصول حیات دے دیئے ہیں جو انسان کی مکمل زندگی کے لئے پوری پوری راہ نمائی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اس لئے قرآن کے بعد کسی مزید راہ نمائی کی ضرورت نہیں رہتی۔ (اس اجمال کی تفصیل کے لئے میری کتاب ”اسلام کیا ہے“ کا مطالعہ مفید رہے گا)۔



حکومت الہیہ کا مفہوم | یہ نظام جو وحی کی رُو سے قائم ہوتا ہے، اس کی تفصیلات و جزئیات طول طویل ہیں، لیکن اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ دنیا میں تمام

انسانوں کی مضر صلاحیتوں کی نشوونما پورے پورے طور پر ہوتی چلی جائے اور اس طرح انسانیت من حیث الکل اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر اٹھتی جائے (تفصیل ان امور کی میری تصنیف ”قرآنی نظام ربوبیت“ میں ملے گی) اس نظام کو بعض اوقات (بغرض تعارف) ”حکومت الہیہ“ بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ اس حکومت کی عملی تفصیل کیا ہے اس کے متعلق تو شرح و بسط سے اپنے مقام پر لکھا جائے گا۔

سر دست اس کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ ”حکومت الہیہ“ سے ذہن فوراً (THEOCRACY) کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآنی نظریہ حکومت الہیہ تقیاً کیسی سے بالکل الگ ہے۔ تقیاً کیسی کی اصطلاح سب سے پہلے قدیم یہودی مؤرخ جوزیفس نے وضع کی تھی اور اس سے مقصود وہ انداز حکومت تھا جو بنی اسرائیل کی ابتدائی زندگی میں مروج تھا۔ بنی اسرائیل کے ہاں یہوہ (خدا) کے متعلق یہ عقیدہ بھی موجود تھا کہ وہ ان پر حکومت کرتا ہے۔ شروع میں اس عقیدہ سے مفہوم کچھ ہی ہو لیکن رفتہ رفتہ ”یہوہ کی حکومت“ کچھ اور ہی صورت اختیار کر گئی۔ چنانچہ ان کے ہاں (i) یہوہ کا مقدس میبل (ii) اس کی کتاب شریعت (جو دراصل فقہاء کے فتاویٰ پر مشتمل تھی) اور (iii) خود احبار و رہبان۔ ان تینوں کے مجموعہ کا نام ”حکومت خداوندی“ تھا۔ ان کے ہاں اجتہاد کا تو تصور ہی نہ تھا۔ تورات کی تختیاں (جیسی کچھ

لے اسی لئے قرآن کریم نے اپنے آپ کو تمام سابقہ ادیان کا ”ہیمن“ کہا ہے جس کے اندر تمام سابقہ ادیان محفوظ ہو گئے۔

بھی وہ تھیں ایک مقدس صندوق میں بند ایک مقدس مقام پر رکھی رہتی تھیں۔ اب "خدا کی کتاب شریعت" جس طرح مدون ہوتی تھی اس کی تفصیل بلجلی کے الفاظ میں دیکھئے۔ وہ اپنی کتاب
(THEORY OF THE STATE)

میں لکھتا ہے۔

قانون الہی ایک سونا منڈھے ہوئے صندوق میں رکھا رہتا تھا جس کی دو کڑوبی حفاظت کرتے تھے اور جس کی تعظیم الہام ربانی کے مرکز کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ تابوت بیجمہ کے اندر ایک پردہ کے پیچھے قدس الاقداس میں رہتا تھا اور کابھنوں کی طرف سے پورے اہتمام سے اس کی نگرانی ہوتی تھی۔ یہیں کابھن اعظم ہوہ کے احکام معلوم کرتا اور لوگوں کو مطلع کرتا۔ قضاۃ جو قبائل میں شریعت کی تنفیذ پر امور تھے۔ یہ کام خدا کے نام پر انجام دیتے تھے۔ کیونکہ حکم صرف اللہ کے لئے تھا۔ اگر ان کے سامنے کوئی معاملہ ایسا آ جاتا جس کا فیصلہ ان کے لئے مشکل ہو تا تو اس میں ان کے لئے ضروری ہوتا کہ لادویوں کے ذریعے سے خدا کی مرضی معلوم کریں۔

یہ تو تھی اجار اور مہبان کی حکومت۔ جب ان میں بادشاہت آگئی تو بادشاہ کے متعلق یہ عقیدہ قائم کیا گیا کہ وہ مامورین اللہ ہے اور خدا کی مرضی کا پورا کرنے والا۔ چنانچہ ہیکل کی برکات بادشاہ کے شامل حال اور قدس راہبوں کی دعائیں اس کی محافظ و نگراں ہوتیں۔ اس طرح حکومت اور براہمنیت کے امتزاج سے ایک ایسا "خدائی نظام حکومت" وجود میں آگیا جو مقدس استبداد کا مجسمہ تھا۔ وہی نظام جو ہندوستان میں براہمن اور کھتری راجاؤں کے ملی تغلب سے وجود میں آیا۔ اس نظام میں راجہ کو ایشور کا اوتار قرار دیا جاتا تھا جس کی رکھشا (حفاظت) براہمنوں کی اشیراد (دعاء) کرتی تھی۔ یہی وہ روح تھی جو مسلمانوں کے دور حکومت میں بادشاہ کو ظلی الہی قرار دینے کا موجب بنی۔

لیکن اس تختیل کو قرآن کریم کے حکومت خداوندی کے تصور سے کچھ واسطہ نہیں۔ قرآن ملکیت اور براہمنیت دونوں کو مٹانے کے لئے آیا ہے۔ حکومت الہیہ کے اصولی قوانین قرآن کریم کے اندر منضبط ہیں۔ ان اصولی قوانین کی روشنی میں ہر زمانہ میں ملت اسلامیہ باہمی مشورہ سے اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق عقل و علم کی روشنی میں اجزی قوانین خود مرتب کرتی ہے۔ وہ اصول تو غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی

روشنی میں مرتب کردہ جزئی قوانین زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ عند الضرورت بدلے جاسکتے ہیں۔ اس نظام میں وحی علم انسانی اور مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ تینوں دوش بدوش چلتے ہیں اور ایسا انتظام کرتے ہیں جس سے تمام افراد انسانہ کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی چلی جائے اور کسی انسان پر کسی دوسرے انسان کا کوئی حکم نہ چلے۔ نہ کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج ہو۔

حضرات انبیاء کرام اسی قسم کا نظام ربوبیت قائم کرنے کے لئے آئے تھے۔ اس مقصد کے لئے قرآن نے مختلف انبیاء کرام کا ذکر کیا ہے اور ان کے ذکر کے ساتھ ہی اس کشمکش کا بھی ذکر کیا ہے جس سے انہیں اس قسم کے نظام کی تشکیل میں دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اس لئے کہ مفاد پرست قوتیں کبھی نہیں چاہتی تھیں کہ رزق کے سرچشمے ان کے ہاتھ سے چھن کر نزع انسانی کی ربوبیت کے لئے عام ہو جائیں۔ ان انبیاء کرام اور ان کے ہاتھوں سے لائے ہوئے انقلابات کا تذکرہ اگلی جلدوں (یعنی جوئے نور برقی طور، شعلہ مستور اور معراج انسانیت میں ملے گا)۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

وَالسَّلَامُ

پرویز

